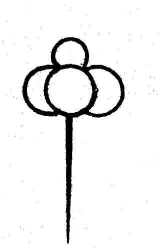
تلامذۂ حضرتِ صفیؔ اورنگ آبادی



قیامت تک آفاقِ شعر و سخن پر
چمکتے رہیں گے صفیؔ کے ستارے
— اخگرؔ —

مرتب
محبوب علیخاں اخگرؔ قادری

ب ۶۷

•

○ نام کتاب : تلامذۂ حضرت صفی اورنگ آبادی

○ مرتب : محبوب علیخاں اخگر قادری

○ معاونت : نظیر علی عدیل • رؤف رحیم • روحی قادری

• معین الدین عزمی

○ تصاویر : جابر بن تاب

•

○ کتابت : محمد عبد الرؤف

○ سرورق : سعادت علیخاں

سلام خوشنویس

○ طباعتِ سرورق اور تصاویر } سرور آفسیٹ پریس، لکڑی کاپُل (احاطہ مہدی گلشن پیالیس) حیدرآباد

○ طباعتِ لیتھو : دائرہ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد

•

تعداد : بارِ اوّل (۶۰۰)

اشاعت : رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ م اپریل ۱۹۹۱ء

قیمت : تیس (۳۰) روپے RS. 30/=

سلسلۂ اشاعت : "آدبستانِ دکن" بہ یادگار حضرت صفی اورنگ آبادی

●

ملنے کے پتے :

○ حسامی بُک ڈپو، مچھلی کمان۔ حیدرآباد

○ کمرشیل بُک ڈپو، چارمینار، حیدرآباد

○ ہلال پن اسٹور، گلزار حوض، حیدرآباد

○ نصیب منشن ۲/۱۷/۲۶۲-۳-۱۹ جہاں نما، حیدرآباد ۲۵۳-۵۰۰

صفیؔ مرحوم کی یاد میں!

میری یہ نظم ارضِ دکن کے اس عظیم شاعر کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت ہے جو زندگی بھر مرتا رہا اور مر کے ہمیشہ کے لیے زندہ ہوگیا۔ جامیؔ

نہیں ہے تُو آج ہم میں لیکن ابھی ہے زندہ کلام تیرا
غزل کے سینے میں دل کی صورت دھڑک رہا ہے پیام تیرا
سمو کے حُسنِ بیاں میں اپنے حیات کی دردمندیوں کو
ترے خیالات نے جھکایا، کمال و فن کی بلندیوں کو
یہ فکر کا دل نشیں سلیقہ، یہ کیف، یہ طور، یہ قرینے
محاورے، شوخیاں، لطافت، حسین الفاظ کے نگینے
دکن کی محفل میں تہر و مرزا کی عظمتوں کا نیا سویرا
بھلا سکے گی نہ بھول کر بھی ادب کی تاریخ نام تیرا
کیے ترے سوزِ جاوداں نے خیال و فکر و دماغ روشن
نہ جانے کتنے ہیں زخم تازہ، نہ جانے کتنے ہیں داغ روشن
یہ میں نے مانا کہ آج اتنی بدل گئیں وقت کی نگاہیں
نئے خیالات سامنے ہیں، نئے مذاقِ سخن کی راہیں!
مگر جو پہلے ہی دے گئے ہیں اداے حُسنِ بہار غازہ
بنا کے خونِ جگر کو اپنے نگارِ اردو کے رُخ کا غازہ
بڑھے گا یہ قافلہ ہمارا انھیں کے فیض و کرم سے آگے
نئے نشانات بھی ملیں گے ہر ایک نقشِ قدم سے آگے
عظیم ورثہ وہی ہمارا کسی کو انکار اس سے کب ہے
ہمارے ماضی کا ہر اُجالا نشانِ مستقبلِ ادب ہے

★ ـــــ خورشید احمد جامیؔ (سب رس صفیؔ نمبر)

صفی کی اہمیت

سماج کی بالادستی اور زبان و فن کی اجارہ داری سے ٹکر لینے والا یہ باغی شاعر زرد جواہر اور شیش محل کا سخن گو نہ بن سکا لیکن اس کا نغمہ عوام کے دل کی دھڑکن بن گیا، اُس کے سُر ڈھولک اور چکی کے گیتوں میں سما گئے اور اس کے اشعار شہر کی گلیوں میں گونجنے لگے۔ صفی کی غزلیں اس لیے زندہ رہیں گی کہ ان میں خلوص کی وہ حرارت ہے جو تجربات کی تجسیم سے پیدا ہوتی ہے وہ کلاسیکی رچاؤ ہے جس کی ہر دور میں قدر ہوگی۔ زندگی کی وہ کسک ہے اور وہ سوز و ساز ہے جو گمبھیر احساس سے جنم لیتا ہے۔ صفی کی اہمیت محض اس لیے نہیں ہے کہ انھوں نے آبدار اور دلفریب شعر کہے ہیں، ان کا کلام اس لیے قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے اپنے اِرد گرد جو کچھ دیکھا جو محسوس کیا، زندگی کے نشیب و فراز سے جس طرح وہ گزرے، حیات کے گرما گرم تجربات سے جس طرح ان کا دل پگھلا، اُس احساس کو انھوں نے غزل کے طلسم خانے میں بند کر دیا ہے۔

سیدہ جعفر

صدر شعبۂ اُردو۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد

۵ر اپریل ۱۹۹۱ء

حضرت صفی کے بارے میں

نام: محمد بہاء الدین بہبود علی صفی اورنگ آبادی

ولدیت: حکیم محمد منیر الدین صدیقی

تاریخ پیدائش: ۲۵ر رجب سنہ ۱۳۱۰ھ مقام پیدائش: اورنگ آباد۔ سکونت: رویرو خواجہ کا چھلّہ مغلپورہ

اساتذۂ صفی: ۱: ضیاء گورگانی ۲: ظہور دہلوی ۳: عبدالولی فروغ ۴: رضی الدین حسن کیفی

تاریخ وفات: ۱۵ر رجب المرجب سنہ ۱۳۷۳ھ م ۲۱ر مارچ سنہ ۱۹۵۴ء مقام انتقال: عثمانیہ دواخانہ

تدفین: احاطۂ درگاہ حضرت سردار بیگ صاحب۔ آغاپورہ۔ حیدرآباد

کتابیں: ۱: انتخاب کلامِ صفی مرتبہ: مبارز الدین رفعت سنہ ۱۹۶۲ء ۲: یادگارِ صفی "نسب درس" مرتبہ: ادبیاتِ اُردو سنہ ۱۹۵۶ء ۳: پراگندہ: مرتبہ؛ خواجہ شوق سنہ ۱۹۶۵ء ۴: فردوسِ صفی مرتبہ: ابو خلیل سید غوث یقین (پاکستان) سنہ ۱۹۶۸ء ۵: گلزارِ صفی؛ مرتبہ: رؤف رحیم سنہ ۱۹۸۷ء ۶: سوانح عمری صفی اورنگ آبادی؛ مصنف: محمد نور الدین خاں صاحب سنہ ۱۹۸۹ء

یادش بخیر

حضرت حاوی مرحوم کے حالات اِس تذکرے میں چھپ جانے کے بعد مندرجہ ذیل اشعار دستیاب ہوئے جنھیں پیش کیا جا رہا ہے: آخگر

یوں بھی نادم ہوں خطا مجھ سے کوئی ہو کہ نہ ہو
آپ کے آگے ڈھٹائی، نہیں تقصیر نہیں

تغزل اور ترنم ہے اور اے حاوی
یہ لحن لحن ہے رنگینیِ خیال نہیں!

شاگرد ہے صفی کا تو رنگِ صفی نہ چھوڑ
حاوی رہے غزل کے لیے کوئی سی طرح

عبرت کا مُرقع بَن گیا ہوں
دیکھئے کیا سے کیا ہو گیا ہوں

تُو لاکھ بار دولتِ دیدار کر عطا
بھرتی نہیں غریبوں کی نیّت کسی طرح

بَدلا لباس اُس نے تو جلوے بَدل گئے
سَج دھج نئی ہے، وضع نئی ہے، نئی طرح

دُنیا کا خون دیکھ، ہمارا نصیب دیکھ
واقف اگر نہیں ہے سفید و سیاہ سے

دیدہ گُستاخِ نظر بازی ہے میرا کیا قصور
دل خطا دارِ محبت ہے، مِری تقصیر کیا

ہے عدو سرکش تو سر کوبی کرو
بھاگتا ہے بھُوت آگے، مار کے

نہ بُرے تم نہ بُرے ہم نہ ملاقات بُری
کیوں خفا ہوتے ہو، ہوتی ہے بُری بات بُری

اِس لیے ہوتی ہے ہر دَم کی ملاقات بُری
باتوں باتوں میں نکل جاتی ہے اِک بات بُری

آپ کے قاعدے قانون کوئی کیا سمجھے
نہ بھلی بات بھلی ہے نہ بُری بات بُری

سب سے مِلنا ہے تو مِلنے کے طریقے سے مِلو
مَیں نے ٹھٹّے سے کہا تم کو لگی بات بُری

تیری فرقت میں تڑپنے کے مزے خوب مِلے
نہ کوئی دن ہی بُرا تھا نہ کوئی بات بُری

بھلا کب کوئی چشمِ مست ساقی کے برابر ہے
نہ پیمانے کا ظرف اِتنا نہ اِتنا ظرفِ ساغر ہے

نہ سر محتاجِ بالیں ہے نہ تَن مرہُونِ بستر ہے
تکلف بر طرف فرشِ زمیں آغوشِ مادر ہے

جو رُتبہ دوستی کا ہے قرابت سے بھی بڑھ کر ہے
برادر بھی اگر ہو دوست تو بے شک برادر ہے

نہ ہو جامے سے باہر دل مِرا سینے کے اندر ہے
"یکے نقصانِ مایہ" کیا کہوں ہے اِک ستم گر ہے

نَباتِ دہر کی نورستہ ہر کونپل بھی اے غافل
یہ کہتی ہے زبانِ حال سے اللّٰہ اُوپر ہے

جنابِ شیخ بھی اب پڑ گئے دُنیا کے پیچوں میں
بظاہر دیکھنے کو تو بڑا شملہ بڑا سَر ہے

زبانی ان کی ہمدردی ہے اپنے مِلنے والوں سے
کہ ایسا ہو تو اچھا اور ایسا ہو تو بہتر ہے

اگرچہ دل کی گنتی تو ہے اعضائے رئیسہ میں
مگر یہ خسروِ اقلیمِ تن بے تخت، افسر ہے

بہت خود رَو ہے پیداوار اپنی فِکر کی حاوی
زمینِ گلشنِ شعر و سخن مُدت سے بنجر ہے

فہ

فہرست

مضامین

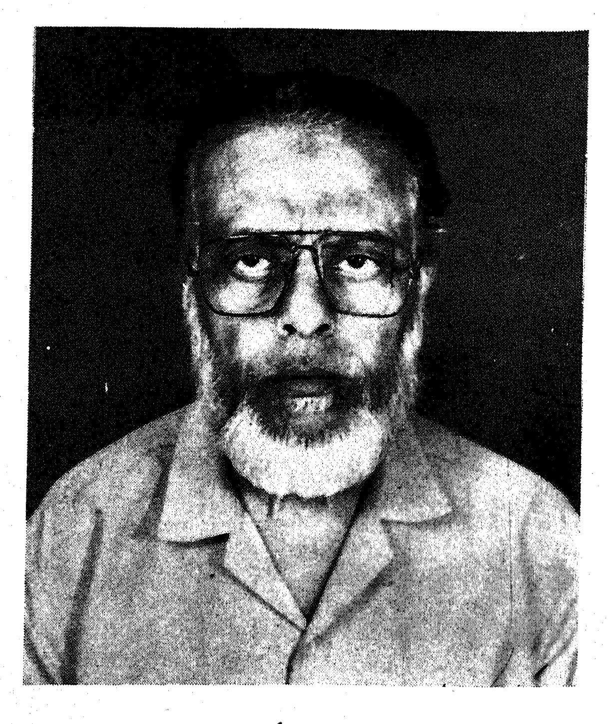
مختصر حالات و نمونۂ کلام تلامذۂ حضرت صفی (بہ اعتبار حروفِ تہجی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنتساب

مَیں اِس کتاب کو اپنی والدہ ماجدہ دولت بانو مرحومہ والد بزرگوار محمد بہادر خاں مرحوم، رفیقۂ حیات نصیب خاتون مرحومہ اور پیرِ طریقت، مَنبعِ رُشد وھدایت سید شاہ وحید القادری الموسوی رحمۃ اللہ علیہ، جگر گوشۂ قطب الاقطاب غوثِ اعظم دستگیر رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے منسُوب کرتا ھوں، جن کی نسبت اور دُعاؤں کے طُفیل، یہ احقر اس کتاب کو منظرِ عام پر لانے کے قابل ھوا۔

مَحبُوب علیخاںؔ اَخگرؔ قادری



مرتب

محبوب علیخاں اخگر قادری

تلمیذ

حضرت غلام علی حاوی مرحوم

جانشین صفی اورنگ آبادی



ارادت جہاندار جاہی

جہاندار افسر

امان ارشد

احمد علی پیکاں

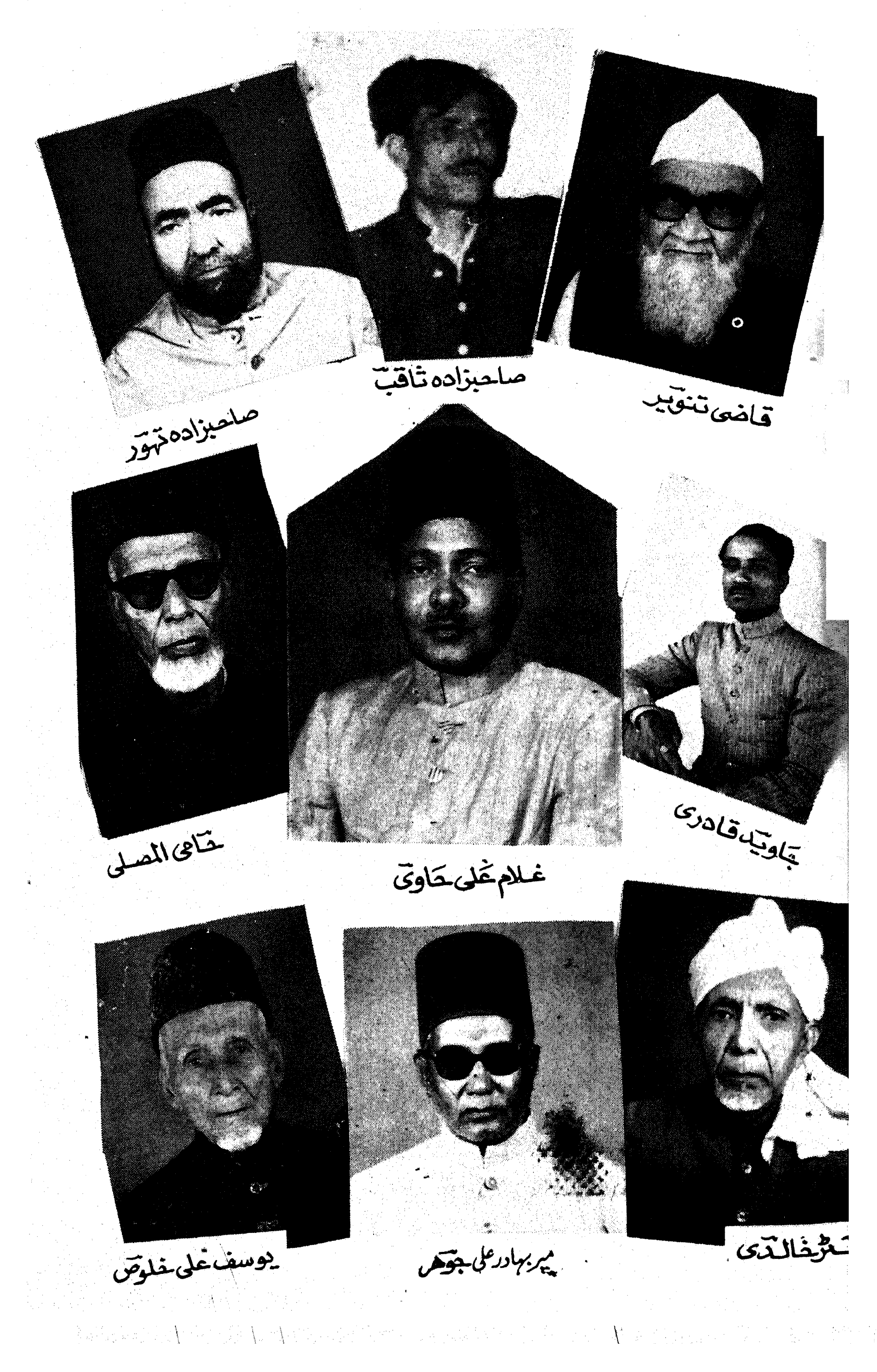
صاحبزادہ اشرف

اقبال آسماں جاہی

تبسم غوری

ابن احمد تاب

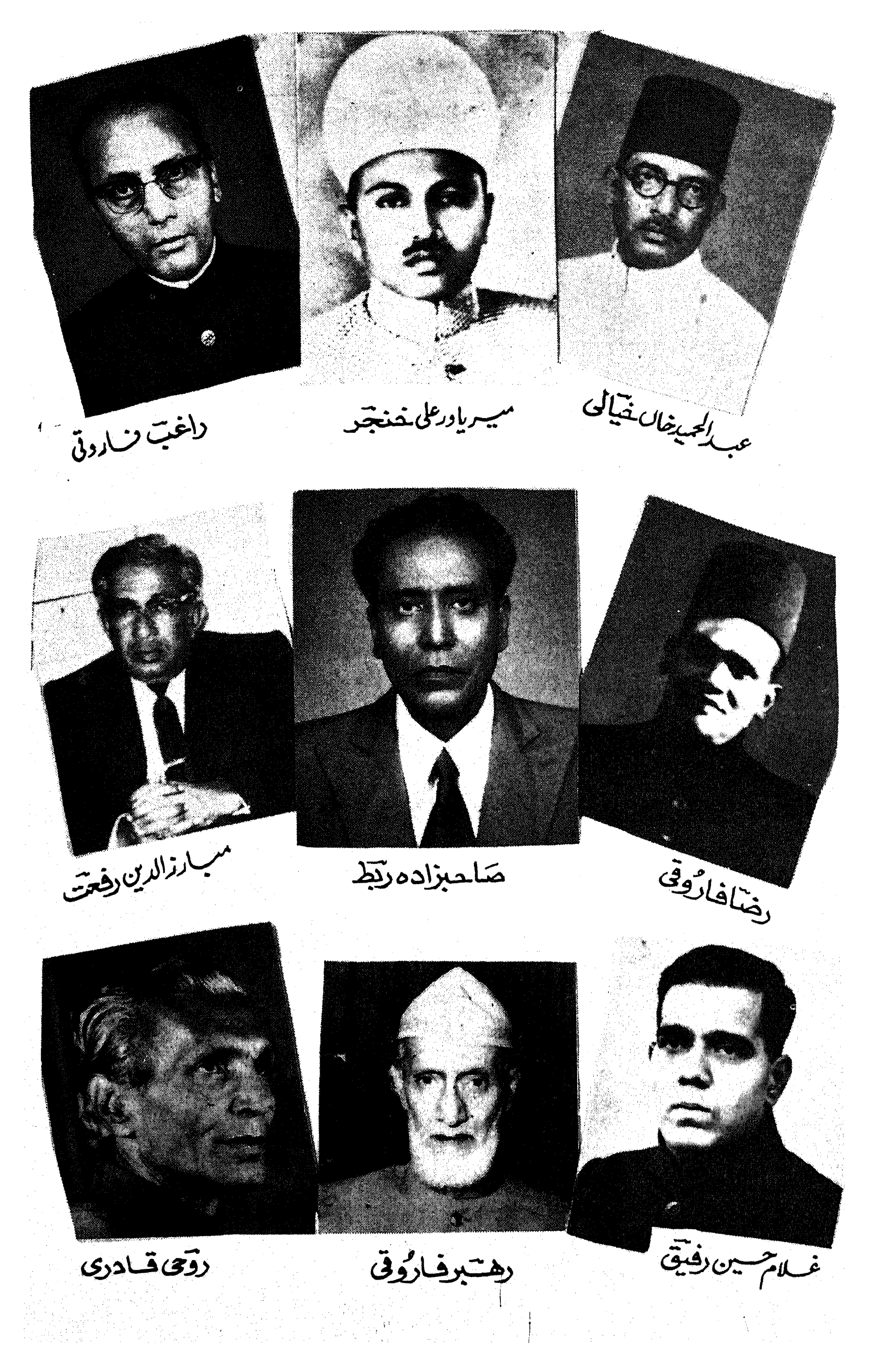
شمس الدین تاباں



قاضی تنویر — صاحبزادہ ثاقب — صاحبزادہ تہور

جاوید قادری — غلام علی حاوی — حامی المصلی

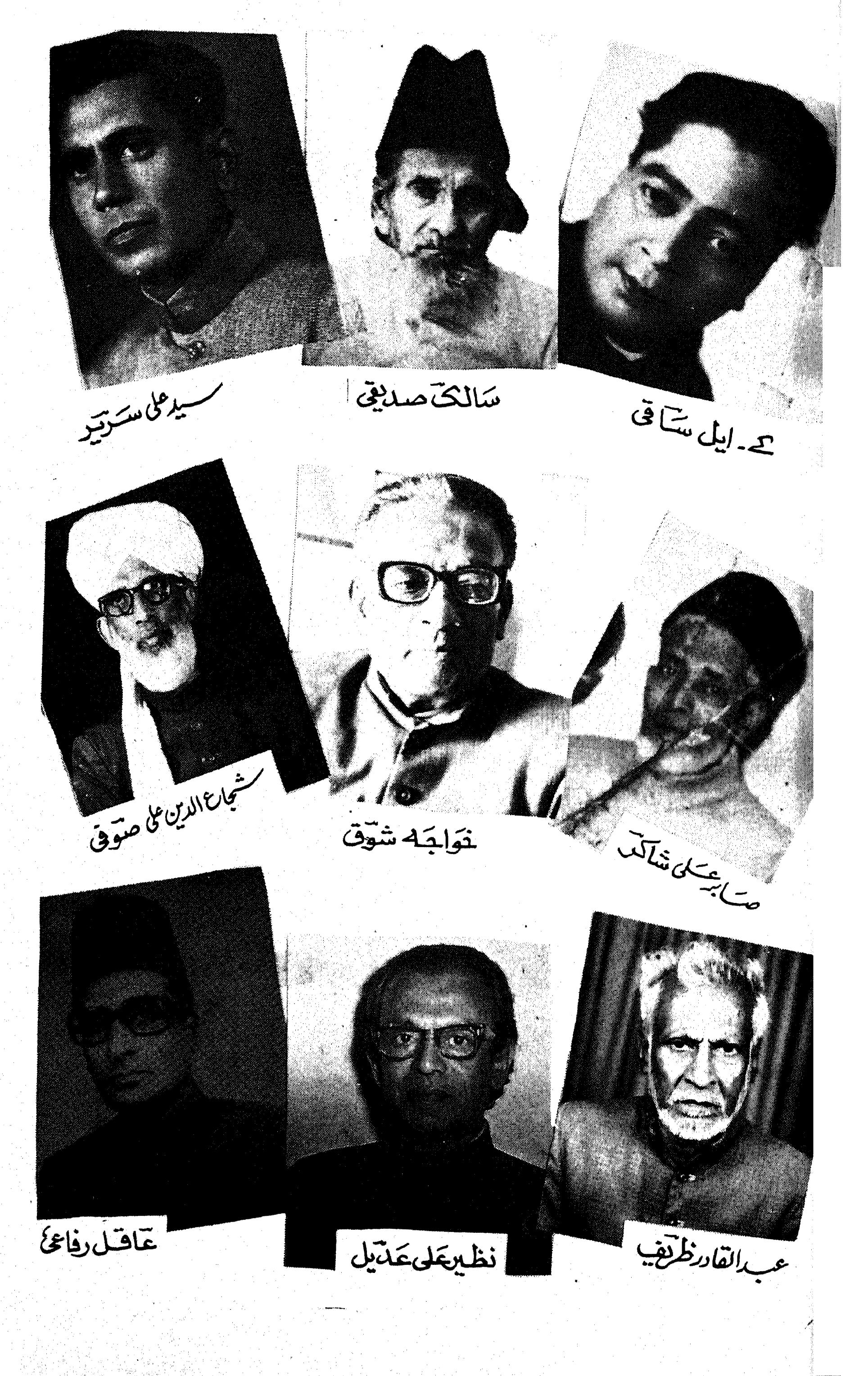
شعر خالدی — میر بہادر علی جوہر — یوسف علی خلوص



عبدالحمید خاں خیالی
میر یاور علی خنجر
راغب فاروقی

رضا فاروقی
صاحبزادہ ربط
مبارز الدین رفعت

غلام حسین رفیق
رہبر فاروقی
روحی قادری



کے۔ ایل ساقی

سالک صدیقی

سید علی سریر

صابر علی شاکر

خواجہ شوق

شجاع الدین علی صوفی

عبدالقادر ظریف

نظیر علی عدیل

عاقل رفاعی



غنی خالدی

علیم مدنی

ابو نعیم عیش

صاحبزادہ غوث

ڈاکٹر غیاث صدیقی

محمود عبدالقدیر

صاحبزادہ کلیم

غفار ماجد

ابوالشجاع محبت



امام علی مذاق

عبدالحفیظ محفوظ

غلام محبوب خان مسلم

شیخ حسین مشتاق

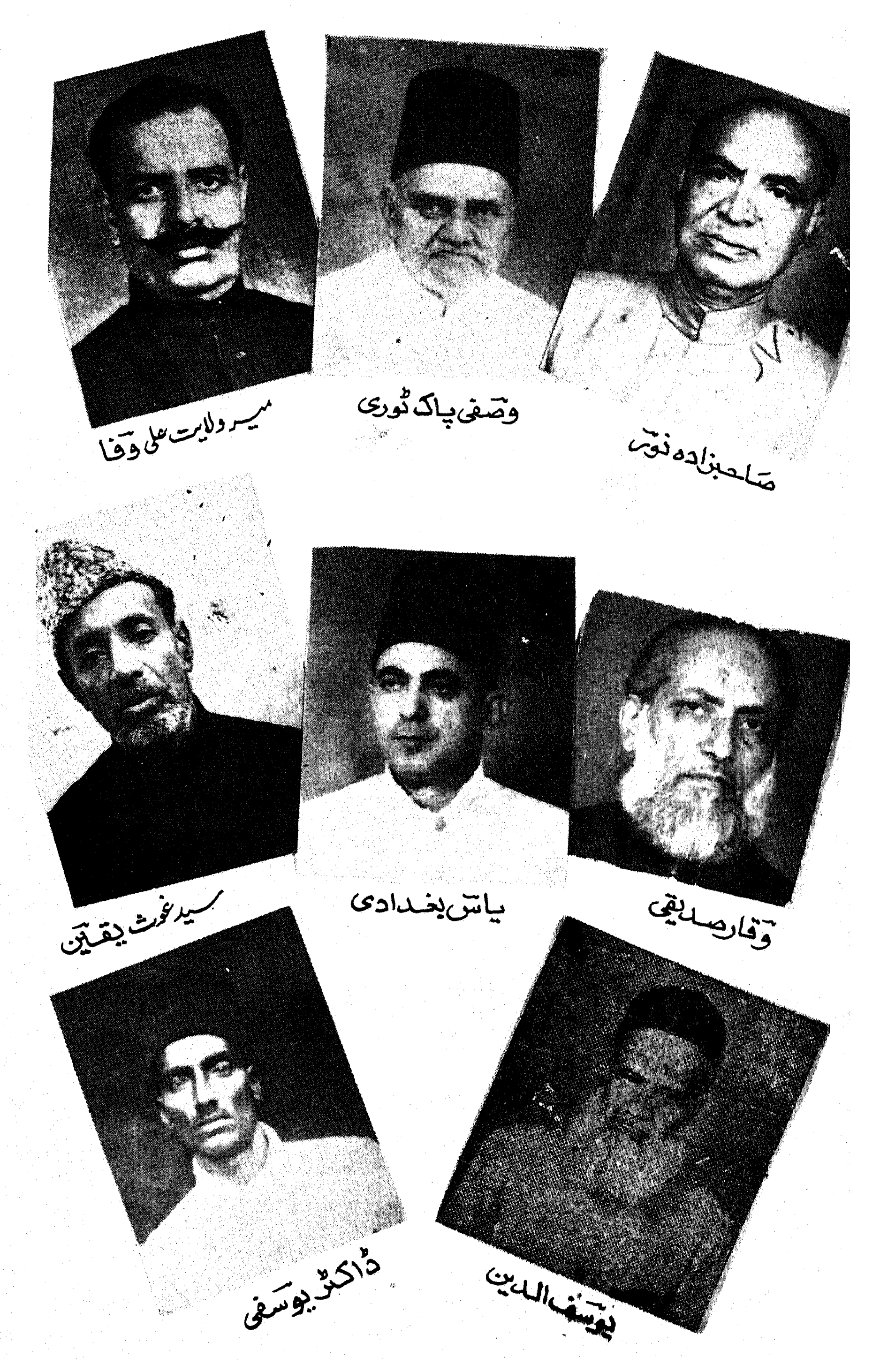
مظہر آسماں جاہی

ندیم مغربی

صاحبزادہ نظمی

قادر نعیم

سرفراز علی ناوک



صاحبزادہ نورؔ

وصفی پاک ٹوری

میر ولایت علی وفاؔ

وقار صدیقی

یاس بغدادی

سید غوث یقینؔ

یوسف الدین

ڈاکٹر یوسفی

تلامذۂ صفی اورنگ آبادی

پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی

ہر کجا چشمۂ بود شیریں
مردم و مرغ و مور گرد آیند

میر و مرزا، آتش و ناسخ، غالب و مومن، شاہ نصیر اور ذوق، انشا و مصحفی، امیر و داغ اور جلیل اور ایسے کئی شعراء چشمۂ شیریں تھے جن کی خدمت میں طالبانِ علم اپنی علمی پیاس بجھانے آتے۔ جو محفلوں میں حاضر نہ ہو سکتے وہ مراسلت سے اپنا تعلق قائم کرتے۔ شعراء کے تذکروں میں ان کے اساتذہ و تلامذہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مراۃ الاذکار (بدیع الدین نقش) فیض کے شاگردوں کا تذکرہ، تلامذہ مصحفی (ڈاکٹر مختار الدین آرزو) اور تلامذہ غالب (مالک رام) منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ایضائے سخن بھی ان کتابوں میں شامل ہے جو شعر کے حسن و قبح کو اجاگر کرتی ہے۔ بعض تذکرے بھی ایسے ملتے ہیں جن میں شعر پر تنقید کی گئی ہے۔ آبِ حیات، کلمات الشعراء، خزانۂ عامرہ، تذکرہ سرور وغیرہ۔ ان تذکروں کا مطالعہ مبتدی اور نوجوان شعرا کے لیے نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔

حیدرآباد میں بھی اساتذہ سخن کی کمی نہ رہی۔ امرائے عظام نے شعراء کی سرپرستی کی۔ مشاعرے منعقد ہوتے رہے۔ فیض، ضیا گورگانی، ترکی، داغ، جلیل یہ شاعری کے چشمۂ شیریں تھے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی صفی اورنگ آبادی بھی ہیں جنھوں نے اپنے وسیع مطالعہ کی بناء پر زبان پر قدرت حاصل کی تھی اور ان کے گرد تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ بھی تھا۔ تلامذہ استاد کے پاس حاضر ہوتے۔ اصلاح طلب اشعار پر اصلاح ہوتی اور ایک ایک لفظ کی تبدیلی شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی۔ ایسی تبدیلیوں کا مطالعہ نظر میں وسعت، زبان کی صحت، تخیل کی رفعت اور شعر کی باریکیوں کو سمجھنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔
نواب محمد نور الدین خاں صاحب اپنی تصنیف سوانح عمری صفی اورنگ آبادی

ہیں صفحہ ۱۰۰ سے اصلاحیں کے زیرِ عنوان چند شاگردوں کے اشعار پر استاد نے جو اصلاح دی ہے انھیں پیش کیا ہے یہ حصہ اہمیت کا حامل ہے۔

اب جناب محبوب علیخان صاحب اخگرؔ صفیؔ کے شاگردوں کا تذکرہ مرتب فرما رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تلامذہ کے اصلاح شدہ اشعار بھی پیش کریں خواہ وہ دو دو چار چار اشعار ہی سہی۔ اس سے مبتدی اور نوجوان شعرا استفادہ کریں گے اور عام قاری بھی فیض یاب ہوسکیں گے۔

محمد اکبر الدین صدیقی
ریڈر ریٹائرڈ عثمانیہ یونیورسٹی

چار قندیل آغا پورہ
حیدرآباد ۱۲

صفی اورنگ آبادی کی شاعری

از ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ سابق پروفیسر و ڈین شعبہ آرٹس عثمانیہ یونیورسٹی

اورنگ آباد کی تہذیب قدیم بھی ہے اور عظیم بھی اسی وجہ سے اس کو خجستہ بنیاد کہا گیا مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہ ہندو صوفی اور سنتوں کی قیام گاہ یعنی دیوگڈھی کے نام سے موسوم تھی۔ محمد تغلق کے عہد میں مسلمان صوفیا اور اکابرین کی آماج گاہ بنی ابھی اورنگ آباد سے قریب خلدآباد کئی صوفیا، اولیاء کی آرام گاہ ہے۔

صفی کا اپنے تخلص کے ساتھ اورنگ آبادی کا تلازمہ اختیار کرنا اورنگ آباد کی اسی عہد رفتہ کی عظمت کی بازیافت اور اس کا اعتراف ہے۔

اس سے قطع نظر شہر اورنگ آباد اردو زبان و ادب کا اہم مرکز تھا۔ اسی سرزمین سے ولی، سراج۔ داؤد، اسد علی خان تمنا جیسے شعراء اٹھے۔ لالہ لچھمی نارائن شفیق اور آزاد بلگرامی نے یہیں اپنی معرکتہ الآراء تصانیف پیش کیں۔ اردو شاعری کی نشوونما میں دبستان اورنگ آباد کا خاصہ اہم حصہ رہا۔ (یہاں میں نے دبستان کی اصطلاح اس لیے استعمال کی کہ اورنگ آباد کے ادب کی لسانی خصوصیات پر دہلی کی کھڑی بولی یعنی سادہ و سلیس زبان کا زیادہ اثر پڑا)۔ بقول دور حاضر کے ایک مشہور ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خان وہ حیدرآباد میں دکھنی اور شمالی ہند کی اردو کی کشمکش کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"عہد عالمگیر میں اورنگ آبادی شعراء کی جو کھیپ اورنگ آباد سے اٹھی اس نے محاورہ گولکنڈہ و بیجاپور کا لسانی تتبع کم کیا ہے"

دوسرے ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اولین پرنسپل جامعہ عثمانیہ کے قول کے مطابق ولی، سراج، داؤد وغیرہ نے "اورنگ آبادی اردو" میں شاعری

کی. ان شعراء کی زبان کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "اورنگ آبادی اردو" تیزی کے ساتھ محاورہ دہلی سے قریب تر اور محاورہ گولکنڈہ اور بیجاپور سے دور ہوتی جا رہی تھی" اس کی شہادت علم زبان کی تاریخ کا ہر عالم دیتا ہے۔

صفی کی شاعری میں اسی "دبستان دہلی" کی جلوہ فرمانیاں ہیں۔ غالباً صفی کو بھی اپنی زبان کی صفائی۔ روزمرہ کے استعمال اور سلاست تیز جذبات نگاری کی خصوصیات کا احساس تھا تب ہی انھوں نے "اورنگ آبادی" کا تلازمہ کسی حال نہیں چھوڑا۔

اس میں شک نہیں صفی کم سنی میں حیدرآباد آ گئے۔ حیدرآباد میں اس وقت اور اس سے پہلے احسن الدین خان بیان، حفیظ دہلوی، داغ دہلوی ان کے قریب تر زمانے میں جلیل مانک پوری فانی بدایونی، ضامن کنتوری، صدق جائسی، علی حیدر نظم طباطبائی اور حیدرآباد کے مشہور شعراء فیض، توفیق، کیفی کے نغمے گونج رہے تھے۔ شمس الدین فیض اور توفیق کو گزرے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ رضی الدین حسن کیفی بقید حیات تھے۔ جنکے آگے صفی نے زانوئے تلمذ بھی تہہ کیا۔ لیکن آگے چل کر وہ کیفی سے آگے نکل گئے۔ وہ اس طرح کہ "صفی" ایک طرح کی حیدرآباد دکن کے عوامی شاعر تھے یہ خاص و عام میں مقبول تھے۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے گراموفون ریکارڈ بجتے تھے۔ قوال اور ارباب نشاط ان کی غزل گاتے تھے۔ جب ہی تو ان کی شاگردوں کی تعداد چار سو دس (۴۱۰) کے قریب بتائی جاتی ہے گو اہل حیدرآباد شمالی ہند کے زبان دانوں کے مقابل احساس کمتری میں مبتلا رہتے تھے۔ اس لیے جلیل مانک پوری استاد شہ بن بیٹھے۔ صفی کی سرپرستی ایک امیر نواب معین الدولہ نے کی۔ اگرچہ بقول سوانح نگار صفی جناب نور الدین خان صاحب، ڈاکٹر زور صفی کو نواب معظم جاہ بہادر شجیع کے دربار میں لے جانا چاہتے تھے لیکن یہ "آہو" کسی کا شکار نہ ہو سکا اردو شاعری کی تاریخ میں اچھا ہی ہوا کیوں کہ اگر صفی شاہی درباروں میں بار پا لیتے تو عوام سے دور ہو جاتے اور طیور کے ایسے محل میں مقید ہو جاتے جنھیں عوام صرف دور سے دیکھ سکتے تھے۔ اگر ابو نصر خالدی صاحب کی روایت پر بھروسہ کیا جائے تو صفی کا پورا

کلام ہمارے دسترس میں نہیں۔ اور یہ خزینہ زیرِ آب ہوگیا ہے۔ لے دے کے صرف ان کی غزلیات کی تین مجموعے "پراگندہ" ۔ مولفہ خواجہ شوق، گلزار صفی، اور فردوس صفی مولفہ لقیق صاحب ہی میسر آتے ہیں۔ ورنہ ممکن تھا انھوں نے غزل کے علاوہ نظیر اکبرآبادی کی طرح حیدرآباد کے میلے ٹھیلے۔ عوامی تقاریب اور دیگر مصروفیات کی بھی تصویریں کھینچی ہوں جو اب ناپید ہیں جو شاید حیدرآباد کی ثقافتی زندگی کا اہم سرمایہ ہوتے۔ ان کی جو غزلیں ملتی ہیں وہ سلاست زبان۔ روزمرہ اور محاورہ کے برموقع استعمال سب سے بڑھ کر واردات قلبی کی سچی تصویریں ہیں۔ صفی کی شاعری واردات کی شاعری ہے جو دل پہ گزرتی ہے وہ اُسے بلاکم و کاست قلمبند کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں۔ ؎

رنگینیٔ خیال میں ہے خونِ دل صفی
میری خزاں ہے اور غزل کی بہار ہے

واردات قلبی کے شاہد یہ اشعار دیکھیے۔

تھا دوستی کا لطف نہ تھے جب تکلفات — کچھ بے خبر سے آپ تھے کچھ بے خبر سے ہم
آج اس کی دھن میں کچھ ایسے چلے — راہ میں کتنوں سے ٹکر ہو گئی
میرے آنسوؤں نے جلایا عدو کو — تماشا ہے پانی میں چنگاریاں ہیں
ہمیں معشوق کو اپنا بنانا تک نہیں آتا — بنانے والے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

روزمرہ کی صفائی دیکھیے۔

اے صفی وقت کو بُرا نہ کہو — وقت پیغمبروں پر آیا ہے
اچھے گُن دیکھ اچھی شکل نہ دیکھ — سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے
صفی کو مسکرا کر دیکھ لو غصہ سے کیا حاصل — اسے تم زہر کیوں دیتے ہو جو مرتا ہے شکر سے

اس طرح ان کا دیوان اسی طرح کے سادہ و سلیس اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں۔ ع

نہ جانے ہند والے کون ہیں اور لوگ کیا ہیں — صفی ہم دکنیوں کی صاف اردو اسکو کہتے ہیں
جس طرح دشت و در میں ایسے بھی پھول کھلتے ہیں جن کے مسکرانے میں "مشک اذفر کی

کی خوشبو ہوتی ہے اور سینہ سمندر میں ایسے بھی صدف ہوتے ہیں جن کے دامن میں کئی گوہر شہوار پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح صفی کے اشعار "دشت و در" کے ایسے پھول ہیں جسے اس صحرانورد اور جاں باز خواص کی ضرورت ہے جو صحرا کی کلفت کی پرواہ کئے بغیر اور سمندر کی دہشت کھائے بغیر منظر عام پہ لائے۔ مجھے خوشی ہے کہ ان کے شاگردان رشید اور شاگردوں کے فرزندان سعید یہ کام بحسن خوبی انجام دے رہے ہیں۔ میری مراد جناب نظیر علی عدیل۔ جناب رؤف رحیم (فرزندِ نابالغ شاگردِ صفی) اور جناب نور الدین خان اور جناب محبوب علیخان اخگر سے ہے۔

رفیعہ سلطانہ

پھول بن ۱۲/۱-۲-۱۲
یونیورسٹی روڈ

نوٹ: پروفیسر رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے حضرت صفی کے جن مجموعوں کا تذکرہ فرمایا ہے ان کے علاوہ ایک منتخب مجموعۂ کلام حضرت صفی کے نام سے پروفیسر مبارز الدین صاحب رفعت نے ۱۹۶۲ء میں طبع کرواکر شائع فرمایا تھا۔ (مولف)

۷۸۶
۴۹۲

دبستانِ صفیؔ

پروفیسر اشرف رفیع
(صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن)

صفیؔ نے جس زمانے میں شاعری کا آغاز کیا تھا اس وقت سرزمین دکن میں شمالی ہند کے دو ممتاز اساتذۂ سخن امیرؔ مینائی اور فصیح الملک داغؔ کی نواسنجیاں ابھی فضائے ادب میں گونج رہی تھیں۔ حیدرآباد میں شعراء کی تعداد بیسیوں نہیں سیکڑوں میں تھی۔ ردیف وقافیہ اور بحر کی تبدیلیوں کے ساتھ الفاظ کے اُلٹ پھیر سے، پٹے ہوئے مضامین کی ملمع کاری عام ہو چکی تھی۔ شعراء عام طور پر فکر کی تہی دامنی کا شکار ہو رہے تھے۔ فکر و ادب کی اس کساد بازاری میں آصفی دربار اور امرائے دربار کی سرپرستیوں نے حیدرآباد کے شاعروں اور بیرونِ ریاست سے آنے والے شاعروں کو نئی راہیں سجھائیں مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کے دربار میں جہاں نظم طباطبائی، فانیؔ بدایونی، نظام شاہ لبیبؔ، مسعود علی محویؔ اور حبیبؔ کنتوری جیسے آئمہ فن اپنے کلام کی داد وصول کر رہے تھے وہیں صفیؔ اورنگ آبادی کا بھی قلندرانہ، صاف ستھرا اور پاکیزہ لب ولہجہ عوام و خواص کے دلوں پر اپنا سکہ جما رہا تھا۔ صفیؔ ایک آشفتہ سر اور قلندر مزاج شاعر تھے۔ ذہانت اور ذکاوت قدرت سے ملی تھی مگر گردشِ روزگار نے سلیقہ سے زندگی بسر کرنے کا موقع نہیں دیا۔ کم عمری میں تلاشِ معاش کے لیے جگہ جگہ کی خاک چھانی۔ کہتے ہیں ؎

ہم گردشوں میں ایک بگولہ بنے رہے بگڑی ہوا تو خاک اڑائی کہاں کہاں

امیر پائیگاہ نواب معین الدولہ اور مہاراجہ کے دربار سے چاہتے تو وابستہ ہو جاتے۔ درباروں کے جوڑ توڑ اور ملازمتوں کے قیود اور بندشوں سے تنگ آکر

گھر بیٹھ گئے اور شاعری سے ناطہ جوڑ لیا۔ جو شاعر اپنے من میں ڈوب کر تلاشِ سخن کرتا ہے اس کے کلام کو اس کی زندگی کے نشیب و فراز سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ صفی کا شمار بھی ایسے ہی شاعروں میں ہونا چاہیئے جن کا کلام ان کی زندگی اور طرزِ زندگی کا آئینہ دار ہے۔

صفیؔ غزل کے مسلم الثبوت استاد اور اپنی طرز کے بے مثل شاعر تھے۔ ان کی غزل میں رعنائی ہے اور رنگینی بھی، سحر انگیزی ہے اور سحر آفرینی بھی۔ ان کی غزلوں میں ارتکازِ خیال اور شدید داخلیت ہے اور ساتھ ہی خارجیت اور جامعیت بھی۔ صفی کے کلام میں ایک ایسا درد ہے جو اپنا درماں آپ ہی ہے، ایک ایسا سوز ہے جس پر زندگی کی حرارت کا گماں ہوتا ہے۔ صفی کی اس آواز کو سمجھنے کے لیے ان کے لب و لہجہ سے واقفیت بہت ضروری ہے۔

صفی کے لہجے سے زورِ حیات آشکار ہے۔ زندگی ان کی شاعری میں لوٹتی، ہنستی، تڑپتی، ترستی، ڈرتی جھجکتی، سنبھلتی نظر آتی ہے چند اشعار سے اس حقیقت کا پتہ چل سکتا ہے

یہی آنکھیں، یہی دل ہے تو بس اللہ حافظ ہے
نہیں معلوم کیا ترکیب ہے دنیا میں جینے کی

پھر تازہ رنج پہنچا، پھر تازہ آفت آئی
جاتی نہیں الٰہی! تقدیر کی برائی

اب اس کے در سے اُٹھ کے کہاں جائیں ہم نشیں
تھوڑی سی رہ گئی ہے بہت سی گزر گئی

خاموش ساتھ ساتھ کہاں تک چلا چلوں
انسان ہوں کچھ آپ کا سایہ نہیں ہوں میں

حسن و عشق، اردو غزل کا ایسا بنیادی موضوع ہے جس سے کسی بھی شاعر کو مفر نہیں۔ صفی خود بھی کہتے ہیں:۔

ختم ہو جاتے جو حسن و عشق کے راز و نیاز
شاعری بھی ختم ہو جاتی نبوت کی طرح

صفی کی شاعری میں حسن و عشق کی جو تصویریں ملتی ہیں وہ زندگی سے بہت قریب ہیں۔ ان کا محبوب نہ درد کے محبوب کی طرح ماورائی ہے نہ داغ کے محبوب کی طرح جنسِ ارزاں۔ صفی کا محبوب ایک جیتا جاگتا انسان ہے جو مقدر سے ملتا ہے۔ زر اور زور سے ملے تو صفی اُسے معشوق نہیں کہتے ہے

کہیں معشوق ملتا ہے کسی کو زور و زر سے   زلیخا کو ملے تھے حضرتِ یوسفؑ مقدر سے

صفی ایسے حسن کے پرستار ہیں جس میں بانکپن ہو، آن بان ہو مگر تہذیب اور متانت کے ساتھ ؎

ادا پیدا نظر سے شان رُخ سے آن تیور سے   ترے قربان آخر دل ہے کس کس کیلئے تر سے

چاند تم سا، نہ پھول تم سا ہے   ہائے یہ سانولا سلونا رنگ

صفی حسن و عشق کے مقام و منصب کا لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کے عشق میں گناہ کا کوئی تصور نہیں معصومیت پھول کھلاتی نظر آتی ہے۔

رخسار لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَہَّرُوْنَ   اس کا لحاظ وہ ہے جو قرآن کا لحاظ

ہم ہیں کہ کبھی آنکھ ملائی نہیں جاتی   وہ ہیں کہ کبھی ہاتھ ملایا نہیں جاتا

اوروں کی طرح صفی درِ حسن پر جبہہ سائی نہیں کرتے بلکہ اپنی انا اور خودداری کے تیور سے اپنی قدر و منزلت حسن پر جتلا بھی دیتے ہیں۔ عجز سے زیادہ انا اور خودداری کی آن بان وہاں بھی نظر آتی ہے جہاں اچھے اچھے سر جھکا دیتے ہیں۔ ؎

اپنی دہلیز کے سجدے بھی جو ہیں آپ کے بار   گھر میں رکھ لیجئے اٹھوا کے یہ پتھر اپنا

منہ ہی منہ میں شکوہ ہائے عاشقِ دل خستہ کیوں   بات سچی ہے تو پھر فرمایئے آہستہ کیوں

حکومت کے الفاظ لکھے ہیں ہم کو   یہ نامے ہیں یا "نیم سرکاریاں" ہیں

تمہارے نہ ملنے سے کیا ہو گیا   گزر ہی رہے ہیں، گزرنے کے دن

پوچھتے پوچھتے دلی کو چلے جاتے ہیں   آپ کو گھر نہیں معلوم صفی کا کیا خوب

صفی کے یہاں اپنے دور کے دیگر شاعروں کی طرح کوئی نظام یا فلسفہ نہیں۔ بعید از حقائق دانشوری، خارج سے گریز، ماورائیت غزل کی مترنم فضا کو بوجھل نہیں بناتی۔ وہ ایک مرنجاں مرنج شاعر تھے۔ خوش گفتار، دوسروں کے غموں کی آگ میں جلنے والے، اپنے دکھ انھیں کیا کم تھے کہ وہ اوروں کے دکھوں کا بوجھ بھی اٹھا لیتے تھے اور جب برداشت نہیں کر سکتے تو ایک گونہ بیخودی اور سرشاری میں ڈوب جاتے جیسے یہ اسباب بےخودی لاکھوں نعمتوں کی ایک نعمت ہوں ؎

آبرو کھو کر کوئی کیوں اہلِ دولت سے ملے
پاؤ ٹکڑا، لاکھ نعمت ہے جو عزت سے ملے

کسی کو کوئی کیا دے گا، کسی سے کوئی کیا لے گا
صفی! ہم تو حسابِ دو جہاں در دل سمجھتے ہیں

آداب نہ اخلاق، محبت نہ مروت
کرتے ہیں ہزاروں تری محفل کی شکایت

صفی کا عہد جاگیردارانہ روایات کا عہد تھا۔ جہاں دولت اور افلاس کے دو متضاد دھارے سماج کو تہہ و بالا کر رہے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد عالمی سطح پر اس خلیج کو پاٹنے کی کوششیں چل رہی تھیں اور دوسری جنگِ عظیم نے سماج میں دُور دُور تک پیوست ان جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ صفی اور صفی جیسے اہلِ کمال، صاحبِ احساس انسان اس شکست و ریخت کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ قوموں کی زندگی میں ایسا دَور ایک نازک زمانہ ہوتا ہے جب کہ زندگی کی طاقتیں ایک دوسرے سے متصادم نظر آتی ہیں۔ بہانے تراش کر مروجہ اور معتبر راہوں سے بھٹکنے والے تو ہر زمانے میں مل جاتے ہیں لیکن ایسے نازک دَور میں جو یائے مفاد لوگوں سے قدم قدم پہ سابقہ پڑتا ہے۔ صفی ایسے زمانے اور ایسے لوگوں پر کبھی طنز سے کبھی سادگی سے اور کبھی تیزی سے وار کرتے ہیں مثلاً

صفی اب زمانہ ہے نازک بہت
یہ ہیں اپنے سائے سے ڈرنے کے دن

صفی کیوں قدر کا طالب ہوا ہے اس زمانے میں
ارے کمبخت! تیرے پاس کتنا مال و زر اتنا

مخلوق ہاتھ چومتی ہے اِن کا اے صفی!
حیلہ تراش لیتے ہیں جو ہر گناہ کا

کیوں یاد رہیں صفی کے اشعار
مفلس کے کلام میں اثر کیا

غریبوں کو پڑا رہنے دو اپنے آستانے پر
کہ اس سے رتبۂ دولت سوا معلوم ہوتا ہے

کیفی کے وسیلے سے صفی کا رشتہ، دبستان دلّی سے ملتا ہے درد و غم عرفان اور تصوف جس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ لیکن داغ اس سے یکسر مختلف دبستان کے شاعر ہیں جہاں زندگی مادّی آلائشوں میں گزرتی ہے۔ جس زمانے میں داغ کے اشعار دکن کے گلی کوچوں میں گنگنائے جاتے تھے اسی زمانے میں میر شمس الدین حضرتِ فیض رحمۃ کے شاگردوں نے اور امیر مینائی کی نعتوں نے تقدس کا بھی ایک پاکیزہ ماحول شعر و ادب کی دنیا میں پیدا کر دیا تھا حقیقت و مجاز کی اِس

ہے لاکھ نعمتوں کا مزہ اک شراب میں
اچھی رہی یہ چیز جہانِ خراب میں

ذرا سی بھی پی لی جو کم ظرف نے
کہاں کا ادب پھر کہاں کا لحاظ

صفی جس زمانے کے شاعر تھے وہ زمانہ وضع داری کا تھا۔ وضع داری کو دکن کے باسی تمدن کی جان سمجھتے تھے۔ خود داری کو شیوۂ شرافت جانتے تھے اصولوں اور روایات کو سینے سے لگائے، جیتے تھے اور مرتے تھے۔ صفی نے بھی ان ہی اقدار کو ہر حال میں بنائے رکھا، ٹھوکریں کھائیں پر اپنی وضع نہیں بدلی ہے

جو دوست کی خوشی ہے وہ اپنی خوشی رہے
ہے تو یہی ہے ایک طریقہ نباہ کا

تیرے گدا کو دونوں جہاں سے غرض نہیں
صورت فقیر کی ہے تو دل بادشاہ کا

اخلاق و آداب، رشتے ناطے، عفو و درگزر اور احسان شناسی اس زمانے کی مروجہ قدریں تھیں جو کسی عنوان نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھیں ان اقدار سے انحراف اس وقت کے معاشرہ میں جُرم کے مترادف سمجھا جاتا تھا صفی کے کلام میں ان اقدار کی پاسداری اور قدر دانی کا جگہ جگہ اظہار ہے۔ صفی، کیفی کے شاگردِ رشید تھے۔ کیفی کے انتقال پر انھوں نے جس شدت سے اپنے غم کا اظہار کیا ہے اس سے استاد اور شاگرد کے مستحکم اور مقدس رشتے کا پتہ چلتا ہے۔ ؎

صفی استاد کا اور باپ کا رشتہ برابر ہے
مرے کیا حضرت کیفی تو سایہ اٹھ گیا سر سے

صفی کے کئی شاگرد تھے اس کے باوجود انھیں احساس تھا کہ فن میں کمال حاصل کرنا ہو تو استادانِ فن کی صحبت اور خدمت بے حد ضروری ہے ؎

صفی استاد بنتا ہے تو استادانِ عالم کی
اٹھاؤ جوتیاں، تازہ کرو حقے، بھرو چلمیں

صفی نے زندگی کے سوز و ساز کو دیکھا، پرکھا اور برتا ہے۔ اپنی وضعداری سے وہ اس کی دعوتِ عام بھی دیتے ہیں۔ ان کے منتخب اشعار سارے شہر میں زبان زدِ خاص و عام تھے۔ بزرگ انھیں بچوں کو یاد دلاتے تھے، موقع و محل سے اشارے دکنائے یا ضرب المثل کے طور پر ان اشعار کا استعمال کر جاتے تھے۔ دو ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

مصیبت نام ہے اہلِ وفا کی آزمائش کا
اسی میں آدمی کا حوصلہ معلوم ہوتا ہے

دھوپ چھاؤں سے صفی نے بھی خوب استفادہ کیا ہے۔

صفی نے باضابطہ مدرسہ و مکتب میں تعلیم حاصل نہیں کی لیکن اپنے ماحول اور دوست احباب سے بہت کچھ حاصل کیا۔ مولوی اعظم علی شائق، مولوی سید بادشاہ حسینی لئیق، مفتی اشرف علی، علامہ سید اشرف شمسی، جمال الدین لوری مولوی عبدالواسع، حکیم عبدالباقی شطاری اور پروفیسر ابو نصر خالدی کی ہم نشینی اور علمی صحبتوں نے صفی کے جوہر قابل کو خوب جلا دی۔ ان ہی صحبتوں کا اثر ہے کہ صفی کے کلام میں تغزل کی چھاپ کے ساتھ تصوف کی آب و تاب بھی نظر آتی ہے ان کی صوفیانہ فکر میں گہرائی و گیرائی یا کسی خاص نظام تصوف سے وابستگی نہیں ملتی۔ صفی کے ہاں ایک مرد قلندر کی آئینہ قلبی اور روشن ضمیری اور صدق و صفا کا انعکاس وانعطاف ملتا ہے۔

دل خانۂ خدا ہے تو پھر اس میں اے صفی — حسرت نہ ہو امید نہ ہو، مدعا نہ ہو

دل ہے کیا چیز اگر اتنا سمجھ لے انساں — نظر آنے لگے اللہ کی قدرت دل میں

ہر ذرہ کائنات کا سرمست عشق ہے — قربان جاؤں آپ کہاں ہیں کہاں نہیں

چمک جاتی ہے ایسی کون سی بجلی خدا جانے — کبھی پاتا ہوں سورج سے زیادہ روشنی دل میں

حائل بار امانت ہوئے ہم آپ صفی — اس نے کچھ بار تو ہم پر نہیں ڈالا اپنا

صفی کی غزلوں میں نعت کے بھی چند خوبصورت اشعار ملتے ہیں۔ دو شعر نمونتاً پیش ہیں:—

چاند سورج ہیں حسیں اور ہیں پیسا یہ بھی — آپ نے سایہ تو ان پر نہیں ڈالا اپنا

جاں جب نکلے تو ان کا نام لب پر ہو صفی — جسم میں جن کے لطافت تھی ہماری جاں کی

شمالی ہند سے آنے والے شاعروں اور ادیبوں کا جب سلسلہ دراز ہوا اور انھوں نے دکن والوں پر جب اپنی فضیلت و برتری جتانی شروع کی تو ایک دکن کی انکساری اور رواداری بھی ردِ عمل کے طور پر اپنی انفرادیت اور اہمیت جتانے پر مائل ہوئی چنانچہ دکن کے استاد کل میر شمس الدین فیض کے تلامذہ، احمد حسین مائل، ان کے تلامذہ اور کیفی کے شاگرد صفی نے دکن کی زبان و لب و لہجہ اور

یہاں کے تہذیبی اور اخلاقی اقدار کو اپنی شاعری میں پیش کر کے دکن کی انفرادیت اور شناخت کو منوانے کی کوشش شروع کی۔ حیدرآباد کا سرمایہ شعر و ادب اپنے آغاز ہی سے مجاز و حقیقت کا خوبصورت امتزاج اور اپنی تہذیبی قدروں کا آئینہ دار ہے۔ دکن کی تہذیب اور شاعری اپنے تقدم و تسلسل کے باعث دلی اور لکھنؤ کے مقابل تہذیبی اور علمی سطح پر امتیازی اوصاف رکھتی ہے جن کو صفی اور ان کے ہمعصر شعراء نے احساس و شعور کی پوری شدت کے ساتھ اپنے کلام میں پیش کیا ہے چنانچہ صفی نے دکن کی مشترک اور مخلوط تہذیب کو، حیدرآباد کے محاورے، روزمرہ، زبان اور بیان کو اپنے شعری اظہار کے سانچے میں اس بے ساختگی اور بے تکلفی سے سمو دیا کہ ان پر تصنع اور تکلف کا گمان تک نہیں گزرتا صفی کہتے ہیں ؎

صفی ہم دکنیوں کی صاف اردو اسکو کہتے ہیں
نہ جانے ہند والے کون میں اور لوتے کیا ہیں

صفی نے دکن کے روزمرہ اور محاورہ کو اکس خوبصورتی سے برتا ہیکہ شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے ؎

شاعری کھیل ہو گئی ہے صفی
اگے دکنے رہے ہیں فن کے لوگ

کھڑے ہوں تو ہو بیٹھو تو سر کو
سلام اس انجمن آرا کے گھر کو

صفی اپنی وضع قطع سے ایک زاہد خشک معلوم ہوتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی طبیعت میں بلا کی شوخی اور شگفتگی بھی تھی اس شوخی نے ایک ایسا رنگ اختیار کر لیا تھا جس کو ان کی غزل کی جان کہا جا سکتا ہے ملاحظہ ہو:

سب کچھ درست، شوخ میں ہم بے ذہا میں ہم
اچھا یہ کہیئے آپ ہیں معشوق یا ہیں ہم

اب اپنے آپ پری سے اندازہ کیجئے
پڑتی ہے ایسے ویسوں پہ میری نظر کہاں

آپ روٹھے ہیں تو ہم بھی ہیں خفا
قول ہی وہ تھا، نہ یہ اقرار نہیں

صفی حیدرآبادی روزمرہ اور محاورہ کے بادشاہ تھے جس سے ان کے کلام میں روانی آگئی ہے۔ محاورہ بندی اور روزمرہ کی پابندی صفی کو استاد کیفی سے ورثہ میں ملی تھی۔ سادہ اسلوب میں ایسے شعر کہنا جس میں زبان کا چٹخارہ اور

روز مرہ کی چاشنی موجود ہو صفیؔ کا کمال ہے صفیؔ نے اردو کو مقبول عام اور کثیر الاستعمال محاورات دیئے ہیں جن سے صفیؔ کے اشعار کی معنویت میں اضافہ ہوا اور ان کا شعری حسن بڑھ گیا ہے یہی وجہ ہے کہ صفیؔ کی زندگی ہی میں ان کا کلام حیدرآباد میں زبان زد عام ہو گیا تھا۔ فقیر گلیوں میں، عورتیں ڈھولک پر گایا کرتی تھیں اور اس طرح ڈوب کر جیسے یہ ان کے اپنے دل کی بات ہو اور ان ہی کی زبان میں کہی گئی ہو صفیؔ نے تکرار الفاظ اور مکالماتی انداز سے بھی خوب استفادہ کیا ہے جیسے

میری دعا کہ "دے مرے پروردگار دے" | تیرا یہ حکم "مانگ ہر اک چیز مجھ سے مانگ"
اور اپنے فضل سے تو مجھے بار بار دے | میں بار بار مانگوں جو درکار ہو مجھے
او آشنا فریب! فریب آشنا ہیں ہم | سب جان بوجھ کر بھی ہیں انجان آج تک

زبان تہذیب کی صحت مند نشانی ہوتی ہے، اپنی آگہی اور عرفان ذات کی جانب رہبری کرتی ہے۔ صفیؔ کا کلام دیگر شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ خصوصیت سے اپنی زبان، محاورہ اور روز مرہ کے باعث دکن والوں کے لیے ہمیشہ سرمایۂ افتخار رہے گا۔

صفیؔ حیدرآباد کے اُن اساتذہ میں سے ہیں جن کے فیض سخن سے سینکڑوں شاعر مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ شعرائے دہلی میں تلامذہ کی یہ کثرت یا تو مصحفی کے ہاں ملتی ہے یا پھر غالب کے پاس۔ حیدرآباد میں میر شمس الدین فیض علیہ الرحمہ کے بعد یہ اعزاز صفیؔ کو حاصل ہے۔ انھوں نے فارسی سے اردو میں آئی ہوئی استادی اور شاگردی کی اس روایت کو بڑے خلوص کے ساتھ آگے بڑھایا۔

ان کے شاگردوں کی فہرست جو اس تذکرہ میں دی گئی وہ اگرچہ مکمل نہیں ہے تاہم اس میں شامل ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفیؔ بہ حیثیت استاذ سخن، حیدرآباد کے ہر طبقہ میں مقبول رہے ہیں۔ ان کے شاگردوں میں مخصوص طبقہ کی قید نہیں تھی۔ ان میں صاحبزادگان، امراء، منصبدار، ملازمین سرکار اور عوام سبھی شامل تھے۔ جہاں ان کے شاگردوں میں نواب افسر الدین خاں افسرؔ کی اعلیٰ سماجی

نواب اقبال الدین خاں اقبال آسمان جاہی، نواب محمد مظہر الدین خاں مظہر، صاحبزادہ اشرف الدین علی خاں اشرف، صاحبزادہ میر محمد علی خاں تہور، صاحبزادہ خواجہ سعادت اللہ ثاقب، صاحبزادہ رحیم الدین علی خاں ربط، صاحبزادہ میر ذوالفقار علی خاں غوث یمنی دہیں پیرزادہ سید غوث محی الدین قادری جاوید، پیرزادہ سید محی الدین روحی قادری سید شاہ شجاع الدین علی صوفی اور بھرکشن لال ساقی، محمد غفار سلوان بھا خواتین میں بشیر النساء بیگم اور رئیس جہاں آرا شاداں کے نام بھی ملتے ہیں۔ صفی کے شاگردوں میں بعض نام ایسے بھی ملتے ہیں جو استادی کے مقام پر فائز رہے ہیں اور بفضل تعالیٰ آج بھی ہیں چند اہم نام مثلاً خواجہ شوق، پیرزادہ سید محی الدین روحی قادری، سید نظیر علی عدیل، غیاث صدیقی یہ ادبی فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

صفی بڑے پرگو شاعر تھے! اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے انھوں نے اپنے کلام کی قربانی بھی دی لیکن جس میں جوہر قابل دیکھا اسے اپنے شاگردوں کی صف میں شامل کرلیا۔ ان کے کلام کی اصلاح اور ان کی فنی ترقی کی ذمہ داری قبول کی۔ بخشش کلام سے ان کی صلاحیتوں اور شاگردانہ عقیدت کو مجروح ہونے نہ دیا۔ شاگردوں کے کلام پر اصلاح کا کام دلچسپی اور دیانتداری سے انجام دیتے تھے۔ وہ اصلاح تبرکاً نہیں دیتے تھے بلکہ ان کی اصلاح میں مضمون کا ترفع اور معیار کی بلندی کو بھی پیش نظر رکھتے تھے اصلاح دینے کے بعد وہ اس کی توجیہہ و تشریح بھی کردیتے تھے تاکہ شاگرد اپنی کوتاہی یا غلطی سے آگاہ ہو اور اصلاح کی نزاکت اور ضرورت کا بھی اُسے علم ہوجائے۔ اس لحاظ سے ان کی اصلاحیں "تنقید، تجزیہ اور تفہیم کا بھی بھرپور سرمایہ ثابت ہوتی ہیں۔ بعض شاگردوں کے کلام پر صفی کی اصلاحوں کو جناب محبوب علی خاں اخگر نے بڑی تلاش و جستجو کے بعد حاصل کرکے روزنامہ "منصف" حیدرآباد میں شائع کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے اس کی اب تک (۱۰) قسطیں شائع ہوچکی ہیں۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۹۰ء کے روزنامہ منصف صفحہ ۶ پر محبوب علی خاں اخگر صاحب نے اصلاحات صفی اورنگ آبادی کے سلسلہ میں وقار الدین صدیقی وقار کے کلام پر دی گئی اصلاح کے چند نمونے شائع کئے ہیں جس سے چند اشعار اور ان کی اصلاح نقل

کی جاتی ہے اس سے صفی کے شاعرانہ کمال اور علمی تبحر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۱) شش جہت سے تری آواز مجھے آتی ہے ۔ کتنی راہوں سے بیک وقت گزرنا ہے مجھے

حضرت صفی نے پہلے مصرع میں "مجھے" کو "جلی" سے بدل کر لکھا 'بیہم کے معنی کا اضافہ ہوا

(۲) وقار کا دوسرا شعر ہے

یہ نہ پوچھو کیا دیکھا یہ نہ پوچھو کیا پایا ۔ میری خود فراموشی حاصلِ نظارہ ہے

پہلے مصرع میں صرف ایک لفظ "یہ نہ پوچھو کیا دیکھا" میں پوچھو کو "دیکھو" سے بدل کر مصرع اس طرح بنا دیا ؎

یہ نہ دیکھو کیا دیکھا، یہ نہ پوچھو کیا پایا

اور وجہ اصلاح لکھی کہ "پوچھو" کی تکرار کی گرانی رفع ہوئی نیز "حاصل" پوچھنے سے زیادہ غور و تامل کی چیز ہے۔

وقار صدیقی حیدرآباد کے ایک علمی اور ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں پیشہ تدریس سے وابستہ ہیں اصلاح کے بعد انھیں اشارۃً وجہ اصلاح لکھ دی لیکن دوسروں کے ساتھ زبانی تفہیم اور تنبیہ بھی کیا کرتے تھے۔

صفی کے طریقہ اصلاح کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ایک آدھ لفظ بدل کر شعر کو بلند کر دیتے تھے مگر ایسا کبھی نہیں کیا کہ شاعر کا اصل خیال یا مفہوم ہی بدل کر رکھ دیں۔ الفاظ کے مناسب اور موزوں انتخاب و تبدیلی سے شعر کی ترقی ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی تھی۔ صفی کے فیضان تربیت سے ان کا ہر شاگرد اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے ساتھ ہی ساتھ استاد کا اسلوبِ بیان بھی ان کے لیے شمع راہ بنا رہا جناب محبوب علیخان اخگر (مرتب تلامذہ صفی) کا کلام خواہ وہ نعت ہو کہ منقبت، غزل ہو کہ سلام، سادگی و سلاست نے ان کے اندازِ بیان کو رونق دی ہے۔ الفاظ کا انتخاب، روزمرہ اور محاورہ کا برجستہ استعمال استاد صفی کی یاد دلاتا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انھوں نے زندگی کے دورِ بہار میں استاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا یہ وہ نازک زمانہ ہوتا ہے جبکہ جوشِ عقیدت اپنا گہرا رنگ غیر شعوری طور پر شاگرد کے فکر و ذہن پر ثبت کر دیتا ہے۔ اخگر کی انفرادیت ان کے

اپنے غم سوز و گداز بندگی و نیاز میں ہے

ہم تری محفل میں آئے بھی تو کیا — نقش بن کر رہ گئے دیوار کے
کرم کی آس کیا دنیا جہاں سے — نگاہیں لگ گئیں جب آسماں سے
خطا کو در گزر فرمانے والے — ادا ہو شکر تیرا کس زباں سے
عشق کا ایک داغ کافی ہے — خانۂ دل میں روشنی کے لیے
وہ ایک نم ہو کر دنیا تمہاری ٹھوکر میں — وہ ایک ہیں جسے ٹھکرا دیا ہے دنیا نے

زندگانی صفی کی بعض راہیں لاابالی اور بے اعتدالی کا شکار تھیں مگر کج روی ان کی طبیعت میں نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ حضرات بھی ان سے وابستگی کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ اس زمانے کے کئی علیگیرین اور عثمانین ان کے شاگردوں کی فہرست میں نظر آتے ہیں خواجہ امان اللہ ارشد علیگڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں صفی کی شاگردی میں آنے سے پہلے بھی شعر کہا کرتے تھے اُس زمانے میں اُن کی شاعری کا آغاز ہوا جب علیگڑھ میں اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی کے چرچے تھے صفی کے آخری زمانے میں ان سے اصلاح لینی شروع کی جگر کے رنگ میں شعر کہتے ہیں۔

صفی کے شاگردوں میں ایک مشہور نام جہاندار افسر کا ملتا ہے۔ روایت سے انحراف، حریت پسندی اور آزادہ روی ان کی طبیعتِ ثانیہ ہے وہ بیک وقت اچھے اور دیانت دار صحافی بھی ہیں اور شاعر بھی جہاں دار افسر صفی کے ان شاگردوں میں سے ایک ہیں جنھیں صفی نے خود بلا کر اپنا شاگرد بنایا تھا۔ افسر کی لفظیات مضامین کا انتخاب اور اسلوب بیان صفی کے دبستان سے نسبتاً جداگانہ ہے ؎

کانٹوں کی دسترس میں ہے پھولوں کی زندگی — کیا ہوگا اب نظامِ گلستاں نہ پوچھئے
اے کشتگانِ بے گنہی کچھ نہ کچھ کرو — کیا انقلاب صرف کتابوں کی بات ہے
کیوں بندگانِ عام سے یہ سخت امتحان — پروردگار یہ تو رسولوں کی بات ہے

امیر پائیگاہ نواب معین الدولہ بہادر کی دیوڑھی میں صفی کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ معین الدولہ کے ہر مشاعرہ میں صفی کی موجودگی لازمی تھی۔

معین الدولہ کے صاحبزادہ نواب اقبال الدین خاں اقبالؔ بھی ان مشاعروں میں شریک رہا کرتے تھے۔ ان کا کلام صفیؔ کے رنگ سے بہت قریب ہے صرف ایک دو شعروں سے ہی اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

غنچۂ گستاخ ہوتے جاتے ہیں　　آپ کیسوں کو منہ لگاتے ہیں
آپ چھُپ کر جہاں بھی جاتے ہیں　　نقشِ پا، راستا دکھاتے ہیں

صفیؔ سے بھرپور استفادہ حاصل کرنے والوں میں سید محمد حسینی افتخاری باقیؔ کا نام ضرور لیا جائے گا جو مغلپورہ میں صفیؔ کے مکان سے بہت قریب رہتے تھے طبیعت میں شگفتگی اور شستگی تھی جسے صفیؔ کی صحبتوں نے اور پر لگا دیئے نوجوانی میں وفات پائی اور اگر اور جیتے رہتے تو صفیؔ کے باکمال جانشینوں میں شمار ہوتے ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

باقیؔ جو ایک مانگئے دیتا ہے دہ ہزار　　کس منہ سے شکر کیجئے پروردگار کا
رنگِ محفل ترے آتے ہی بدل جاتا ہے　　اپنی اپنی جگہ ہر کوئی سنبھل جاتا ہے
تم نے بیخود بنا دیا جس کو!　　حشر تک ہوش میں نہ آنے کا
میں تو کیا کوئی بتا سکتا نہیں باقیؔ کبھی　　آئے تھے دنیا میں کیوں دنیا سے کیوں جانے لگے

ابن احمد تابؔ فطری شاعر تھے ابتداء میں حبیب پاشا حیدرؔ سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے بعد میں صفیؔ کے شاگرد ہوئے۔ صفیؔ کو ان کی شعر گوئی و سخن گستری کو جلا دینے میں کوئی دقت پیش نہ آئی یہی وجہ ہے کہ تابؔ کو غزل گوئی میں خاصی مہارت ہو گئی۔ زبان میں صفائی اور سلاست ہے۔ خوبصورت فارسی ترکیبیں شعر کو تازگی اور شگفتگی عطا کرتی ہیں۔ تابؔ روایتی مضامین ہی نہیں باندھتے تھے بلکہ عصری روح بھی ان کے کلام میں نظر آتی ہے زندگی کی بعض حقیقتوں کو باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں۔

نہیں نصیب میں نورِ سحر تو غم بھی نہیں　　مگر چراغ کی صورت جلے ہیں شام سے ہم
اِن کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا پیمانہ ہے　　جن کو ساقی ابھی پینے کا سلیقہ بھی نہیں
کریں کرم نہ برائے کرم معاف کریں　　ہیں بے نیاز زمانے سے ہم معاف کریں

صفی نے اپنے بعض شاگردوں پر خصوصیت سے توجہ کی۔ حضرت شمس الدین تاباں ان خوش نصیب شاگردوں میں ہیں جن پر صفی کی خاص نظر عنایت تھی۔ اصلاح شعر کے علاوہ اصلاح ذات وصفات سے بھی نوازا۔ فن عروض اور قافیوں کے حسن و عیب کی تعلیم و تربیت سے ان کی شاعرانہ شخصیت کو صفی نے جِلا بخشی۔ غزل اور نظم دونوں میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ان کی منکسر مزاجی، انسان دوستی، خودداری، احسان شناسی اور رقیق القلبی ان کی شاعری میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ تاباں کے کلام میں تصوف کے اہم موضوعات بھی جگہ جگہ ملتے ہیں۔ تاباں نے جس ماحول میں سانس لی تاریخ کے جن اوراق کو الٹتے دیکھا سماج کی جن تبدیلیوں کو بھگتا اور محسوس کیا ان کو بھی اپنی شاعری میں سمو لیا ہے ان کے کلام میں سوز و گداز بھی ہے سادگی اور رعنائی بھی۔ بعض اوقات آیات و احادیث کے موزوں و مناسب استعمال یا ان کی طرف اشاروں سے کلام میں پاکیزگی اور تقدس کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ چند اشعار پیش ہیں۔

کعبہ، کنشت، دیر، کلیسا، مدرسے بھی	سب ان کے راستے میں ہیں گزرو جدھر سے بھی
یوسف کا حسن تھا کہ وہ عیسیٰ کا عشق تھا	کہیئے فرازِ دار پہ سر کون دے گیا
ہیں سرخرو یہ لالہ و گُل کس کے فیض سے	کہیئے چمن کو خونِ جگر کون دے گیا

میر بہادر علی جوہر صفی کے شاگردوں میں بڑے زود گو شاعر تھے شاعری کا ذوق کچھ تو ورثہ میں مِلا تھا اور کچھ استاد کی صحبت نے اسے جِلا دی۔ جوہر کے کلام پر استاد کا رنگ حاوی ہے اس تذکرہ میں ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ شامل ہے جس سے ان کے رنگِ سخن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت غلام علی حادی صفی کے جانشین تھے۔ حضرت کیفی نے حادی تخلص دے کر انھیں صفی کے سپرد کیا تھا۔ حادی عربی اور فارسی زبان و ادب کا اچھا شعور رکھتے تھے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ تاریخ گوئی میں انھیں کمال حاصل تھا ان کے یہاں زبان و محاورے کی خوش سلیقگی کے ساتھ تازگئ خیال اور بلندئ فکر بھی نظر آتی ہے۔ حادی کا مطالعہ خاصا وسیع تھا جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں عالمانہ شان بھی

جھلکتی ہے۔ بعض بعض مقامات پر علم و عرفان جب سادگی کے ساتھ جلوہ نما ہوتے
ہیں تو بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

دینے والا کس قدر ہو گا سخی — مانگنے والا اگر حاتم رہے
خدائی سے غرض کیا اس گدا کو — خدا سے مانگتا ہے جو خدا کو
دِل حامل آنا ہے آنا محلِ علم ہے — سادہ سا یہ ورق ہی مکمل کتاب ہے
خود کو یادش بخیر بھول گئے — اس کو دِل سے مگر بھلا نہ سکے

بہادر علی جوہر اور غلام علی حادی کے ہمعصروں میں محمد عبدالحمید خاں خیالی
کا بھی بڑا مقام ہے وہ صفی کے استاد بھائی بھی تھے اور ان کے جانشین بھی خیالی
نے قلبی واردات و کیفیات کو نہایت سادہ، صاف اور شستہ زبان میں ادا کیا ہے
کہتے ہیں :-

ان کے جلوے تو بہر حال جلوے ہیں مگر — دیکھنے والی نگاہوں کا مقدر دیکھئے
بغیر درد، لطفِ زندگی کیا! — سفر کے سب مزے ہیں ہمسفر سے

صفی کے یہاں بہت سے شاعر شاگردی کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے خود
چل کر آئے مگر روحی قادری صاحب اُن شاعروں میں ہیں جن کو صفی نے خود اپنا لیا۔
روحی قادری مولانا مفتی اشرف علی اشرف کے عزیز شاگرد تھے ان کے فیضِ صحبت
کی پرچھائیاں آج بھی روحی قادری کی شخصیت پر چھائی ہوئی ہیں ان کے لب و لہجہ
میں وقار اور علمی شان نظر آتی ہے۔ ان کی آواز کو یہ اعتبار ان کے خاندانی
پس منظر سے ملا ہے جہاں تصوف ہی طرزِ زندگی تھا۔ ان کی شاعری میں انفس و آفاق
کے گوناں گوں جلوے نظر آتے ہیں۔ تصوف کی گرہ کشائی فکر و نظر کی توانائی جذبے
کی پاکیزگی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں وہ نسبتاً مشکل زمینوں میں غزل کہتے
ہیں ان کے یہاں ردیف اور قافیہ کی ہم آہنگی کلام کو نغمگی عطا کرتی ہے۔ عزلت نشیں شاعر
ہیں دِل گداختہ رکھتے ہیں۔ زبان پر قدرت حاصل ہے مسائل زندگی پر گہری نظر ہے
عصری روح اور اس کے اضطراب، جذبات کے توازن اور روحانیت کی آمیزش نے
غزل کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ دو ایک شعر پر یہاں اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ اِن کا

سارا کلام پڑھنے کے لائق ہے۔

یہ نقطۂ وجود ہمارا لباس ہے
اس کو اتار دیں تو مکمل کتاب ہے

ذوقِ نگاہ قید ہے آئینۂ شہود میں
ہنستی ہے میری مبتلا عارضۂ وجود میں

اپنی ہر اک سانس میں ہم اک پردہ نشیں پر مرتے ہیں
ہم نے بھی کیا ڈھونڈ نکالی جینے کی تدبیر میاں

مبارز الدین رفعت نہ صرف صفی کے شاگرد تھے بلکہ ان کے عزیز دوست بھی تھے۔ پیشۂ تدریس سے وابستہ تھے سٹی کالج اور عثمانیہ یونیورسٹی میں فارسی کے استاد تھے انھیں عربی فارسی اور انگریزی پر اچھا عبور حاصل تھا۔ رضا زادہ شفق کی تاریخ ادبیات ایران کا اردو میں ترجمہ کیا۔ عرب اور اسلامی فن تعمیر سے انھیں خاص دلچسپی تھی اس موضوع پر انگریزی سے کئی مضامین اردو میں ترجمہ کئے۔ حیدرآباد کے اولین محققین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کا کوئی شعری مجموعہ ابھی تک مرتب نہیں ہوا۔

خواجہ شوق بھی صفی کے ان شاگردوں میں ہیں جن پر صفی بھی آج اگر ہوتے تو ناز کرتے۔ ابتداء میں مولوی مفتی اشرف علی کے آستانۂ سخن سے وابستہ رہے شوق صاحب ان کے شاگردِ رشید ہی نہیں بلکہ ارادتمندوں میں بھی تھے۔ مفتی صاحب جب زیارتوں کے لیے مقاماتِ مقدسہ گئے تو روحی قادری کے ساتھ شوق بھی صفی کے پاس رجوع ہوئے۔ صفی نے جس اسلوبِ سخن کی بنیاد رکھی تھی شوق نے اس پر ایک عظیم عمارت تیار کی۔ خواجہ شوق کی زبان اور اندازِ بیان صفی سے بہت ملتا جلتا ہے۔ غزلوں میں ان کا ایک ایک لفظ آئینہ کی مانند ہے اور یہ تمام آئینے اس نزاکت اور حسنِ ترتیب سے سجائے گئے ہیں کہ ذرا سی ٹھیس سے ان آئینوں کی جلا اتر جاتی ہے۔ زبان کی سلاست، بیان کی دلآویزی اور اظہار واقعیت میں انکا مقام سب سے جداگانہ ہے۔ کیفیات و وارداتِ قلبی کو سادگیٔ بیان کے ساتھ ظاہر کرنے کے عادی ہیں۔ اپنے شعری سفر میں شوق دربارِ شجیع سے بھی وابستہ رہے لیکن طمطراق اور نمود و نمائش سے یکسر بیگانہ ہیں آستانِ نادریہ زندگی بسر کرنے کو عینِ طاعت و عبادت سمجھتے ہیں۔ خواجہ شوق وضع دار حیدرآبادی ہیں ان کا سرِ نیاز جھکتا ہے تو ایک ہی آستانے پر جہاں سب کے سر جھکتے ہیں۔ زندگی کی تلخیوں اور حقائق پر ان کی نظر بڑی گہری ہے:

حکیمانہ اور اخلاقی مضامین ان کے یہاں موجود ہیں۔ عشقیہ مضامین کو اپنے کلام کا مقصود حقیقی نہیں سمجھتے تاہم زندگی کی ضرورت شمار کرتے ہیں جس سے ان کے یہاں جذبۂ عشق کو آفاقیت حاصل ہوجاتی ہے۔ ان کے یہاں دردانگیز خیالات نشاط روح کا سامان رکھتے ہیں۔ کلام میں صفائی، روانی برجستگی ہے بندش تراکیب اور محاورات کا استعمال جس خوبصورتی کے ساتھ ان کے یہاں ہوا ہے اس کی نظیر صرف صفی کے کلام ہی میں مل سکتی ہے۔

غیاث صدیقی شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ وہ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ شعر و ادب کا ذوق ورثہ میں ملا ہے فن عروض و آہنگ پر عبور رکھتے ہیں۔ مطالعہ وسیع ہے عربی فارسی انگریزی اور تلگو سے بھی اچھی واقفیت ہے۔ کئی ہمعصر شاعروں کے تلگو کلام کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ نظم اور غزل دونوں پر یکساں عبور حاصل ہے نظم اور غزل کے جدید رجحانات پر بھی توجہ کی ہے۔ عصری مزاج اور مسائل پر بھی بڑی نظر ہے اپنے کلام میں اپنے عہد کے حقائق کو سمو لیتے ہیں۔ غیاث صدیقی نے بحروں کے استعمال میں نئے نئے تجربے کئے ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور فقروں کی ترتیب میں توازن و تناسب موجود ہے۔

جناب نظیر علی عدیل، دبستان صفی کے روشن چراغ ہیں جن کی اپنی ایک انجمن ہے پچاس ساٹھ شاگرد آج ان کی شاعرانہ فنکاری اور عظمت سے استفادہ کر رہے ہیں۔ شاعری میں ان کے قدیم اسلوب کا رشتہ جدید اسلوب و آہنگ سے ہمکنار ہے۔ روایت اور جدیدیت کا یہی امتزاج ان کے کلام میں بلا کا حسن اور زور پیدا کر دیتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے ؎

دنیا میں اگر پھر آنا ہو دل لے کے نہیں آئیں گے عدیل
اک بات ہوئی تو سہہ لیں گے ہر بات میں دل آزاری ہے

دُنیا بسا کے مجھ کو کیا فائدا ہوا ہے — اک دل عطا ہوا ہے وہ بھی دُکھا ہوا ہے
بہت سنبھل کے گذرنا عدیل دنیا سے — قدم قدم پہ یہ ٹوٹی ہوئی سڑک ہے میاں
حسن ہے اصل میں فروغ نظر — لوگ اپنی نظر پہ مرتے ہیں

کیوں گناہوں سے کریں ہم اجتناب
زندگی اول خراب آخر خراب

یادِ محبوب اگر شکل میں ڈھل جاتی ہے
دیکھنے والے اسے تاج محل کہتے ہیں

دار پر چڑھ گیا کوئی لغزشِ ناتمام پر
بات غلط نہ تھی مگر کہہ دی غلط مقام پر

بے ثباتی پائی ہے انسان نے
سطحِ پر مٹی کی ابھرا ہے حباب

گئے وہ دار سے کیوں اشکبار کیا جانے
جو لوگ ہنستے ہوئے لائے سوئے دار مجھے

اک نیا ہے باب یہ تاریخ کے ابواب میں
بچ گئے ہم دشمنوں سے لٹ گئے احباب میں

'تذکرۂ تلامذۂ صفی' میں اخگر صاحب نے سب کا تفصیل سے تعارف کروایا ہے یہاں اس مختصر سے مضمون میں ہر ایک کا تذکرہ ممکن نہیں۔ ادبستانِ صفی کے ان خوشہ چینوں اور ان کی نواسنجیوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دکن کی بساطِ سخن کے سجانے میں صفی اور صفی کے شاگردوں کا بڑا حصہ ہے۔ ان اربابِ سخن کی رات دن یہی کوشش رہی کہ اردو زبان اور اردو شاعری کو "سرمۂ چشمِ اہلِ نظر" بنائیں۔ دکن کے محاورات اور روزمرہ کو علمی اور ادبی وقار عطا کریں فارسی اور عربی کے ادق الفاظ کے بیجا اور بے ضرورت استعمال سے پرہیز کریں زبان و بیان اور ابتذال و آلائش سے جبینِ سخن کو پاک صاف رکھیں زندگی کے حقائق کو ترجیح دے کر دبستانِ صفی کی قدر و منزلت میں اضافہ کریں۔

اشرف رفیع

تعارف

جناب محبوب علیخان اخگر
(مرتب تذکرۂ تلامذۂ صفی)

از ۔ رؤف رحیم (ایم اے) معتمد ادبستان دکن

نام محبوب علی خان ۵ رنومبر ۱۹۲۵ء کو جناب محمد بہادر خاں صاحب کے مکان دیوڑھی نواب مدن خاں المخاطب رستم دل خاں چیلہ پورہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے سٹی کالج سے میٹرک تک تعلیم پائی ۱۹۵۵ء میں جامعہ نظامیہ سے منشی کامیاب کیا اور سررشتہ کروڑگری میں ملازمت اختیار کی پولس ایکشن کے بعد تخفیف کا نشانہ بنے ۱۹۶۱ء میں پبلک سروس کمیشن کا امتحان کامیاب کرنے پر سررشتہ مال نلگنڈہ ضلع حیدرآباد میں انجذاب عمل میں آیا۔ یکم نومبر ۱۹۸۳ء میں بحیثیت نائب تحصیلدار ڈی ایس او آفس سے وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

جناب محبوب علیخان کی اخگر شاعری کو حضرت فصیح الدین صاحب مہر کی تمازت نے ایک شعلہ بناڈالا یعنی کہ حضرت محبوب علیخاں اخگر کے پہلے استاد حضرت مہر تھے جو حضرت عاصم نلگنڈوی کے تلامذۂ رشید تھے۔ حضرت مہر کے انتقال کے بعد میر محمد علی فقیر مرحوم کے آگے جناب اخگر نے زانوئے ادب تہہ کیا اور حضرت فقیر کے انتقال کے بعد جانشین حضرت صفی حضرت غلام علی حادی کے روبرو دامن طلب پھیلایا اور اپنے دامن میں گل مراد پائے۔ حضرت صفی سے والہانہ محبت نے حضرت اخگر کو تلامذۂ حضرت صفی کی تذکرے کی اشاعت کی جانب راغب کیا۔ یوں تو حضرت صفی کے شاگردوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا لیکن حضرت صفی کے قلم سے لکھے گئے تلامذہ کی تعداد ۱۵۷ ہے۔

حضرت صفی ایک پُر گو شاعر ہی نہیں تھے بلکہ شاعر نواز بھی تھے لاابالی طبیعت کے باعث اکثر شاگرد اُن کی طبیعت کا استحصال کرتے رہے ۔ حضرت صفی نے غزل کو اُس کا مقام دلایا اور مکتبِ داغ کی توسیع کی اور آج اُن کے شاگردان کی خوشہ چینی کرتے ہوئے داغ کے جلائے ہوئے ایاغِ شاعری کو اپنے خونِ دل سے روشن رکھے ہوئے ہیں ۔ جن شعراء نے حضرت صفی کے نام کو روشن رکھا اُن میں مرحومین میں حضرت ھادی، ناوک، یقین، جوہر، تاباں وغیرہ ہیں اور آج حضرت نظیر علی عدیل، خواجہ شوق، ڈاکٹر غیاث صدیقی وغیرہ ایسے نام ہیں جن سے شاعری اور خصوصاً غزل کی آبرو قایم ہے ۔ جناب محبوب علی خاں اخگر نے اپنی سعی سے تقریباً تلامذۂ صفی کے حالات مع نمونۂ کلام اور تصویر کے فراہم کئے۔ کسی کتاب کو مرتب کرنا ایک جوئے شیر لانے سے کم نہیں ۔ حضرت صفی کے شاگردوں نے جو کام نہیں کر دکھایا ان کے شاگردوں کے شاگردوں نے کیا ۔

جناب اخگر اپنی محنت سے کمائی ہوئی پونجی، اپنے ذوق کی تسکین، ادب کی خدمت اور اپنے استاد کے استاد بھائیوں کے نام اور کلام کو محفوظ کرنے میں صرف کر رہے ہیں اس عمر میں جس میں انسان کاہل اور آرام پسند ہو جاتا ہے خدا کا فضل ہے کہ حضرت اخگر کی محنت کا پیڑ آج سایہ دار ہو کر ہم جیسے مسافرانِ دشت کو سایہ دے کر ایک ذوق کی تسکین کر رہا ہے ۔

جناب محبوب علی خاں اخگر خود ایک اچھے شاعر ہیں زمانہ طالب علمی سے شاعری کا ذوق رکھتے ہیں اور مہر، فقیر، اور ھادی جیسے اساتذانِ سخن سے فیضِ سخن حاصل کر کے اپنے افکارِ زریں کو قلمبند کر چکے ہیں ۔ دکن کے شاعروں کا یہ خاصہ رہا ہے کہ وہ انکساری کے باعث اپنے کلام کو شائع کروانا نہیں چاہتے یا مشاعروں میں اپنے کلام سُنانے کو تشہیر بے جا سمجھ کر شرکت سے گریز کرتے ہیں جس کے وجہ انھیں وہ شہرت حاصل نہیں ہوتی جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں ۔ جناب اخگر کا شمار بھی ان شعراء میں ہوتا ہے جو چھپنے سے زیادہ چھُپنے کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنے افکار کے کنزِ مخفی سے اشعار کے دُرِ نایاب کو طالبانِ ذوق تک پہنچنے نہیں دیتے ۔

جناب محبوب علی خاں اخگر عرصہ تک بزم تلامذہ صفی اورنگ آبادی کے معتمد رہے پہلے انھوں نے تلامذہ صفی کے تذکرہ کو صرف شعراء بزمِ تلامذہ صفی کی حد تک محدود کیا تھا۔ جو ۱۹۵۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ شاگردانِ صفی میں ہر وقت تناؤ رہا اور گروپ بازی کے باعث وہ ایک جا نہیں رہ سکے۔ لیکن پارے کو کتنا بھی علحدہ کریں وہ پھر یکجا ہو جاتا ہے اسی طرح جناب اخگر نے تمام شاگردان کے تذکرے کی اشاعت کو ضروری جانا تاکہ گروپ بندی کا شائبہ نہ ہو۔

آج مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرے بزرگ دوست اپنی ہمت اور محنت سے وہ کارنامہ کر دکھائے ہیں جس کے آگے نوجوانوں کا سر شرم سے جھک جائے گا۔

جناب اخگر کا یہ تذکرہ یقیناً ایک قابل تقلید کارنامہ ہے اور قابل تحسین اقدام۔ جس کے لیے وابستگانِ صفی اورنگ آبادی اور عاشقانِ غزل ان کے لیے دست بہ دعا رہیں گے کہ انھوں نے اُن شعراء کے حالات اور کلام کو پیش کیا ہے جن کو آج کی نسل نے فراموش کر دیا تھا۔ جن کے کلام کی سلاست، گہرائی گیرائی، فصاحت، بلاغت اور فنِ عروضی پر عبوریت آج کے شاعر کے لیے مشعلِ راہ بنے گی جس کی روشنی میں آج کا شاعر اپنی منزل مقصود پالے گا۔

جناب محبوب علی اخگر نے شاگردانِ صفی کے اشعار ہم تک پہنچائے اور میں جناب اخگر کے چند شعر بطور نمونہ نذرِ قارئین کرنا چاہتا ہوں جن کے پڑھنے سے اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ کس طرح حضرت داغ، حضرت صفی اورنگ آبادی کا رنگ چھنتا ہوا جناب حامی کے ذریعہ جناب محبوب علیخان اخگر تک پہنچا ہے۔

اُدھر ہجوم ہے ساحل پہ خیر مقدم کو
اِدھر بھنور میں سفینہ ہے کیا کیا جائے

پھر دمِ بھی تو نہ چھوٹے گردشِ ایام سے
صبح سے چکر میں ہے کوئی تو کوئی شام سے

بغیر اُن کے کوئی اور بحر و بر میں نہیں
وہ ہر جگہ ہیں نمایاں مگر نظر میں نہیں

ناخدا کے ہوش گم تھے، زورِ طوفاں دیکھ کر
کس نے پہنچایا خدا جانے لبِ ساحل مجھے

چاہنے والوں میں اپنے کر لیا شامل مجھے
شکر کرتا ہوں کہ سمجھا اُس نے اس قابل مجھے

یہ تو تعِ نہیں کم حوصلہ انسانوں سے
نشانِ راہ بن کر رہ گیا ہوں
سُرخ رُو ہیں چمن کے کانٹے بھی
موت ہی پر نگاہ رکھ اخگر
تم نے اخگر کو ابھی سمجھا نہیں
دیکھ کر اخگر کو فرمانے لگے
ہم ہی بن بیٹھے راہ کا پتھر
دِل ہے کہیں، نگاہ کہیں ہے قدم کہیں
جگر تھامے ہوئے آئے وہ اخگر
نہ بُت کدہ کے ہوئے اور ہم نہ کعبہ کے
ذرّہ ہوں مگر۔ ہوں مہر پیوند
اب سوزِ جگر نہ پوچھ اخگر
خطا کو درگزر فرمانے والے
آپ کو معلوم ہے اخگر ہوں میں
جو بھی پڑ جائے گی سہاریں گے
وہ نزدیکِ رگِ جاں ہے تو خود اندازہ کر لیجئے
کیا اس سے بڑھ کے ہوگی کوئی اور بے بسی
نامحرمِ حیات کی دیوانگی نہ پوچھ!
چلے گی بات کہاں تک یہ بد مذاقی کی
قسم اللہ کی ہم چلتی پھرتی لاش بن جاتے
مری ہمت جہاں پتوار بن جاتی ہے کشتی کی
اُس کی تلاش ہو تو برابر تلاش کر
دُنیا اُڑا نہ دے کہیں قامت کا مضحکہ
سُننا اور سُن کے مسکرا دینا

حوصلہ مند ہی ٹکرائیں گے طوفانوں سے
جب سے جدا ہوا ہوں کارواں سے
ہائے کیا شئے بہار ہوتی ہے
زندگی تو اُدھار ہوتی ہے!!
کھیلنا اچھا نہیں انگار سے
آگ لگ جاتی ہے اِس کے نام سے
ورنہ تھا صاف راستا اپنا
تیری گلی سے نکلے ہیں اِس بیخودی کے ساتھ
میں شرمندہ ہوں آہوں کے اثر سے
ہمیں کہیں کا نہ رکھا تری تمنا نے
قطرہ ہوں۔ محیط آشنا ہوں
میں اپنی ہی آگ میں جلا ہوں
ادا ہو شکر تیرا کس زباں سے
دوسروں کی آگ میں جلتا نہیں
اب کسی کو نہیں پکاریں گے!!
کر اپنے ہاتھ کو قربت ہے کتنی اُسکے داماں سے
تم سے بچھڑ گیا بھی تو جینا پڑا مجھے
دُنیا میں رہ کے کہتا ہے دُنیا سے کیا ہے
مذاقِ غم کا مرے لوگ اُڑائیں گے کب تک
اگر دل میں ہمارے آپ کا ارماں نہیں ہوتا
وہاں میرے مقابل کوئی بھی طوفاں نہیں ہوتا
لیکن "تلاشِ عام" سے ہٹ کر تلاش کر
اپنا لباس قد کے برابر تلاش کر!
کیا مری بات کا جواب ہوا!

رؤف رحیم (ایم اے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اخگرؔ ــــــ محبوب علیخاں قادری

مرتب

تذکرۂ تلامذہ صفی اورنگ آبادی

"تم ہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا"

تاریخ قائم خانی موسوم بہ نام "واقعات قوم قائم خانی" مصنفہ جناب عطا محمد خاں صاحب قائم خانی [مطبوعہ ۱۹۳۱ء] کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قائم خانی خاندان کے سلسلہ کا آغاز قائم خاں سے ہوتا ہے جن کا نام مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے قائم سنگھ تھا جو ضلع حصار کے جاگیردار اور دربار شاہی میں اعلیٰ عہدہ پر تھے۔ قائم خانی خاندان کے چشم و چراغ محبوب علیخاں اخگر نبیرۂ رحمٰن خاں مرحوم رسالدار میجر تھرڈ لانسرز حیدرآباد [م ۱۷ر رمضان ۱۳۵۷ھ بعمر ۱۱۰ سال] اور پسر محمد بہادر خاں مرحوم صیغہ دار محکمہ کروڑ گیری [م ۱۳ر اگست ۱۹۷۶ء] ہیں جنھوں نے بڑی تگ و دو، انتھک محنت و کوشش اور جانفشانی سے اس تذکرہ تلامذہ صفی کی ترتیب و اشاعت کا ایک اہم علمی، ادبی، تحقیقی اور تاریخی یادگار کام انجام دیا ہے جو دکن کے لیے سرمایۂ افتخار ہونے کے باوصف ان کا یہ کارنامہ شعر و ادب کی دنیا میں ناقابل فراموش رہے گا۔

ان کے ننھیال کی موروثی جائداد دھاملا واس تعلقہ ریواڑی ضلع گڑگانوہ [قریب دہلی] میں تھی۔ وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ ان کے اسلاف خاندان رفتہ رفتہ دور آصفجاہی کی ابتداء میں حیدرآباد دکن کی طرف نکل پڑے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے۔ انھیں میں ایک بلند مرتبت شخصیت نواب محمد بدن خاں [م ۱۲ر محرم ۱۲۸۳ھ] کی تھی جو نواب ناصر الدولہ آصفجاہ رابع اور سالار جنگ اول

کے دورِ وزارت میں جمعدار افواج باقاعدہ سرکار عالی تھے۔ نواب مدن خاں
کو ان کی اعلیٰ خدمات کے صلہ میں دربار آصفی سے ۱۲۵۷ھ میں رستم دل خاں بہادر
کا خطاب عطا ہوا تھا۔ (تفصیلات کے لیے دیکھو "گلزار آصفیہ" و یادگار رتن لعل" حسن
کی دیوڑھی چوک کی گھڑیال کے جانبِ شمال محلہ چیلہ پورہ متصل شکر کوٹھہ میں واقع
تھی۔ اسی دیوڑھی میں ۵ر نومبر ۱۹۲۵ء کو محبوب علی خاں صاحب اخگر کی ولادت
ہوئی۔ آصفجاہی دور کی دیگر عمارتوں کی طرح اب یہ دیوڑھی بھی دست بُردِ زمانہ سے
معدوم ہو چکی ہے۔ ان عمارتوں کی آن بان اور پچھلی سطوت و شوکت یا تو لوگوں کے
ذہنوں میں محفوظ ہے یا تاریخ کے صفحات کی زینت! محبوب علیخاں صاحب
نے مدرسہ وسطانیہ اردو شریف اور سٹی کالج میں میٹرک تک پھر ۱۹۴۶ء میں جامعہ نظامیہ
سے منشی کا امتحان کامیاب کیا۔ ان کی شادی ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو اپنی ماموں زاد
بہن سے ہوئی۔ ابتداءً جنوری ۱۹۴۷ء میں محکمہ کروڑگیری بلدیہ بھونگیر میں ملازم ہوئے۔
تخفیف کی کلہاڑی چلی تو نومبر ۱۹۵۶ء میں ملازمت سے علحدہ کئے گئے۔ زمانے
کے سرد و گرم سہتے رہے۔ پھر ۲۵ر جنوری ۱۹۶۱ء محکمہ مال ضلع رنگاریڈی میں انجذاب
عمل میں آیا اور نائب تحصیلدار کی حیثیت سے ۱۹۸۳ء میں وظیفۂ حسنِ خدمت پر
سبکدوش ہو گئے۔ شعر گوئی کا چسکہ زمانۂ طالب علمی سے لگ چکا تھا۔ بھونگیر میں حضرت
عاجز نلگنڈوی کے شاگرد حضرت فصیح الدین مہر سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے
جب وہ راہیِ ملکِ بقا ہوئے تو میر محمد علی نقیر (تلمیذ حضرت ضامن کنتوری) سے
بغرض اصلاح رجوع ہوئے۔ ان کی استادانہ شفقت بھی زیادہ دن نہ رہ سکی اور
وہ بھی اس جہانِ فانی کو خیرباد کہہ گئے۔ محبوب علیخاں صاحب اپنے پہلے استادِ
سخن مہر کی مہر سے محروم ہوئے تو نقیر کا دامن تھام کر اپنا دامنِ سخن بھر لیا۔ سوئی
قسمت سے جب یہ دامن بھی چھوٹ گیا تو حضرت صفی اورنگ آبادی کے جانشین حضرت
غلام علی ہادی سے ۱۹۵۵ء میں شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ اب تو سونے پہ سہاگہ ہوگیا۔
حضرت ہادی مرحوم کی شاگردی نے اخگر صاحب کی شاعری کو، دو اساتذہ کے زیر
تربیت ہوتے کے باوجود، ایسا نکھارا کہ فکرِ سخن میں نئی سمت کے ساتھ کلام پر حاوی

بنادیا اور ان کی مشقِ سخن پروان چڑھنے لگی جس سے مکتب کا مخصوص اور منفرد رنگِ تغزل نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ شخصیت ہو یا شاعری، ان میں تسلسل روایت کا پرتو بھی ہوتا ہے اور ارتقاء کی تبدیلیوں کا عکس بھی۔ یہاں پہنچتے پہنچتے ان کی شاعری گُلِ نادیدہ نہ رہی بلکہ گُلِ شگفتہ بن کر رونقِ بزم اور زینتِ محفل ہوتی گئی۔ انھوں نے اپنا دامن شہرت کی طلب اور ناموری کی ہوس سے ہمیشہ بچائے رکھا۔ ان کا یہ مشغلہ اپنے ذوق کی تسکین اور ذہن کی آسودگی کے لیے ہے کسی سے دادخواہی کے لیے نہیں۔

نمونۂ کلام کے طور پر یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:-

خوشی سے ترے غم اُٹھاتا رہا — مصائب میں، میں مسکراتا رہا
عبث کیوں نہ ہو اب مری زندگی — سہارا ترے غم کا جاتا رہا
کوئی آنکھیں بچھائے یا کانٹے — ہم بدلتے ہیں راستہ اپنا
بادل سی برس رہی ہیں آنکھیں — دیدار کو میں ترس رہا ہوں
اب سوزِ جگر نہ پوچھ اخگر — میں اپنی ہی آگ میں جلا ہوں

شعر گوئی محض احساسات کی عکاسی نہیں ہوتی بلکہ احساس کو فکر کے سانچے میں خوبصورتی سے اپنے انداز میں ڈھالنا شعر کے حسن و خوبی کو ظاہر کرتی ہے۔ دیکھیے کس طرح جذبات اور افکار کی ترجمانی کی گئی ہے۔

ساتھ رہ کر بھی نظر آتا نہیں — اس کے جلوے کے لیے پردا نہیں
سامنے ہے اک پتنگے کی مثال — لَو بڑھے تو جان کی پروا نہیں
خونِ دل بہتا ہے رِس کر آنکھ سے — آخر آنسو ہے کوئی دریا نہیں
وضع کے پابند لوگوں کو نہ چھیڑ — بان جلنے پر بھی بل جاتا نہیں
آپ کو معلوم ہے اخگر ہوں میں — دوسروں کی آگ میں جلتا نہیں

اخگر صاحب کے کلام میں جذبے کی گہرائی، تڑپ، فکرِ رسا اور بندش کی چستی نہایت سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہے سلاست بیان اور روانی بھی کم نہیں۔

جو نظر دل کے پار ہوتی ہے — قابلِ اعتبار ہوتی ہے
اُس گھڑی آپ یاد آتے ہیں — زیست جب ناگوار ہوتی ہے

جاتی نہیں ہے قبر میں دولت کسی کے ساتھ — رہتے ہیں آدمی کے عمل آدمی کے ساتھ
دِل ہے کہیں، نگاہ کہیں ہے قدم کہیں — تیری گلی سے نکلے ہیں اس بےخودی کے ساتھ
باراں کے ساتھ برق کی چشمک ضرور ہے — آنسو مرے سموئیے اپنی ہنسی کے ساتھ

دِل کی حالت نامہ بر ہو جائے گی — یعنی خود اُن کو خبر ہو جائے گی
دیکھتا ہے آئینہ کیوں بار بار — تجھ کو خود تیری نظر ہو جائے گی

وہ ایک تم ہو کہ دنیا تمہاری ٹھوکر میں — وہ ایک میں جسے ٹھکرا دیا ہے دنیا نے

نظر کی چوٹ جو پڑتی ہے دِل پر — وہ ظاہر کیوں نہیں ہوتی نظر سے
یہ ممکن ہی نہیں ہے نزع کے وقت — ترا ہو کر ترے جلوہ کو ترسے

آدمیت کی شان پیدا کر — یہ ضروری ہے آدمی کے لیے
عشق کچھ دل لگی نہیں اخگرؔ — لب ترس جائیں گے ہنسی کے لیے

بیٹھنا ہے بیچ میں جب چار کے — سیکھئے آداب بھی گفتار کے
پی گیا شاید تری جھوٹی کبھی — طور ہی کچھ اور ہیں مے خوار کے
ہم تری محفل میں آئے بھی تو کیا — نقش بن کر رہ گئے دیوار کے
ضبطِ غم مشکل سے مشکل ہی سہی — سامنے روتے نہیں بیمار کے

کرم کی آس کیا دنیا جہاں سے — نگاہیں لگ گئیں جب آسماں سے
تمہارے نقشِ پا پر چلنے والے — گذر جاتے ہیں ساتوں آسماں سے

غیر پر ان کی رہی چشمِ کرم — ہم ہمیشہ مبتلائے غم رہے
پرسشِ حال اس طرح تو نہ کر — اور حالت بُری نہ ہو جائے

اک ذرا تصویر لے لوں آپ کی — یوں ہی لگ کر بیٹھئے دیوار سے
تم نے اخگر کو ابھی سمجھا نہیں — کھیلنا اچھا نہیں انگار سے

ارے توبہ! یہ آنکھیں اور آنسو — خُدا کے واسطے رو کو ہنسی کو

کون نہیں جانتا کہ غزل نام ہے تہذیبِ عشق کا، غزل نام ہے پاسِ ناموسِ

وفا کا اور غزل نام ہے کتابِ دل کی تفسیر کا؟ اِس کے دامن میں بڑی وسعت ہے اور معنوں میں بڑی گہرائی۔ کیا مذکورہ اشعار میں ان مختصر عنوانوں کی آئینہ داری نہیں ہوتی؟!

مختلف غزلوں میں لفظ "دل" کا استعمال ملاحظہ فرمایئے۔ چند اشعار یہ ہیں۔

دِل کی قیمت ہی کیا ہے دنیا میں
جب کوئی دِل رُبا نہیں ہوتا

دِل کو ملتا نہیں سکون اخگرؔ
درد جب تک سوا نہیں ہوتا

بھروسہ تھا جس دِل پہ اخگرؔ مجھے
وہی میرے پہلو سے جاتا رہا

خوش رہے دِل یا رہینِ غم رہے
دم بھر یاد آگئے تیرا جب تک دم رہے

کیسے ہو اخگرؔ سکونِ دِل نصیب
جب نظامِ زندگی برہم رہے

انبساطِ دل کی بھی کوئی سبیل
مطمئن ہے آنکھ تو دیدار سے

دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے
بے مزہ زندگی نہ ہو جائے

مقامِ دل بھی کیا مرکز ہے اخگرؔ
کئی رستے نکلتے ہیں یہاں سے

اُوپر کے اشعار غزل کے تسلسل میں اپنے لُطف و معنیٰ کو اور بھی دلکش بنادیتے ہیں۔ بعض غزلیں تو اپنے مکتب کے چراغ کو روشن کی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

منقبت کے حسبِ ذیل اشعار بھی اپنا مخصوص رنگ لیے ہوئے ہیں۔

کوئی کیا جانے حقیقت غوثؒ کی
دو جہاں پر ہے حکومت غوثؒ کی

دین و دُنیا میں وہ ہوگا سرفراز
جس کے دل میں ہو محبت غوثؒ کی

بس ہے اخگرؔ دونوں عالم میں تجھے
آستانِ عارفؒ کا، نسبت غوثؒ کی

شانِ ربّ العلا غریب نواز
نورِ خیر الورا غریب نواز

سترِ باطن ہے، گنجِ مخفی ہے
تیرا قلبِ صفا غریب نواز

پاس اپنے بلا کے اخگرؔ کو
اس کی حسرت مٹا غریب نواز

اخگرؔ صاحب اور ان کی شاعری کا سرسری تعارف ہونے کے بعد اب اس کلام کی شیرازہ بندی کی سرگذشت سپردِ قلم ہے۔

۱۹۵۱ء میں "بزم تلامذہ صفی" کا قیام عمل میں آیا جس کے سرپرست حضرت صفی اورنگ آبادی تھے اور میر بہادر علی جوہر صدر بزم۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں تنظیم جدید کے ساتھ باضابطہ دستور العمل مرتب کیا گیا اور استاد محترم حضرت صفی کی زیر سرپرستی ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۳ء کو بزم سے دستور العمل کی باقاعدہ توثیق ہوئی۔ اس کے بعد جناب محبوب علی خاں اخگر ۱۹۵۶ء میں تیسرے اور آخری معتمد "بزم تلامذہ صفی" نامزد کیے گئے۔ پہلے معتمد سعید اختر تھے ان کے بعد جناب محمد عبدالوحید یکتا۔ ۱۹۵ میں جناب اخگر صاحب نے معتمد کی حیثیت سے بزم تلامذہ صفی کے رکن شاگردوں کا تذکرہ مع تصاویر حمیدالدین شاہد صاحب کے حوالے کیا جو انھیں حیدرآباد دکن کے شاعروں کے تذکرے "شیرازۂ پریشاں" کے لیے مطلوب تھا۔ شاہد صاحب کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے تین دہے بیت چکے لیکن اس کی اشاعت نہ یہاں ہو سکی اور نہ کراچی میں شائع کروانے کی کوئی اطلاع ملی۔ طویل عرصہ تک سخت مایوسی چھائی رہی۔ لیکن اس تذکرہ کو نظر ثانی کے بعد از سر نو ترتیب دے کر شائع کرنے کا خیال اخگر صاحب کے ذہن میں اکثر کلبلاتے رہتا۔ نہ انھیں فراغت ہی حاصل تھی اور نہ ذہنی راحت! کسی کام کی انجام دہی کے لیے دونوں باتیں ضروری ہوتی ہیں۔ فراغت بھی ملے اور راحت بھی نصیب ہو تو کام کی لگن کے بغیر کوئی تخلیق یا تحقیق وجود میں نہیں آسکتی۔ اخگر صاحب کو دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ ان کی شادی کی ذمہ داریوں سے سبکبار ہوئے۔ ملازمت سے چھٹکارا ملا تو رفیق حیات طویل علالت کے بعد داغ مفارقت دے گئیں۔ حالات کی ستم ظریفی میں صبر و شکر سے کام لیا۔ تذکرہ کی طباعت کی دیرینہ فکر نے جو دل و دماغ میں برسوں سے پرورش پا رہی تھی، پچھلے سال اِن کے ذہن کو جھنجھوڑا۔ خیال کو مہمیز ہوئی، ارادہ عمل کے سانچے میں ڈھلنے لگا۔ شاید انھیں میر کا یہ شعر یاد آیا ہو۔

بارے دنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو
کر کے کچھ ایسا چلو یاں کہ بہت یاد رہو

صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں اور راہبرِ طریقت بھی۔ تنزیل کی آیت فَاِذَا عَزَمْتَ

فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ط الخ (آل عمران ۔ ت ۱۵۹] اچھی طرح پڑھی بھی ہے
اور سمجھی بھی۔ اس کام کا مصمم ارادہ کر کے اللہ پر توکل کیا۔ نصرت الٰہی سایہ فگن
ہوئی۔ [۱۵۷] تلامذۂ صفی کے منجملہ [۸] کے بارے میں معلومات جمع کرنے
میں ان کی کوشش کامیاب رہی جس کے لیے ان کی سعی پیہم اور جہدِ مسلسل لائق ستائش
اور قابلِ تحسین و مبارکباد ہے۔

دل میں اُمنگ اور رُوح میں ترنگ رکھنے والے دُھن کے پکّے اور لگن
کے سچّے شاعر محبوب کو اپنے استادِ سخن حضرت ہادی کے استاد بھائیوں کے
حالات، نمونہ کلام اور تصویریں حاصل کرنے کے لیے کہیں سے حوصلہ افزائی ہوئی
تو کہیں سے دل شکنی کے تلخ تجربات سے واسطہ پڑا۔ ان کا یہ کام اتنا آسان تو
نہ تھا کہ کتب خانوں میں بیٹھے متعلقہ کتابوں سے مواد اکٹھا کیا ترتیب دی اور
کتاب مرتب۔ اگرچہ کہ اس میں بھی محنتِ دماغی اور عرق ریزی کی ضرورت ہوتی
ہے لیکن انھوں نے جسمانی مشقت بھی جھیلی، ذاتی روپیہ صرف کیا اور وقت
اور توانائی کو اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ دَر دَر گھوم کر دستکیں دیں، گھر گھر
پھر کر گھنٹیاں بجائیں، کواڑ ہلائے، قبرستانوں کے بار بار چکر کاٹے۔ کہیں کہیں تو ایک
بات کا پتہ لگانے، تاریخیں معلوم کرنے یا تصویریں حاصل کرنے کی غرض سے
تین تین چار چار چکر کاٹنے پڑے۔ موجود شاعروں یا مرحوم شاعروں کے بعض
متعلقین سے ربط قائم کیا تو جذبِ دل اور پاسِ وفا کا احساس ہوا۔ معلومات
کے لیے کوئی دِقت نہیں ہوئی۔ لیکن اس صبر آزما اور دل سوز مہم میں دریافت کنندہ
کا بھیس بدلا تو تماشائے اہلِ کرم بھی دیکھے! کسی کے درِ دولت سے رُکھائی کے
ساتھ بڑھا دیئے گئے تو کسی نے اپنے عشرت کدہ کے دروازہ بند کر لیے۔ نہ
اُن سے دھن دولت پوچھی تھی نہ زر و مال؟ خوش اخلاقی کے دو بول کا ادا
کرنا بھی دوبھر؟! صرف نام پوچھا گیا تھا یا پتہ۔ کسی سے تصویر طلب کی گئی
تھی یا تاریخ انتقال کی دریافت۔ ایک سپوت سے والد کے انتقال کی تاریخ
کے مشتاق ہوئے تو انھوں نے اپنے گھر کے چھ پھیرے کروائے اور ہر بار

نیا بہانہ ہر دفعہ نیا عذر! ایک نواب صاحب کا رہائشی پتہ معلوم کرنے کیلئے
اختر صاحب نیک اختر کی ڈیوڑھی پر پہنچے تو ایسی جلی کٹی سننی پڑی کہ کانوں
پر ہاتھ رکھ کر لوٹ گئے۔ دل کو بہت رنج ہوا۔ افسردگی نے شکستہ خاطر
کردیا۔ قارئین اکرام چشم تصور سے اندازہ کریں تو معلوم ہوگا کہ کتنی جگر کاوی
کے بعد یہ کام حد کمال کو پہنچا ہے۔ کیا کیا ستم سہے اس نے اک آرزو بر
آنے تک! اس کے باوجود اختر صاحب اپنے تمام معاونین کے قدر داں
نظر آتے ہیں لیکن کسی کی بے مہری کے شکوہ سنج نہیں! انھوں نے یہ تذکرہ مرتب
کرکے فرض کفایہ ادا کیا ہے ورنہ ماضی کی یہ یادیں، دھندلائی تصویریں اور
بھولی بسری دکن کی معروف شخصیتیں زمانے کی گرد تلے دب کر رہ جاتیں۔ پھر
کون انھیں کھوج نکالتا اور زندگی کے بکھرے اوراق سمیٹتا!

حیدرآباد کی تاریخ کے حالیہ آگ و خون کے ہولناک فسادات اور
قتل و غارت گری کے مجنونانہ تباہ کن واقعات (جب کہ یہ شہر بھاگیہ نگر کرفیو
نگر بن گیا تھا) کے دوران ان کے کام کرنے کا جذبہ سرد نہیں ہوا بلکہ انھوں
نے کرفیو کی چھوٹ کے وقفے میں بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ بہرحال اختر
صاحب نے اپنی آتش شوق کو ٹھنڈی ہونے نہیں دیا۔

تباہی کے ذکر کے ساتھ خوب یاد آیا اگر یہاں ایک اور حادثہ یا ادبی المیہ
کی طرف توجہ دلاؤں تو بے جا نہ ہوگا بلکہ بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت
حادی مرحوم کے دیوان کے تلف ہونے کی مختصر روئداد بھی قلمبند کردوں جو اختر
صاحب کے دید و دریافت کی کڑی کا ایک سلسلہ ہے۔ "شیرازہ پریشاں" کے
لیے حضرت حادی کے منتخب اشعار جو شاہد صاحب کے حوالے کئے گئے تھے ان
کی نقلیں تو شاگرد رشید اختر صاحب کے ہاں محفوظ تھیں۔ انھوں نے مزید انتخاب
کلام کے لیے محمد یحییٰ خالد (فرزند حضرت حادی حال مقیم کناڈا (ٹورنٹو)) سے ربط
قائم کیا تو انھوں نے خط کے ذریعہ مطلع کیا کہ وہ اپنے والد کا دیوان اپنے ہم زلف
کے گھر میں (واقع درگاہ کلی والے شاہ دبیر پورہ) کتابت کروا کر مرحوم معلم

بسم اللہ

مُرتب کے نام!

مکرمی - السلام علیکم!

ایک ایسے وقت میں جبکہ دیس کا کونہ کونہ آگ، خون، قتل و غارت گری سے معمور ہے، شعر و شاعری، ادب و ادیب کے بارے میں لکھنا پڑھنا سوچنا ایک ایسی انفرادیت ہے جو کم ہی لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ بہرحال وقت، محنت، دولت و صلاحیت کو داؤ پر لگا کر آپ نے ادب و شعر کی محفل سجائی اور بہت سے بھولے بسرے شاعروں کی یاد تازہ کردی، یہ کام دنیائے ادب اور خصوصاً حیدرآباد کے مکتبِ صفی کی دنیا میں ایک مینار کی حیثیت کا حامل ہے۔ اپنے آپ عاید کردہ ایک فریضہ سے بہرحال آپنے سبکدوشی حاصل کرلی۔! **فھوالمراد**

کتاب کا صرف ایک نسخہ بھی حاصل ہو جائے تو باعثِ ممنونیت ہوگا۔ اُمید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ خُدا حافظ

سیّد عبدالحفیظ محفوظ
بشیر باغ حیدرآباد

۶ر نومبر ۱۹۹۰ء

مکرمی جناب اخگر صاحب - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں نے چند غزلیں نقل کر کے حضرت وقار صاحب مدظلہ کے پاس بھجوا دی ہیں۔ آپ براہِ کرم حضرت سے مل کر منتخبہ اشعار اور غزل حاصل فرمائیے۔ آپ کی فرمائش کی ہوئی غزل بھی نقل کر کے بھیجی گئی ہے۔

"میں عجلت میں تھا اس لیے آپ سے تفصیلی گفتگو نہیں ہو سکی۔ آپ نے ایک مشکل کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اللہ آپ کے لیے آسان کر دے۔"

صفی اللہ
اسسٹنٹ انجینئر
اے پی

۱۳-۱۰-۹۰ء

عبیدی (مالک انجمن فیض المسلمین) کے ہاں اصل دیوان کے ساتھ امانتاً رکھوا دیئے تھے تاکہ مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد اس کی اشاعت کا انتظام کیا جا سکے لیکن اس کے بعد ہی وہ کناڈا چلے گئے اور کام معرض التواء میں پڑ گیا۔ (اس دوران معلّم کا انتقال ہوگیا) خط کے حوالے سے ان کے بیٹوں سے حاصل کرنے کی خواہش کی لیکن جب اخگر صاحب نے بیٹوں سے طلب کیا تو انھوں نے تحریراً لکھ دیا کہ حضرت حاوی مرحوم کا دیوان ان کے ہاں نہیں ہے۔ گویا ان لوگوں نے اس انمول ادبی سرمایہ کو نہ صرف کفن پہنا دیا بلکہ دفن بھی کر دیا۔ اس غمناک حادثہ کی اطلاع عزیزی محمد یحییٰ خالد کو ذریعہ خط دی جا چکی ہے۔ اس المیہ پہ جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔ اس طرح یہ دیوانِ حاوی غفلت شعاروں کے ہاتوں ہمیشہ کے لیے تلف و نابود ہوگیا۔ افسوس صد افسوس!

محترم اخگر صاحب کی اس کوشش میں ہو سکتا ہے کہ کسی کی زندگی سے متعلق اہم باتیں ترک ہوگئی ہوں یا اپنے اپنے ذوق کے اعتبار سے نمونہ کلام کے منتخب اشعار ان کے حسبِ دلخواہ نہ ہوں تو عرض خدمت ہے کہ جو جزئی یا کلّی معلومات ممکنہ ذرائع اور امکانی وسائل سے حاصل ہوئے ہیں اس کو اپنے لحاظ سے سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ کہیں کوتاہی نظر آئے یا صحتِ طباعت میں چوک معلوم ہو تو کام کی اہمیت اور افادیت کو ملحوظ رکھ کر چشم پوشی فرمائیں۔ کام کی تکمیل، جمع و ترتیب میں راہیں بڑی دشوار تھیں لیکن ان کے عزمِ محکم اور جوشِ عمل نے اسے آسان بنا لیا۔ اس ناچیز طالب علم کی محدود معلومات میں شاید ہی کوئی ایسا تذکرہ مرتب کیا گیا ہو جس میں ایک ہی مکتبِ سخن کے اتنے کثیر شاگردوں کا ذکر بہ یک وقت پایا جائے جس کے لیے سرزمینِ دکن جو صدیوں سے علوم و فنون کا گہوارہ رہی ہے جتنا بھی ناز کرے کم ہے! دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کتاب کو شرفِ قبولیت سے نوازے!!

پتہ:- ۱۲-۳-۸۳۵/۱/۲
روبرو آندھرا بینک، مہدی پٹنم حیدرآباد

غبارِ کاروانِ ادب
خواجہ معین الدین عزمی

ہیں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ قطب شاہی بادشاہوں کے زوال کے ٹھیک اٹھالیس سال بعد ہی سرزمینِ دکن میں آصف جاہی خاندان کا نیرِ اقبال طلوع ہوا۔ جیسا کہ حیدر آباد ہمیشہ بیرونی اور اندرونی اقوام اور اصحابِ سیف و قلم کے لیے باعثِ کشش رہا اور یہاں کے فرمانرواؤں نے عالموں، ادیبوں شاعروں اور دیگر فن کاروں کی فیاضانہ سرپرستی کی۔ چناں چہ حضرت غفران مکاں آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں کے فرمانِ خسروی پر نواب میرزا خاں داغؔ دہلوی (م ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ) تلمیذ خاقانی ہند استاد شیخ ابراہیم ذوقؔ دہلوی ۱۳۰۸ھ میں حیدر آباد پہنچے اور استادِ شاہ مقرر ہوئے اور یہیں پیوند خاک ہو گئے۔ دکن کی اس خاک وطن نے ہزاروں شاعر پیدا کئے جن میں مختلف مکاتیبِ فکر کے نامور اساتذۂ سخن اُبھرے اور اُنھوں نے چمنستانِ شاعری کو سدا بہار بنا دیا۔ مکتبِ داغؔ دہلوی کی آخری شمع حضرت صفیؔ اورنگ آبادی تھے۔ اسی دبستان صفیؔ کے تلامذہ نے اپنے فکر و فن اور امتیازی رنگِ تغزل کے ایسے ایسے گلہائے رنگا رنگ کھلائے ہیں کہ جن کی خوشبو سے دکن کی سرزمین معطر ہے۔

اب سے کوئی سوا تین دہے پہلے کی بات ہے کہ جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہدؔ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدر آباد سے وابستہ تھے۔ اُنھوں نے ۱۹۵۷ء کے اخبارات میں ایک اعلان شائع کروایا تھا کہ وہ حیدر آباد کے جملہ شعراء کا ایک تذکرہ "شیرازۂ پریشاں" کے نام سے شائع کرنا چاہتے ہیں اور خواہش کی کہ تمام شعرائے اکرام اپنے حالاتِ زندگی، تصویریں اور نمونۂ کلام ان کے پتے پر روانہ کریں۔ راقم نے بحیثیت معتمد "بزم تلامذۂ صفیؔ" اورنگ آبادی تمام شاگرد ارکان کا تذکرہ مع حالات، تصویریں اور نمونۂ کلام جمع کر کے جناب میر بہادر علی صاحب جوہرؔ، سید غوث صاحب یقینؔ اور میر سرفراز علی صاحب ناوکؔ ارکانِ عاملہ کے ہمراہ جناب حمید الدین شاہدؔ صاحب کے مکان واقع آغا پورہ پہنچ کر ان کے حوالے کیا اور رسید حاصل کی۔ کچھ عرصہ بعد شاہدؔ صاحب ہماری اس پونجی کے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخن ہائے گفتنی

بیسویں صدی کے نصفِ اول کی تاریخ دکن پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اِن کے اوراق عروج و زوال کے واقعات سے مزیّن ہیں۔ جن میں رودِ موسیٰ کی تباہ کن طغیانی [۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء]، رعایا کے ہر دلعزیز اور فقیر منش بادشاہ نواب میر محبوب علی خان کا انتقال اور ان کے جانشین نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کی تخت نشینی [۱۹۱۱ء]، مادرِ علمی جامعہ عثمانیہ کی عہد ساز تاسیس [۱۹۱۸ء]، مختلف علوم و فنون کے ماہرین اور بیرونی شعراء کی آمد، سلاطین آصفیہ کا ترقیاتی زرّین عہدِ عثمانی، چیچک اور طاعون جیسے مہلک امراض کی وبائیں، ہندوستان کی جدوجہد آزادی اور دو عالم گیر جنگوں کے اثرات، درباری سازشیں، رضاکار تحریک، پولیس ایکشن، دو سو سال سے زیادہ [۱۷۲۳ء تا ۱۹۴۸ء] کے آصف جاہی دورِ اقتدار کا خاتمہ اور سقوطِ حیدرآباد شامل ہیں۔

یہ وہ پس منظر تھا جس کے مذکورہ مختصر عنوانات اِسی شہرِ نگاراں حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے تاریخی ابواب کی جانب اشارہ کرتے ہیں جس کی بنیاد ایک حسن پرست، عاشق مزاج بادشاہ محمد قلی قطب شاہ نے رکھی تھی جو ایک عظیم المرتبت شاعر بھی تھا۔ اسی لیے اس کی مٹی میں شعر و شاعری کی خوشبو بسی ہے۔ مخفی مبادکہ قطب شاہی عہد [۹۰۱ھ تا ۱۰۹۸ھ] عالمی شہرت یافتہ تاریخی عمارتوں کی تعمیر کے علاوہ علم و فن اور شعر و ادب کی ترویج و ترقی

ساتھ پاکستان منتقل ہوگئے اور تذکرہ "شیرازۂ پریشاں" کی اشاعت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا معلوم نہیں کہ یہ شیرازہ بکھر گیا یا محفوظ ہے۔ میں اپنی ملازمت کے تبادلوں کی وجہ سے بلدہ سے باہر رہنے لگا۔ وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۸۴ء سے جولائی ۱۹۸۹ء یعنی اپنی اہلیہ کے انتقال تک تیمارداری میں مصروف رہا۔ غمِ امروز سے نجات ملتی تو فکرِ فردا کرتا۔ اس لیے اس کام کی طرف توجہ نہ کر سکا۔ اوائل ۱۹۹۰ء میں پچھلے خیال نے انگڑائی لی کہ ربع صدی بیت گئی۔ تذکرہ منظرِ عام پر آنے کی بجائے پاکستان ہجرت کر گیا۔ کیوں نہ اس کی دوبارہ ترتیب اور اشاعت کی کوئی صورت نکالی جائے۔ ذہن میں دبی اس چنگاری کو میں نے ہوا دینا شروع کیا۔ طلسم خیال ٹوٹا اور اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سعدی علیہ الرحمہ کا یہ شعر میرے ذہن میں ابھر آیا۔

خبرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

اور میں سعیٔ پیہم میں لگ گیا۔ ابتداءً میرا ارادہ اس حد تک محدود رہا کہ "بزمِ تلامذہ صفی" کے انہی ارکان کا تذکرہ ترتیب دوں جنھیں میں نے اکٹھا کر رکھا تھا کیوں کہ میرے پاس شاہد صاحب کے دیئے ہوئے تذکرہ کے مسودات ۱۹۵۷ء سے تا حال محفوظ تھے۔ اس میں "ادبستان صفی" سے وابستہ ارکان شامل نہیں تھے۔ اگر اسی پر اکتفا کرتا تو تلامذہ صفی کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوتی اور مجھ پر تنگ نظری کا الزام آتا۔ میں نے کشادہ ذہنی اور فراخ دلی سے غور کیا کہ نظری اور جماعتی اختلاف کی بناء پر یہ تمام حضرات صفی مرحوم کے تلامذہ کی فہرست سے تو علاحدہ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے اس تذکرہ کو وسعت دے کر مرتب کرنے کے لیے سبھی شاگردوں کو شامل کرنے کا بڑا اٹھایا اور ان کے بارے میں معلومات کے لیے دید و دریافت شروع کر دی۔ اس طرح اس سلکِ گہر کے بکھرے موتی ڈھونڈ نکالنے کی ٹھان لی۔

واضح ہو کہ اس "بزمِ تلامذہ صفی" کا قیام ۱۹۵۱ء میں عمل میں آیا جس کے سرپرست حضرت بہبود علی صفی اورنگ آبادی، میر بہادر علی جوہر صدرِ بزم اور سعید اختر بی اے (عثمانیہ) معتمد بزم تھے۔ استادِ سخن حضرت صفی اورنگ آبادی کی ۱۹۵۴ء میں رحلت کے بعد "بزمِ تلامذہ صفی" کی جانب سے بہ اتفاق آراء استادی حضرت غلام علی حادی کو جانشین منتخب کیا گیا تھا لیکن بیشتر شعراء کی استاد برادری نے اپنے انتشارِ ذہنی اور آپسی شاعرانہ چشمک کی وجہ سے بزم سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی علاحدہ انجمن آرائی کے لیے ڈاکٹر حفیظ قتیل کی زیرِ صدارت "ادارۂ ادبستانِ صفی" کی بنا ڈالی اور حضرت صفی مرحوم کے ایک استاد بھائی اور شاگرد جناب عبدالحمید خان خیالی کو جانشین نامزد کیا۔ میں نے ۱۹۵۵ء میں حضرت حادی مرحوم سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

برسبیلِ تذکرہ اس بات کا ذکر کردوں تو بے محل نہ ہوگا کہ ۱۹۵۶ء میں ریاست کی لسانی بنیادوں پر تقسیم کے نتیجے میں جناب سعید اختر کا تبادلہ ہوگیا۔ ان کے لیے حیدرآباد چھوڑنا ضروری ہوگیا۔ اس کے بعد وہ ۱۹۵۸ء میں وفات پا گئے۔ ان کے انتقال کے بعد جناب عبدالوحید یکتا مرحوم "بزمِ تلامذہ صفی" کے معتمد بنے لیکن وہ بھی اپنی نجی اور سرکاری مصروفیات کی وجہ سے چند مہینوں سے زیادہ کارگزار نہ رہ سکے اور انھوں نے اپنی معتمدی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس لیے جناب میر بہادر علی جوہر نے "بزمِ تلامذہ صفی" کی معتمدی کے فرائض ارکان کی اتفاقِ رائے سے خاکسار کے تفویض فرمائے۔ پھر اس بزم کی نشاۃ ثانیہ نہ ہوسکی۔

حضرت حادی مرحوم کی شاگردی میں داخل ہونے کے بعد سے اس تذکرہ کی تیاری کے آغاز تک میں نے "ادبستانِ صفی" سے وابستہ کسی بھی رکن شاگرد سے ملنا تک گوارا نہ کیا لیکن اب اس کام کے لیے ہر ایک سے رشتہ استوار کرنا ضروری ہوگیا۔ اب کیا تھا؟ سڑک سڑک، محلہ محلہ، کوچہ کوچہ تلاش و جستجو میں گھومنے لگا۔ بعض بعض گھروں پر دو دو چار چار مرتبہ چکر یوں کاٹنی

پڑیں۔ بڑی مشقتیں اُٹھائیں، صعوبتیں جھیلیں۔ شعراء برادری اور مرحومین کے متعلقین کے اثباتی رویے اور حسنِ معلومات نے میرا حوصلہ پست ہونے نہ دیا۔ اسکوٹر چلاتے چلاتے تھک جاتا تھا لیکن کہیں سے کوئی نئی بات معلوم ہوتی تو تھکن کا احساس کم ہوجاتا۔ اس حصولِ مقصد کے لیے مجھے جن دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اُن مراحل کو ضبطِ تحریر میں لاؤں تو ایک علاحدہ سبق آموز دلگداز داستانِ کوہ کنی مرتب ہوجائے۔

جناب خواجہ شوق نے حضرت صفی مرحوم کی مرتبہ فہرستِ تلامذہ جو ایک سو ستاون (۱۵۷) شاگردوں کے نام پر مشتمل ہے ۸ر جولائی ۱۹۹۰ء کے اخبار "منصف" میں شائع کروائی تھی۔ اس کی اشاعت سے پہلے انھوں نے اس فہرست کی عکسی نقل میرے حوالے کی تھی۔ اس فہرست کی بموجب حضرت صفی کے حینِ حیات چوبیس (۲۴) شاگردوں کا انتقال ہوچکا تھا جس کو حضرت نے اپنے قلم سے مرحوم لکھا تھا۔ ایک سو بارہ (۱۱۲) شاگردوں نے استادِ محترم حضرت صفی کے انتقال کے بعد اس دارِ فانی کو خیرباد کہا۔ باقیات الصالحات میں تادمِ تحریر جو شاگرد بقیدِ حیات ہیں ان سے فرداً فرداً اور مرحومین کے ورثاء کا پتہ چلا کر ان تمام سے احوال و واقعات، تاریخ پیدائش و وفات، مقامِ تدفین، تصویریں اور ان کے نمونہ کلام حاصل کیے گئے۔ بعض کے تاریخ انتقال معلوم کرنے کے لیے اِن کے قبروں کی زیارت کرنی پڑی۔ اس طرح فاتحہ خوانی کا ثواب بھی مِلا۔ میری اس عِلمی اور ادبی کاوش میں بقیدِ حیات شعراء اور شعرائے مرحومین کے عزیز و اقارب کا اگر تعاون حاصل نہ ہوتا تو یہ گراں قدر اور وقیع کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ان سب کی عنایات اور کرم گستری کا میں بہت ممنون ہوں۔

الحمدللہ میں نے (۱۵۷) کے منجملہ ( ) تلامذۂ صفی کا تذکرہ حتی الوسع اپنے مقدور بھر امکانی وسائل کے ذریعہ تحقیق و تدقیق اور معتبر روایات کے مطابق یکجا کرکے ایک ادبی دستاویز کی شکل دینے کی حقیر کوشش کی ہے۔ مابقی شاگردوں کے بارے میں تغیراتِ زمانہ کی وجہ سے تلاشِ بسیار کے باوجود کوئی سراغ نہ

مِل اسکا۔ لہٰذا اتنی ہی تلامذہ کی تعداد پر کام ختم کرنا ازبس ضروری تھا۔ حضرت صفیؔ کے شاگردوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ، کھاتے پیتے، مرنجان مرنج، سود و زیاں سے بے نیاز، مرفہ الحال بھی تھے اور بعض کم تعلیم یافتہ مگر ذوقِ شعری سے متصف، کثیر العیال جز معاش بھی! بہتوں کی زندگی تلاطم خیز، صبر آزما، دکھوں اور مصیبتوں کا شکار بھی لیکن اس پژمردہ زندگی (جس کا اظہار بھی ہونے نہ دیا) کے باوجود ان کے کلام میں درد و غم کی کسک کے ساتھ شگفتگی اور شادابی نمایاں نظر آتی ہے۔ اس تذکرہ میں جہاں وقت کے دھندلکوں میں گم شدہ یا فراموش کردہ ماضی بعید کے شعرائے کرام کے نام اور نمونۂ کلام ملیں گے تو وہیں ماضی قریب کے ذہنوں میں محفوظ بچھڑے ہوئے مرحوم شاعروں کے حالات اور شاعری کی جھلکیاں بھی دکھائی دیں گی۔ اس کے علاوہ خُم خانۂ صفیؔ اورنگ آبادی کے موجودہ علمبردار شاعروں کے ذِکر و فِکر سے بھی روشناسی ہوگی جن کے بغیر شعر و سخن کی محفلیں اور کل ہند مشاعرے سونے معلوم ہوتے ہیں۔ احیاناً اس پیشکش میں کچھ فروگزاشتیں سرزد ہوئی ہوں تو احقر کی لغزش و کوتاہی تصوّر کر کے درگزر فرمائیں۔ وقت کے اس بکھرتے دور میں اور تہذیبی قدروں کے بدلتے حالات میں جب کہ ع "ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی" ہے یہ کتاب اردو والوں، اَدب و سُخن کے قدر دانوں اور اہلِ ذوق کی نذر کرتا ہوں۔ اگر اس کو مفید اور معلومات آفریں خیال فرمائیں تو سمجھوں گا کہ ایک سال تک گھر گھر، قبرستان قبرستان پھر کر مواد اکٹھا کر کے مرتب کرنے کی محنت ٹھکانے لگی۔

آخر میں میں اپنے مخلص احباب جناب روحی قادری، نظیر علی عدیلؔ، جابر بن ثنا، خواجہ شوقؔ، ضیاء فاروقی، ڈاکٹر غیاث صدیقی، غفار ماجدؔ، راغب فاروقی اور رؤف رحیم صاحبان کا دِلی شکریہ ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو اس کام میں ہر طرح سے ممد و معاون رہے اور معلومات کی فراہمی میں نہ صرف میری رہبری فرمائی بلکہ اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ ناسپاس گزاری ہوگی اگر میں جناب محمد نور الدین خان صاحب کا ذکرِ خیر نہ کروں جنھوں نے آغاز کار ہی سے میری

پُرخلوص حوصلہ افزائی فرمائی۔ میں جناب معین الدین عزمی صاحب کا بھی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر قدمے، سخنے، قلمے میرا تعاون فرمایا!
میرا دینی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ میں اپنے فرزند محمد جعفر علی خان صاحب فہیم اور دامادوں جناب مختار احمد خاں صاحب (مالک خان انٹرپرائزس پُرانی حویلی) اور میر اقبال علی صاحب کا تحسین کے ساتھ ذکر کروں جن کے مالی تعاون کے بغیر اس کتاب کو زیور طبع سے آراستہ کرنا ایک امر محال تھا۔ اللہ ان کی علمی قدردانی اور ادب دوستی کے لیے انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ ان کے علاوہ جناب محمد عبدالرؤف صاحب خوشنویس جنھوں نے حسبِ وعدہ پابندیٔ وقت کے ساتھ اس تذکرہ کی کتابت کی، جناب سلام خوشنویس اور سعادت علیخان آرٹسٹ نے اپنے نوکِ قلم سے اِس کے سرورق کو سنوارا اور طباعت کے لیے دائرہ پریس چھتہ بازار بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

بہرحال مکتبِ صفیؔ اورنگ آبادی کے سخنورانِ دکن کا یہ مرقع ہدیۂ ناظرین ہے۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

مرتبہ:

محبوب علیخاں اخگر (قادری)
تلمیذ
حضرت غلام علی حاوی مرحوم

پتہ:
"نصیب منش" ۲/ ۱۷/ ۲۶۲ـ۳ـ۱۹
محلہ جہاں نما حیدرآباد ۵۰۰۲۵۳

سعید اختر ــــــ عبدالکریم

تاریخ وفات ۱۹۵۸ء

جناب سعید اختر مرحوم حیدرآباد کے متوطن تھے۔ محلہ کاچی گوڑہ میں اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے کامیاب کرنے کے بعد فوڈ کارپوریشن آف انڈیا میں ملازمت اختیار کی۔ یہ نہایت خوبرو اور وضع دار شخصیت کے حامل تھے۔

ذوقِ شعری زمانہ طالب علمی سے تھا۔ نثر نگاری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ اصنافِ سخن میں غزل کی طرف میلان طبع زیادہ تھا۔ شعر سلجھے ہوئے اور پُر اثر کہتے تھے جذبات کی رنگ آمیزی اور زبان کی سادگی تزئینِ شعر ہوتی تھی۔ مکتب صفی کے جوان فکر شاعر و معتمد بزم تلامذہ تھے حضرت صفی کے دورِ آخر کے تلامذہ میں سے ہیں۔ ملازمت کے دوران جب ۱۹۵۶ء میں اسٹیٹ آرگنائزیشن ہوا تو ان کو مہاراشٹرا کو الاٹ کیا گیا اور مستقر بمبئی پر تعنیاتی عمل میں آئی۔ جہاں صرف دو سال کارگزار رہنے کے بعد جوان العمری میں ۱۹۵۸ء میں انتقال ہوگیا۔ تدفین البتہ حیدرآباد میں کاچی گوڑہ کے قبرستان میں عمل میں آئی۔

نمونہ کلام کے طور پر جتنے اشعار دستیاب ہوسکے ہیں وہ پیش ہیں ؎

اک سکون حیات سے ہٹ کر
ہر طرح سے گزر گئی اپنی !!

گرے آنسو جو میری چشم تر سے
فسانے بن گئے وہ مختصر سے

یا فریبِ نظر ابھی تک ہے
یا قریب آگیا ہوں منزل کے

کوئی دن اور ضبطِ غم اگر صبر آزما ہوگا
کلیجہ میرا بس دامن پہ دیکھو آپڑا ہوگا

ترے نقشِ قدم کا جس جبیں کو آسرا ہوگا
قیامت میں خدا جانے جو اُس کا مرتبا ہوگا

سرِ محشر جو اُن کا اور میرا سامنا ہوگا
تو بس، میں کہہ نہیں سکتا کہ میرا حشر کیا ہوگا

ہزاروں منزلوں میں ایک منزل یوں بھی آئے گی
کہ تجھ میں اور مجھ میں اک نفس کا فاصلہ ہوگا

گراں تر ہے غمِ ہستی، مگر تیری محبت میں
جسے مل جائے تیرا غم، اُسے غم اور کیا ہوگا

وہ محفل سے اُٹھا کر یوں کے یوں اُن جا رہے کہتے ہیں
کوئی پاگل، کوئی دیوانہ، کوئی سر پھرا ہوگا

تجھے مانگوں، اگر تجھ سے کبھی کچھ مانگنا چاہوں
نہیں تو عمر بھر تشنہ ہی ذوقِ مدعا ہوگا

محبت میں بلا سے جان بھی جائے تو کیا اختر
مری وابستہ دامانی کا کچھ تو حق ادا ہوگا

صفی اور داغ

صفی

پھر اُس نے وعدہ کیا، ہم نے انتظار کیا
زباں پہ نہیں، صورت پہ اعتبار کیا

داغ

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا!

صفی

غضب ہوتا ہے چھو لینا بھی ان کو گاہے گاہے کا
حواسِ خمسہ بن جاتی ہیں پانچوں انگلیاں میری

داغ

جب اپنا ہاتھ رکھا سینۂ پُر داغ پر میں نے
بنی ہیں پنج شاخہ جل کے پانچوں انگلیاں میری

صفی

دوست نے وعدہ کیا ہے دوستو!
آج میرے جاگنے کی رات ہے

داغ

شب کو جاگیں بزم میں، وہ دن کو سوئیں
رات کا دن، اور دن کی رات ہے

صفی اور غالب

صفی

آیا کبھی نہ خواب میں بھی غیر کا خیال
غفلت میں بھی میں آپ سے غافل نہیں رہا

غالب

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ارادت ____ صاحبزادہ میر ارادت علیخان (ارادت جہاندار جاہی)

تاریخ پیدائش انداذاً ۱۴ ء ۱۹

صاحبزادہ میر ارادت علی خان ارادت جہاندار جاہی صاحبزادہ میر شجاعت علیخان مرحوم کے صاحبزادے ہیں اور جہاندار جاہ مغفور کے خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حیدرآباد ہی میں دیوڑھی جہاندار جاہ میں پیدا ہوئے۔ کب پیدا ہوئے اس کا خود ان کو علم نہیں ہے۔ عمر کے اعتبار سے انداذاً سنہ پیدائش ۱۹۱۴ء ہوسکتا ہے۔ خانگی ذرائع سے ضروری تعلیم حاصل کی۔ کچھ دن محکمہ آبکاری میں ملازمت کی لیکن ان کے مزاج کی صاحبزادگی نے زیادہ دن اس طوقِ ملازمت کو قبول نہ کیا اور ملازمت ترک کردی۔ ٹرسٹ سے جو صاحبزادگی کی تنخواہ ملتی ہے وہی ان کا ذریعہ آمدنی ہے۔ شعروسخن کا ذوق لاشعوری دور کا ہے۔ جو اس آخری شعوری دور تک جاری ہے۔

حضرت صفی ان کے والد اور ان کے چچا صاحبزادہ میر نظام الدین علی خان (مغل پاشا) مرحوم سے روابط رکھتے تھے اور اکثر مغل پاشا کے ساتھ وقت گزارا کرتے تھے ان ہی کی محفلوں میں صاحبزادہ ارادت بھی حضرت صفی سے متعارف ہوئے اور اپنے والد کے ذریعہ ان کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہونے کی استدعا کی۔ جس کو قبول کرلیا گیا اور یہ حضرت صفی کے دور وسطیٰ کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوگئے اور آخر وقت تک ان سے استفادہ سخن کرتے رہے۔

شاعری میں میلانِ طبع صرف غزل کی جانب ہے۔ کسی دوسری صنف سخن پر یا تو طبع آزمائی کی ہی نہیں یا کرنا نہیں چاہتے۔

(نمونہ کلام)

حاصلِ زندگی کسی کا غم ٭ حاصل غم جنونِ عبرت ناک

سازِ دل ٹوٹ رہا ہے شاید ؛ نغمہ بے جان ہوا جاتا ہے
آنکھ میں اشک، لب پہ آہ نہیں ؛ میرے غم کا کوئی گواہ نہیں
کس نے جلووں کو بے حجاب کیا ؛ میرے بس میں میری نگاہ نہیں
مجھ کو مجبوریاں گوارا ہیں! ؛ تم کو ہر شے پہ اختیار سہی
چاہے جس روپ میں دکھائی دے ؛ یہ سزاوار ہے اسی کے لیے
اے ارادت عطا کی ہے توہین ؛ زندگی دے کے آزمانا کیا
آگیا وہ تو زد میں جلوے کی ؛ طور کیا طور کا فسانہ کیا!
چلیئے دنیا کو میں نہیں سمجھا! ؛ آپ سمجھے تو کہیئے کیا سمجھے؟
فائدہ نسبت سے اتنا ہو گیا ؛ مرتبہ اونچے سے اونچا ہو گیا
ستاؤ لاکھ جفائیں کرو دکھاؤ دل ؛ تمہارا چاہنے والا تمہیں دُعا دے گا
اے ارادت صفی ہوں یا حمادی ؛ ان ہی ناموں سے نام ہے اپنا
کس سے کہوں میں حال دل بیقرار کا ؛ بدلا ہوا مزاج ہے لیل و نہار کا
پینے کے وقت بھی وہی غم روزگار کا ؛ توبہ کرو یہ شیوہ نہیں بادہ خوار کا
وہ جیت کر بھی خوش نہ ہوئے اپنی جیت پر ؛ ہم کو نہیں ہے ہار کے غم اپنی ہار کا
برباد کیجیے ایسا کہ مٹ جاؤں ہر طرح ؛ باقی نہ رہنے پائے نشاں تک مزار کا
ملتے ہی آنکھ آج کوئی مسکرا گیا ؛ مشکل ہے اب سنبھلنا دل بیقرار کا
یہ ہے ان کے حجاب کا عالم ؛ خواب میں بھی گلے لگا نہ سکے
دل کی دنیا اُجاڑنے والے ؛ دل کی دنیا مگر بسا نہ سکے
آج تارِ نفس بھی ٹوٹ گیا! ؛ آنے والے ابھی تک آ نہ سکے
اے ارادت یہ ایک تہمت ہے ؛ چاہنے والے غم اُٹھا نہ سکے

مذکورہ اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ جناب ارادت جہاندار حبا ہی شعر کم ضرور کہتے ہیں لیکن بھرپور اور جاندار کہتے ہیں۔ ان کے لب و لہجہ میں تیکھا پن اور ایسا زبان کا رچاؤ ہے جو صف شعراء میں ان کو منفرد و ممتاز بناتا ہے۔

آرام ــــ قاضی غلام احمد شریف

تاریخ پیدائش: ۔ تاریخ وفات:

جناب قاضی غلام احمد شریف آرام مرحوم حیدرآباد کے متوطن تھے۔ تاریخ پیدائش و انتقال دستیاب نہ ہوسکی اور نہ کوئی تصویر کہیں سے مِل سکی۔ صرف اِتنا معلوم ہوسکا کہ مرحوم کلیہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصل تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ نثرنگاری بھی کرتے تھے۔ حضرت صفی اورنگ آبادی کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں سے تھے۔

(نمونہ کلام)

دستِ جفا سے دامنِ حسرت ہے تار تار
منزل گہِ سکوں کہیں تیرا پتہ بھی ہے
اُمید ہے حرارتِ سیماب زندگی!
پوشیدہ ہے سکون غمِ لازوال میں!

کیا ہو سلوکِ ہستیٔ ناکام کا گلہ!!
اس کے سبب کہیں کے بھی یارب نہیں رہے
آرام ماسوا سے نہ پائے گا توصلہ
کیوں آستانِ غیر پہ تیری جبیں رہے

ارشد ـــــ خواجہ امان اللہ

تاریخ پیدائش: ۲۳ر نومبر ۱۹۲۳ء

خواجہ امان اللہ (امان ارشد) حضرت محمد علی مرحوم کے فرزند ہیں جو سابق حکومت حیدرآباد کے محکمہ فینانس کے مددگار معتمد (اسسٹنٹ سکریٹری) تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی رح کی ہمشیرہ سے ملتا ہے۔

۲۳ر نومبر ۱۹۲۳ء کو ولادت عمل میں آئی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا بعدازاں عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم پاکر بی اے کامیاب کیا۔

۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۵ء محکمہ سیول سپلائز میں بحیثیت آڈیٹر ملازمت کی۔ سنہ ۱۹۵۵ء تا سنہ ۱۹۷۸ء محکمہ انڈین میڈیسن میں بہ حیثیت منتظم نظامیہ طبی کالج، اور منتظم صدر شفاخانہ نظامیہ چارمنار میں خدمات انجام دے کر ۱۹۷۸ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے ستمبر ۱۹۸۰ء میں صحافت سے وابستہ ہوئے اور تادم تحریر بہ حیثیت سب ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن کارگزار ہیں۔

علی گڈھ میں قیام کے دوران ۱۹۴۳ء میں شاعری کا آغاز ہوا۔ اور پہلی غزل رسالہ لطف شباب لاہور کے شمارہ فروری ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی۔ اس ابتدائی دور کی غزل کا ایک مطلع پیش ہے ؎

تخیل میں میرے انھیں کا گزر ہے ÷ پرائے کی دھن ہے نہ اپنی خبر ہے

۱۹۵۲ء تک کسی سے تلمذ حاصل کئے بغیر شعر کہتے رہے ۱۹۵۳ء کے اواخر میں حضرت صفی کے دورِ آخر کے تلامذہ میں شامل ہوئے۔

شاعری میں کلاسکی اور عصری شاعری دونوں پر دست رس رکھتے ہیں اور بڑی

فکر و کاوش سے شعر کہتے ہیں۔

نمونہ کلام

جب تصور میں وہ طیبہ کا حسیں ہوتا ہے!
ہم کو اللہ کے ہونے کا یقیں ہوتا ہے!
ان کی رفعت کا بھلا کون کرے اندازہ
جن کے نعلین تلے عرشِ بریں ہوتا ہے

وہ جو اک بار میرے ہو جائیں
آسماں میرا ہے زمیں میری

جو شمع محبت کی ضو سے سینے کو فروزاں کر نہ سکے
وہ محفل ہستی میں اکثر کچھ کار نمایاں کر نہ سکے

وہ دل جو آشنائے غم نہیں ہے ؛ رموز عشق کا محرم نہیں ہے
ہمارے گریہ ہائے نیم شب سے ؛ چمن منت کش شبنم نہیں ہے
تصور میں وہ رشک ماہ جب بھی جگمگایا ہے ؛ شب ہجراں کی ظلمت کو ہم اکثر چاندنی سمجھے
منتظر رہتے ہیں جو انجام کے ؛ وہ محبت میں نہیں ہے کام کے
چٹکیاں لینے کوئی کہنے لگا دل کے قریب ؛ دو قدم اور سہی آ گئے منزل کے قریب
محبت میں ہوئے صاحب جنوں صاحب نظر ہو کر ؛ سواد ہوشمندی چھوڑ بیٹھے دیدہ ور ہو کر
اگر پہچان لیں خود کو خدا کو جان سکتے ہیں ؛ شعورِ ہستیٔ انسان عبادت سے بھی بڑھ کر ہے

جبیں اگر تو حیاتِ دنیا کی کشمکش سے مفر نہیں ہے
ہمارے مشرب میں ترکِ دنیا کا مسئلہ معتبر نہیں ہے

داغہائے پیہم سے مدتوں نکھارا ہے ؛ رشکِ محفل انجم آج دل ہمارا ہے
کس منزل میں ذوق شعر ہے ؛ ہر منزل اک راہ گزر ہے
ساتھ ہمارے بس وہی آئے ؛ جن کے دل میں دردِ بشر ہے
ذرہ ذرہ میں ایک عالم ہے ؛ اور مجھے فرصتِ نظر کم ہے

آپ جس کو سمجھ نہیں سکتے ؛ بس اسی بات کا مجھے غم ہے
ہر تجلی کی ہوئی ہم پہ توجہ ارشد ؛ اعتبار نظر دیدہ وراں تھا کتنا
وہ نبرد عشق کے فتح مند جو کھڑے ہیں آج بھی سر بکف
تری ہر ادا پہ جو مر مٹے وہ یہی تو خانہ خراب ہیں
مصلحت کوشوں کے یخ بستہ تجاہل کے سوا ؛ کیا ملا ہے سوز دل کی نغمہ خوانی سے مجھے
نظم "ادراک غم" (سانیٹ) کا ایک بند ؎

اے مرے غم مرے مونس مرے تنہا ہمدم
دلِ برباد کہاں تک تری بیداد سہے
تیرے الطاف ہمیشہ ہی نمک پاش رہے
تو نے رکھا ہی نہیں زخم پہ میرے مرہم!
دوستی پھر بھی رہی تجھ سے ہمیشہ محکم!
خوب درماں ہے کہ ہر زخم کا ناسور بنے
مرے احساس کا افعی جسے رہ رہ کے ڈسے
جس کے زہراب سے ہو جاتی ہیں آنکھیں پرنم

امان ارشد صاحب نے میرے مطالبہ پر اپنی تصویر اور نمونہ کلام عنایت فرمایا جس کے لیے میں مشکور ہوں۔

حضرت صفی سے متعلق:

تنہا میں استاد داغ دہلوی نے محاورات اور روز مرہ بول چال ہی میں اعلیٰ سے اعلیٰ مضمون کو اس حسن و خوبی کے ساتھ ادا کیا کہ سننے والا بے ساختہ پھڑک کر رہ گیا بالکل یہی حال حضرت کیفی اور صفی کا تھا ایک بلند سے بلند مضمون کو سلیس پیرایہ میں ادا کیا اور یہی کلام کی اصل خوبی ہے۔

"محاورات میں صفی کا مقام"
ابو محمد سید علی سرِیر
(سب رس صفی نمبر)

اشرف ـــــ صاحبزادہ اشرف الدین علیخاں

تاریخ ولادت ۲۲ر جولائی سنہ ۱۹۱۳ء

صاحبزادہ اشرف الدین علیخان اشرف خلف صاحبزادہ میر فرخندہ علیخاں دوم تعلقدار ۲۲ر جولائی ۱۹۱۳ء میں اپنے حقیقی ماموں نواب مظفر جنگ کی دیوڑھی واقع مغلپورہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ عالیہ سے میٹرک، جامعہ عثمانیہ سے یم اے کیا۔ پیشہ تدریس سے وابستہ رہے۔ نظام کالج، مدرسہ عالیہ اور سٹی کالج میں لکچرر رہے اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے نثر نگار بھی ہیں۔

صاحبزادہ اشرف خلف میر فرخندہ علی خاں نبیرۂ نواب منور الدولہ منور الملک فرزند پنجم نواب سکندر جاہ آصف جاہ سوم ہیں اور ننھیالی سلسلہ نواب رفیع الدولہ حبیب الملک نبیسہ نواب فریدوں جاہ برادر نواب سکندر جاہ سے ملتا ہے۔ صاحبزادہ اشرف ان دنوں مع اہل و عیال ہوسٹن امریکہ میں مقیم ہیں۔ حکومت نواب میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع کا پچیس سالہ جشن سلور جوبلی جو ۱۹۳۶ء میں شاندار پیمانہ پر حیدرآباد میں منایا گیا تھا۔ اس کی یادگار میں ڈاکٹر زور نے دکن کے شعراء کے دو تذکرے "مرقع سخن" کے نام سے ادارہ ادبیاتِ اردو کی جانب سے شائع کئے تھے۔ مرقع سخن جلد اول جس میں ۲۵ شعراء کے حالات زندگی نمونہ کلام اور تصاویر موجود ہیں اسی جلد میں صاحبزادہ اشرف الدین علیخاں اشرف نے اپنے استاد محترم امام تغزل حضرت صفی اورنگ آبادی پر ایک بسیط مقالہ لکھا جس میں پہلی بار حضرت صفی کے حالاتِ زندگی اور کلام کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ نواب مکرم جاہ بہادر اور نواب مفخم جاہ بہادر مدرسہ عالیہ میں اشرف صاحب کے زمانہ میں زیر تعلیم رہے۔ یکم رجب ۱۳۶۱ھ م ۱۶ر جولائی ۱۹۴۲ء کو ساجدالنساء بیگم بنت جناب محمد ولی الدین خان مرحوم

سے مغلپورہ میں عقد ہوا۔ پچیس سال تک محکمہ تعلیمات سے منسلک رہے۔ اور بحیثیت لکچرر سٹی سائنس کالج سے ۱۹۶۸ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ آپ کے چار صاحبزادہ اور پانچ صاحبزادیاں اس وقت ہندوستان سے باہر مختلف مقامات میں ہیں۔

ڈاکٹر اشرف الدین علیخان اشرف اچھے نثر نگار رہیں اور حضرت صفی کی شاگردی نے انھیں اچھا شاعر بھی بنادیا۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

آنکھ ساقی نہ چُرا کسی ستانے سے
ورنہ اُٹھے گی قیامت ترے میخانے سے

لذت آزارِ محبّت کی ہے راحت افزا
اور آرام ہوا درد کے بڑھ جانے سے

میرے ساقی کی ادائیں بھی قیامت واللہ
کبھی چلو سے پلائی کبھی پیمانے سے

کچھ عجب قہر ہے آفت ہے بلا ہے ظالم
ڈر کے رہتی ہے قیامت ترے دیوانے سے

اپنے سے الگ سمجھنے والے!!
میں بھی تو تری ہی آبرو ہوں!

صاحبزادہ اشرف کی ایک صاحبزادی محترمہ آصف النساء بیگم ایم اے اہلیہ تدبیر سلطان صاحب حیدرآباد میں مقیم ہیں جنھوں نے تفصیلات سے آگاہ فرمایا۔ اور صاحبزادہ عاقل نے موصوف کی تصویر عنایت فرمائی ہم دونوں کے مشکور ہیں۔

"حضرت صفی کے بارے میں"

قوم کے شاعر کو مزید خراجِ تحسین ملنا چاہیئے۔

پیامات۔ مس پدمجا نائیڈو

افسر ــــ نواب محمد افسر الدین خاں

تاریخ پیدائش: یکم مارچ ۱۹۲۰ء

نواب محمد افسر الدین خاں افسر نواب معین الدولہ بہادر مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ یکم مارچ ۱۹۲۰ء کو بمقام ناوندگی بشیر آباد جاگیر میں پیدا ہوئے۔ جاگیر کالج سے ۱۹۳۴ء میں میٹرک کامیاب کیا۔

سرورنگر میں معین الدولہ پیالس میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں کلام سنایا کرتے تھے۔ کلام تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ ذوق شعری فطری اور اوائل عمر کا ہے۔ حضرت صفی جب بھی سرور نگر آتے تو معین الدولہ کے تمام صاحبزادے اور دیگر مقامی شعراء جمع ہو جاتے۔ حضرت صفی ایک مصرع عنایت کرتے اور ایک گھنٹے کا وقت دیا جاتا اس وقت میں ہر شخص فی البدیہہ شعر کہہ کر سناتا۔ جس کسی کے شعر حاصلِ مشاعرہ ہوتے اس کو نواب افسر الدین خان اپنی جانب سے حضرت صفی کے ہاتھوں انعام دیا کرتے تھے

جناب افسر حضرت صفی کے دور وسطیٰ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ شعر بہت چست اور سلیس کہتے ہیں۔ ان دنوں وہ اگلی سرگرمیاں نہیں رہیں۔ بس کبھی کبھی جب طبیعت موزوں ہوتی ہے تو کچھ شعر کہہ لیتے ہیں۔ اب تک جو کچھ کہا وہ محفوظ نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے صرف (۳) شعر دستیاب ہوسکے ہیں جو نمونہ کلام کے طور پر پیش ہیں۔

(نمونہ کلام)

نہ ڈالی پھر کسی پر آنکھ تم کو دیکھ کر میں نے ؛ زمانہ ہو گیا محفوظ کر لی ہے نظر میں نے

حشر کا دھڑکا ہے افسر اس لیے ؛ کیا خبر کیا ہم سے پوچھا جائے گا

کوئی کھولے ہے آغوش تمنا ؛ ارے او جانے والے آ ادھر کو

جناب افسر صاحب نے میرے مطالبہ کے باوجود اپنی تصویر عنایت نہیں فرمائی۔

ان کی اکثر آزاد نظمیں اخبار و جرائد میں شائع ہوتی ہیں۔ ان کی ایک نظم "اپنا گھر" جو دیوڑھی کے نیلام ہونے کے موقع پر لکھی گئی تھی۔ روزنامہ سیاست میں شائع ہو کر بہت مشہور ہوئی۔ دیگر نظموں میں ایک دوست کے مفلوج ہونے پر ایک آزاد نظم "یخ بستہ" مسلم خواتین کی بدحالی سے متعلق نظم "آنکھیں بولتی ہیں" اور شہر کے فرقہ وارانہ فسادات پر ان کی نظم "چار مینار" بڑی پُراثر ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی انسان میں جب دو خوبیاں ہوتی ہیں تو کوئی ایک خوبی دوسری خوبی پر حاوی ہو جاتی ہے جیسے کوئی شخص بیک وقت شاعر اور نثر نگار ہو تو وہ یا تو ایک اچھا شاعر ہوگا یا ایک اچھا نثر نگار۔ مثلاً ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم جو نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے تھے۔ جب وہ حضرت صفیؔ کے پاس آئے تو انھوں نے ان کی شاعری اور نثر نگاری کا موازنہ کر کے انھیں مستقلاً نثر نگاری اختیار کرنے کا مشورہ دیا چنانچہ زورؔ مرحوم نے شاعری ترک کر کے نثر نگاری میں اپنا پورا زور لگایا۔ نتیجتہً وہ اتنے اونچے نثر نگار بن گئے کہ آج تک ان کا نام جلی حروف میں لکھا جاتا ہے۔ اس کلیہ کا اطلاق جناب جہاندار افسر پر بھی ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ بہ یک وقت شاعر بھی ہیں اور صحیفہ نگار بھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی ان دو خوبیوں میں سے کونسی خوبی دوسری خوبی پر حاوی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان کی صحیفہ نگاری شاعری پر فوقیت رکھتی ہے کیوں کہ ان کی جیسی شاعری دیگر شعراء بھی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ لیکن دیگر شعراء ان کی جیسی صحیفہ نگاری نہیں کر سکتے اس لیے صحیفہ نگاری میں ان کا پلّہ بہت بھاری ہے اور وہ بلاشبہ اس دور کے ایک مثالی صحیفہ نگار ہیں۔ ان کے ایک فرزند جناب تجمل اظہر بھی شاعری کا ذوق رکھتے ہیں۔

(نمونہ کلام)

کیا ہوگا اب نظامِ گلستاں نہ پوچھیے ؛ کانٹوں کے دسترس میں ہے پھولوں کی زندگی

دل کی تسکین بھی ہے درد کا اظہار بھی ہے ؛ ضبط کرنے سے تو رونا ہی بھلا ہے افسرؔ

کیا انقلاب صرف کتابوں کی بات ہے ؛ اے کشتگانِ بے کفنی کچھ نہ کچھ کرو!

افسر ـــــ الحاج صاحبزادہ میر محمد جہاندار علیخان

تاریخ پیدائش: ۱۵ ؍ مئی ۱۹۲۵ء

صاحبزادہ میر محمد جہاندار علی خاں افسر (جہاندار افسر) صاحبزادہ میر افتخار علیخاں صدیقی مرحوم کے فرزند ہیں۔ ۱۵ ؍ مئی ۱۹۲۵ء کو دیوڑھی پنج محلہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ نسبتاً صدیقی ہیں اور ان کا سلسلہ نسب تیرھویں پشت میں حضرت آصف جاہ اول اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے ہوتا ہوا خلیفہ اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ آصف جاہی خانوادہ سے تعلق رکھنے کے باعث یہ طبقہ صاحبزادگان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے مزاج اور کردار میں جاگیرشاہی کے عنصر کم اور انقلابیت اور انسانیت دوستی زیادہ ہے۔ دوبار ۱۹۵۴ء اور ۱۹۶۴ء میں بلدیہ کے الکشن جیت کر حلقہ مغلپورہ کے میونسپل کونسلر رہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے جہاندار افسر کی ابتدائی تعلیم تیسری جماعت تک مدرسہ اعزہ ملک پیٹھ میں ہوئی۔ میٹرک تک مدرسۂ عالیہ میں رہے۔ ۱۹۴۵ء میں صحافت سے وابستہ ہوئے اور یہ سلسلہ تادم تحریر (۱۹۹۰ء) جاری ہے۔

ابتداء میں یہ اپنے ایک سینیئر ساتھی علی تقی خان ساغر سے مشورۂ سخن کرتے تھے اس کے بعد حضرت محمد علی شیدا کے آگے زانوئے ادب تہہ کئے۔ سکونتی محلے قریب قریب واقع ہونے کی وجہ سے اس کی اطلاع جب حضرت صفی کو ہوئی تو انھوں نے ان کے والد سے کہہ کر ان کو بلوایا اور آئندہ سے انھیں کلام دکھانے کی تاکید کی چنانچہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۴ء تک ان کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ اس طرح ان کا شمار حضرت صفی کے دور وسطی کے حلقۂ تلامذہ میں ہوتا ہے

شاعری میں غزل کے علاوہ نظم اور معرّیٰ نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے چنانچہ

کیوں بندگان عام سے یہ سخت امتحان ؛ پروردگار یہ تو رسولوں کی بات ہے
دل کا مسیح چارہ گرِ جاں کوئی تو آئے ؛ لے کر ہمارے درد کا درماں کوئی تو آئے
اس دور کے نصیب میں جو انبیاء نہیں ؛ اس دور کی نجات کو انساں کوئی تو آئے
شبِ فرقت سحر تک میں بھی رویا شمع بھی روئی ؛ مرے مانند وہ بھی دل جلی معلوم ہوتی ہے

آخری شعر اس غزل کا ہے جو ۱۹۴۲ء میں نظام کالج میں منعقدہ آل انڈیا مشاعرہ میں سنائی گئی تھی۔ اس مشاعرے میں حضرت جگر مرادآبادی، حسرت موہانی، صدق جائسی، ماہر القادری اور نثار یار جنگ مزاج بھی شریک تھے۔ حضرت جگر مرادآبادی نے اس شعر کو کافی پسند کیا تھا اور بار بار سنا تھا۔ ۸۷

ذوق اور صفی

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں ؛ لکھ دی تھی ایک بات اُسے اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں ؛ میں کیا کہوں جو اس نے لکھا ہے جواب میں

مومن اور صفی

میں نے تم کو دل دیا، تم نے مجھے رسوا کیا ؛ مشورے لوگوں سے لے لے کر مجھے رسوا کیا
میں نے تم سے کیا کیا، اور تم نے مجھ سے کیا کیا ؛ واہ تجھ سے آس کیا تھی، اور تو نے کیا کیا

کیفی اور صفی

چمن کا پھول، مے خانے کا شیشہ، عرش کا تارا ؛ اُسے سب لوگ ظالم، بے وفا، قاتل سمجھتے ہیں
کوئی ٹوٹی ہوئی شے ہو ہم اپنا دل سمجھتے ہیں ؛ مگر ہم ہیں کہ اپنی جان اپنا دل سمجھتے ہیں

اقبالؔ ـــــ نواب محمد اقبال الدین خان

تاریخ پیدائش: ۵ ر ڈسمبر ۱۹۲۳ء

نواب اقبال الدین خاں اقبالؔ نواب معین الدولہ بہادر کے صاحبزادے ہیں۔ ۵ ر ڈسمبر ۱۹۲۳ء کو بمقام دیوڑھی نواب معین الدولہ بہادر واقع سرور نگر پیدا ہوئے۔ جونیر کیمبرج گرامر اسکول کے فارغ التحصیل ہیں۔ شاعری کا ذوق موروثی اور اوائل عمر کا ہے۔ حضرت صفیؔ سے سرور نگر میں منعقدہ محفلوں میں قریب ہوئے اور دور وسطیٰ کے تلامذہ میں داخل ہوئے۔ حضرت صفیؔ نے ان کی پہلی غزل پر "اللہ آپ کو یہ شوق مبارک کرے" کے الفاظ لکھ کر حوصلہ افزائی کی۔ حضرت صفیؔ نواب اقبال الدین خان کے بھائیوں میں سے کسی کے پاس کبھی تشریف فرما ہوتے تو ایک چھٹی پر یہ شعر لکھ کر ان کو یاد فرما لیا کرتے تھے ؎

اقبال سے تو اچھا زر و مال نہیں ہے ٭ وہ کون ہے جو طالبِ اقبال نہیں ہے

ایک مرتبہ انھوں نے ناشتہ کے بعد بسکٹ اور کافی حضرت صفیؔ کے لیے بھجوائی تو حضرت نے لکھ بھیجا ؎ آپ نے کافی جو بھیجی مجھ کو کافی ہوگئی۔

نواب اقبال الدین خاں سے ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ دیوڑھی میں حضرت صفیؔ نواب معین الدولہ کو کچھ کلام سنا رہے تھے۔ نواب کو ایک شعر بہت پسند آیا تو اپنے ہاتھ سے اتار کر ایک ہیرے کی طلائی انگوٹھی دے دی۔ حضرت صفیؔ اس وقت بحالت سرور انگوٹھی لے کر واپس آگئے۔ دوسری صبح اول وقت سرور نگر تشریف لاکر نواب معین الدولہ کو انگوٹھی واپس کرتے ہوئے کہا کہ نہ میں اس کو حفاظت سے رکھ سکتا ہوں اور نہ ہی فروخت کر سکتا ہوں۔ آپ کی چیز آپ کو مبارک یہ میرے لائق نہیں ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی نواب بشیر جنگ دلؔ نے ایک دن اپنے بھائیوں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ حضرت صفیؔ کے لیے کچھ مستقل آمدنی کا ذریعہ نکالا جانا چاہیئے۔ اس بات کا ذکر انھوں نے

بھٹکتے نہیں تیرے میخوار ساقی ٭ قرینے سے ہوتے نہیں بے قرینہ
نہ سمجھے گا ہر اک محبت کی باتیں ٭ یہ اسرار کھلتے ہیں سینہ بہ سینہ
داغ دل دے کے اس نے دیدی ہے ٭ سو بہاروں کی اک بہار مجھے
تجھے دیکھ سکتے ہیں بس آنکھ والے ٭ مگر تیرا جلوہ ہے عام اللہ اللہ
دوں حور سے تمثیل کہ تشبیہ پری سے ٭ ملتے نہیں کافر ترے انداز کسی سے
الفاظ میں اقبال بیاں کر نہیں سکتا ٭ مجھ کو جو محبت ہے رسولؐ عربی سے
آپ چھپ کر جہاں بھی جاتے ہیں ٭ نقش پا راستہ بتاتے ہیں
غیر گستاخ ہوتے جاتے ہیں ٭ آپ کیسوں کو منہ لگاتے ہیں
اقبال جو معین کے دم سے نصیب تھا ٭ وہ لطف خواب ہو گیا سیر و شکار کا
واہ کیا جراتیں ہیں بسمل کی ! ٭ لے اتارے بلائیں قاتل کی
گلشن کا رنگ دیکھ نہ گل کا نکھار دیکھ ٭ آئینہ روبرو ہے تو اپنی بہار دیکھ
اقبال نام ہے تو پھر ادبار سے نہ ڈر ٭ اقبال ہی رہے گا ترا برقرار دیکھ
رخ پہ آنچل ادھورا ڈالا ہے ٭ کچھ اندھیرا ہے کچھ اُجالا ہے
سب ہی معشوق اپنی کرتے ہیں ! ٭ کون عاشق کی سُننے والا ہے
اثر میں دوسروں کے آگیا دل ! ٭ نہیں ہے اب ہمارے کام کا دل
میں دل کے واسطے روتا رہا ہوں ٭ کسی کے واسطے روتا رہا دل
بار خاطر ہے اگر یاد مری ٭ بھول جاتے تو بہت اچھا تھا
مشکل میں کیوں ہے طالب امداد غیر سے ٭ پیدا کیا ہے جس نے اسی کو پکار دیکھ

○

اقبال نواب نے مجھ سے جس خلوص و محبت کا برتاؤ کیا اور تصویر و نمونہ کلام عنایت فرمایا میں اس کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ▲▽

حضرت صفیؔ سے کیا تو انھوں نے ایک چھٹی پر یہ شعر لکھ کر نواب بشیر جنگ دلؔ کے پاس بھیج دیا۔ ؎

بس اِسی سوچ میں نہ رہ جائیں ! ؂ کیا کروں کیا کروں صفیؔ کے لیے

نواب اقبال الدین خان بڑے زود گو شاعر ہیں۔ اپنے تمام بھائیوں کے رنگ سے ذرا ہٹ کر شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ پولس ایکشن کے بعد ٹاؤن ہال میں ایک طرحی مشاعرہ تھا جس میں حضرت صفیؔ کے علاوہ نواب تراب یار جنگ، سعیدؔ شہیدی، عبد الحمید خاں خیالی، نواب مظہر الدین خاں، نواب افسر الدین خاں افسرؔ نواب احمد الدین نادرؔ، بہادر علی جوہرؔ اور نظیر علی عدیلؔ شریک تھے جب انھوں نے اپنی غزل میں یہ شعر پڑھا ؎

ماہ کو شق کرنے والے ہو نگاہِ التفات ؂ مہر کو لوٹانے والے وقت ہے امداد کا

تو اس وقت ریاست حیدر آباد کے حالات کے پس منظر میں ہر دل پر اس کا خاصہ اثر ہوا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

چونکہ مزاج میں خاندانی رکھ رکھاؤ اور آن بان ہے اس لیے بہت کم آمیز ہیں عام محفلوں میں شرکت نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں اپنے محل کی حد تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ کلام کا ذخیرہ معتد بہ ہے لیکن طباعت کی طرف آج تک توجہ نہیں دی۔

(نمونہ کلام)

ہر بڑا کام اُس سے لیتا ہے ؂ جس کو چاہے خُدا بڑا کرنا

حضرت موسٰی کو تو جلوہ ہوا ؂ طور جل کر مفت میں سرمہ ہوا

آنکھ بھیگی تک نہیں بے درد کی ؂ مدتوں دیکھا مجھے روتا ہوا

دیکھ لے اپنی ہر اک تصویر میں ؂ جو زمانہ سے ترا گزرا ہوا!

گردشیں اپنی بدل دے آج تو اے آسماں ؂ بعد مدت کے مرے گھر میں کوئی مہمان ہے

بس اپنے ساتھ اپنی قبر میں اعمال آئیں گے ؂ نہ عزت ساتھ آنے کی نہ دولت ساتھ آئیگی

تیری آنکھوں کا صدقہ لے ساقی ؂ ایسے دو جام کی ضرورت ہے

باقیؔ ـــــ حضرت سید محمد حسینی افتخاری

تاریخ پیدائش: ۱۹۱۱ء ؛ تاریخ وفات: ۱۹۴۳ء

حضرت سید محمد حسینی افتخاری باقیؔ مرحوم حضرت سید احمد افتخاری مرحوم کے فرزند ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں بمقام مغل پورہ حیدرآباد اس مکان میں پیدا ہوئے جس کو حکومت نے بہبودیٔ اطفال مغل پورہ کے چمن کے لیے حاصل کرلیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد محکمہ بلدیہ میں ملازم ہوئے آبائی مکان کی چمن بندی کے لیے حکومت کی تحویل میں چلے جانے کے بعد یہ مغل پورہ کے جس مکان میں رہائش پذیر ہوئے وہ حضرت صفیؔ کے مکان سے بہت قریب تھا۔ اس قربت کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ذوقِ شعر گوئی میں پر لگ گئے، اور یہ جب بھرپور اڑان بھرنے کے قابل ہوگئے تو حضرت صفیؔ کے دورِ اول کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوکر ان سے بھرپور استفادہ سخن کیا۔ ان کے نام لیواؤں میں ایک فرزند اور دو صاحبزادیاں ہیں جن کے منجملہ ایک صاحبزادی مشہور مزاحیہ شاعر جناب اسماعیل ظریفؔ کی اہلیہ محترمہ ہیں۔

اپنی مختصر سی عمر میں ہی کافی دنیا دیکھ لی اور بدوران ملازمت بعمر ۳۲ سال بعارضہ نمونیہ ۱۹۴۳ء میں انتقال کرگئے۔ تدفین احاطہ چشتی چمن میں عمل میں آئی۔

شاعری میں میلانِ طبع صرف غزل کی طرف تھا اور شعر بہت چست و شگفتہ کہتے تھے۔

فوٹو حاصل نہ ہوسکی۔ جناب اسماعیل ظریفؔ نے حالات و نمونۂ کلام عنایت فرمایا۔ میں تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(نمونۂ کلام)

رنگِ محفل تیرے آتے ہی بدل جاتا ہے ؎ اپنی اپنی جگہ ہر کوئی سنبھل جاتا ہے

اللہ رے میرے دستِ جنوں کی درازیاں ÷ ہے جیب کا پتہ نہ گریباں کے تار کا

باقی جو ایک مانگیے دیتا ہے وہ ہزار ÷ کس منہ سے شکر کیجیے پروردگار کا

آشنا سارے اس زمانے کے ÷ دوستی کے نہ دوستانے کے

تم نے بیخود بنا دیا جن کو! ÷ حشر تک ہوش میں نہ آنے کے

بھول کر چال اپنی ہم باقی ÷ ساتھ چلنے لگے زمانے کے

آنکھ کہتی ہے کہ جو کچھ بھی کیا دل نے کیا ÷ دل یہ کہتا ہے کہ میری کوئی تقصیر نہیں

پہنچ جاتے ہیں نالے عرش تک کس طرح اے باقی ÷ کہاں سے ان میں یہ طاقت دمِ پرواز آتی ہے

کیا کہیں ہم سے کیا نہیں ہوتا ÷ شکر اس کا ادا نہیں ہوتا

جیسی گزرے گزار دے باقی ÷ بندگی میں گلہ نہیں ہوتا

عاشقی کر کے دیکھ لے باقی ÷ عشق کیا ہے کہا نہیں جاتا

میں تو کیا کوئی بتا سکتا نہیں باقی کبھی ÷ آئے تھے دنیا میں کیوں دنیا سے کیوں جانے لگے

اک تسلسل ہے میرے رونے میں ÷ آج موتی پرو رہا ہوں میں!!

قافلہ دور ہو گیا باقی   پاؤں پھیلائے سو رہا ہوں میں

دِل کی وحشت تمام ہی نہ ہوئی   میری رسوائی عام ہی نہ ہوئی

نیم جاں چھوڑ کر گیا قاتل   آج محبت تمام ہی نہ ہوئی

باقی اسی کو کہتے ہیں معراجِ زندگی   داغِ جبیں ہے نقشِ کفِ پا لئے ہوئے

اس کا در چھوڑ کر نہ جا باقی
پھر کہیں آسرا ملے نہ ملے

صفی کی شاعری مقصدی شاعری تھی وہ اپنی شاعری کے ذریعہ موجودہ دور کی گری ہوئی ذہنیتوں اور اخلاقی قدروں کو بلند کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ "صفی کی شاعری"

ہاشم حسن سعید

(ماہنامہ سب رس۔ صفی نمبر ۱۹۵۶ء)

بشیر — بشیر النساء بیگم

تاریخ پیدائش: ۲۱ر جنوری ۱۹۱۵ء تاریخ وفات ۲ر فروری ۱۹۷۲ء

محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر دکن کی دوسری صاحب دیوان شاعرہ ہیں۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۱۵ء کو آفتاب کی پہلی کرنوں میں آنکھ کھولی۔ چونکہ ان کے والدین شعری ذوق رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اردو و فارسی کے اساتذۂ سخن کے کلام سے روشناس کرایا۔ اس طرح علمی و ادبی ماحول میں ان کی تربیت ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں ایک علم دوست اور اہلِ فن کے قدرداں گھرانے میں مرزا ضامن علی نمازی صفوی کی زوجیت میں داخل ہوئیں۔ ذوق شعری تو بچپن ہی سے تھا لیکن ۱۹۲۷ء سے باقاعدہ شعر گوئی شروع کردی۔ مہاراجہ کرشن پرشاد شاد کے خاص درباری شاعر صادق حسین غبار سے مشورۂ سخن کیا۔ اس کے بعد حضرت نظم طباطبائی اور ابوظفر عبدالواحد سے بھی مشورہ سخن کیا۔ ان اساتذہ کا خیال تھا کہ ان کے کلام پر کسی کی اصلاح کی ضرورت نہیں۔ شاعری میں یہ علامہ اقبالؒ سے بہت زیادہ متاثر تھیں یہاں تک کہ انھیں کے رنگ میں ڈوب کر شعر کہتی رہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے ان کی شاعری کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اردو شاعری میں کسی نے خیالی نزاکت اور کسی نے جذباتی حدت دی ہے لیکن بشیر النساء بیگم بشیر نے اردو کو زیورِ شرافت سے سنوارا۔ ڈاکٹر زورؔ کا یہ ایک رسمی تبصرہ نہیں تھا بلکہ انھوں نے ان سے متاثر ہونے کا پورا ثبوت بھی دیا۔ اور ۱۹۴۸ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام "آبگینۂ شعر" کے نام سے ادارہ ادبیات اردو کے زیرِ اہتمام شائع بھی کیا جو ادارہ کی سلسلہ مطبوعات کی (۱۴۲) ویں کتاب ہے۔ اس مجموعہ کے علاوہ ان کا کلام ہندوستان کے اکثر معیاری رسالوں میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ حضرت صفیؔ سے ان کے تلمذ اختیار کرنے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ہوا یہ کہ

مجموعۂ کلام کی طباعت کے بعد اس کی ایک جلد لے کر ان کے شوہر جناب ضامن علی غازی حضرت صفی کے پاس گئے اور انھیں نذر کی۔ حضرت صفی نے اس کو شکریے کے ساتھ قبول کرتے ہوئے انھیں (۴) دن کے بعد آنے کے لیے کہا تاکہ وہ اس کا مطالعہ کر کے اپنی رائے کا اظہار کرسکیں۔ چار دن کے بعد جب جناب غازی حضرت صفی کے پاس گئے تو انھوں نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا کہ ارے میاں غازی تم صرف نام کے ہی غازی نہیں ہو بلکہ کام کے بھی غازی ہو۔ تم نے ایسی بیوی پائی ہے جو بیسویں صدی کی مہ لقا بائی چندا ہے۔ اِس کے بعد بڑے حسرت آمیز لہجے میں کہا کہ کاش وہ میری شاگرد ہوتیں! حضرت صفی کا یہ تبصرہ جب بشیر النساء بیگم بشیر نے سُنا تو ایک ذہنی ہلچل میں مبتلا ہوگئیں۔ وہ جذبۂ شعری جو دیوان کی اشاعت کے بعد آسودہ ہوگیا تھا اور انھوں نے آئندہ شعر گوئی جاری نہ رکھنے کا ارادہ کرلیا تھا پھر نئے سر سے اُبھرا اور انھوں نے اپنے شوہر کے ذریعہ حضرت صفی کو اپنے مکان پر مدعو کیا۔ پُر تکلف عشائیہ کے بعد پردے کے پیچھے سے وہ حضرت صفی سے بعد سلام نیاز مخاطب ہوئیں اور کہا کہ اگرچہ میں نے اب شعر گوئی جاری نہ رکھنے کا ارادہ کرلیا تھا لیکن اگر آپ اپنی استادانہ شفقت سے نوازیں تو میں پھر اس سلسلے کو تادمِ آخر جاری رکھوں گی۔ حضرت صفی کے لیے انکار کی گنجائش ہی کہاں تھی چنانچہ انھوں نے ان کو اپنی شاگردی میں قبول کرلیا۔ اس طرح یہ حضرت صفی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگئیں اس کے بعد شعر گوئی کا سلسلہ پھر ایسا چل پڑا کہ حضرت صفی کے انتقال (۱۹۵۴ء) کے بعد بھی خود ان کے انتقال تک جاری رہا۔ ان کا انتقال طویل علالت کے بعد ۱۲ فروری ۱۹۷۲ء کو اپنے شوہر کے مکان "دارالحریت" موقوعہ بیرون دبیر پورہ حیدر آباد میں ہوا۔

محترمہ بشیر نے نہ صرف صنف غزل پر طبع آزمائی کی بلکہ نظم میں بھی بہت کھل کر اپنے جوہر طبع دکھائے ہیں۔ مجموعہ کلام "آبگینۂ شعر" میں مختلف عنوانات کے تحت حسب صراحت ذیل (۲۶) نظمیں ہیں ؎

حضور یزداں ۱

اذکار و اذکار ۲۹

حدیث دکن ۹ ، خانوادہ آصفی ۷ ، یادِ رفتگاں ۱۲ ، سوز و ساز (نعت، سلام، منقبت) ۷
بشیر النساء بیگم بشیر کی تدفین روبرو ٹپہ خانہ آعظم پورہ اپنے مختصر سے خاندانی قبرستان
میں ہوئی ۔ باب اللہ خط پر جلی حروف میں "خواب گاہِ بشیر لکھا ہوا ہے"۔ قبر پر کتبہ موجود
ہے ۔

اور سازِ غزل کے تحت (۷) غزلیں ہیں۔ اپنے مجموعہ کلام کے تعلق سے
خود اپنے تاثرات اس طرح ظاہر کرتے ہیں ۔

مرا ضمیر ہے بےتاب جستجو اس میں
جھلک رہی ہے مرے دل کی آرزو اس میں
بشیر کیا کہوں کیا شے ہے "آبگینۂ شعر"
مری سرشت ہے خود میرے روبرو اس میں

(نمونہ کلام)

(بہ حضور یزداں)

یارب ترے کرم سے عطا زندگی ہوئی ⁂ پیدا ربوبیت سے مری بندگی ہوئی!
میری نوائیں تیرے مقاصد کا ہے ظہور ⁂ میری نظر ہے حسن میں تیرے بسی ہوئی

(نذرِ رسالت)

سررشتہ ربوبیت روئے زمیں پہ آ گیا! ⁂ نورِ ظہورِ مصطفےٰ کون و مکاں پہ چھا گیا

(فلسفہ نمود)

حد کوئی کیا بتائے علوم و فنون کی! ⁂ ہر لحظہ آرہی ہے صدا کاف نون کی
سوزِ حیات زمزمۂ رنگ و لو میں ہے ⁂ معراجِ اکتساب نہاں جستجو میں ہے

(عورت)

روزی معاش رزق کمانے میں کچھ نہیں ⁂ عورت ہی جب نہیں تو زمانے میں کچھ نہیں
نہ ہی سیم و زر سے نہ دام و درم سے ⁂ یہ دنیا ہے آباد عورت کے دم سے

پہلوانؔ ـــــ محمد غفارؔ

تاریخ وفات : ۱۹۵۲ء

جناب محمد غفار پہلوانؔ مرحوم حیدرآباد کے متوطن تھے۔ پہلوانی کے فن میں دسترس رکھتے تھے اور حیدرآباد کے مشہور پہلوان گزرے ہیں۔ پہلوانی کی طرح شاعری کے داؤ پیچ سے واقف تھے۔ مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے اور خوب گھن گرج سے کلام سُناتے تھے۔ اولاً رحمت صاحب سے تلمذ حاصل کیا۔ بعد میں حضرت صفیؔ کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

(نمونہ کلام)

جم گئی ہے بُتِ رعنا کی جو صورت دل میں
تختۂ مشق ہے ظالم کی محبت دل میں

نقدِ دیدار ضیبا بار سے محروم نہ کر
ہم بھی رکھیں گے تری دی ہوئی دولت دل میں

کیوں نہ ہم تم کو پہلوانؔ۔ کہیں مردِ سُخن
جب کہ تم کرتے ہو اذکار کی کثرت دل میں

○

پیکاںؔ ــــ میر احمد علیؒ

تاریخ پیدائش: ۱۸؍فروری ۱۹۱۳ء ٭ تاریخ وفات: ۳؍اگست ۱۹۷۰ء

حضرت میر احمد علی پیکاںؔ مرحوم حضرت میر لیاقت علی سیفؔ مرحوم کے تیسرے فرزند ہیں اور حضرت یاور علی خنجرؔ اور حضرت بہادر علی جوہرؔ کے حقیقی بھائی ہیں۔

۱۸؍فروری ۱۹۱۳ء کو بمقام دودھ باؤلی حیدرآباد اپنے والد میر لیاقت علی سیفؔ کے مکان میں پیدا ہوئے جو انھیں نواب معین الدولہ بہادر کی جانب سے عطا کیا گیا تھا۔

حضرت پیکاںؔ حضرت صفیؔ کے دورِ اول کے تلامذہ میں سے ہیں۔ حصولِ تعلیم کے بعد جاگیر اڈمنسٹریشن کے دفتر میں ملازم ہوئے اور وہیں سے وظیفہ حاصل کیا۔ شعری ذوق موروثی ہے۔ بچپن ہی سے پختہ رنگ میں شعر کہتے تھے۔ حضرت صفیؔ کے شاگرد ہونے کے بعد تو ان کی شاعری کا رنگ اور نکھر گیا۔ ٹھیٹ غزل گو شاعر تھے۔

(نمونہ کلام)

آنکھ ان کی چال چل کر رہ گئی ! ٭ یا مری دنیا بدل کر رہ گئی !!

رہ سکا قائم نہ حسنِ بے ثبات ٭ دوپہر کی دھوپ ڈھل کر رہ گئی

اٹھ گئے جس دم مری بالیں سے وہ ٭ زندگی کروٹ بدل کر رہ گئی !

مطمئن ہے دل اپنا زندگی کے خطروں سے ٭ ساتھ کارواں کے ہے میر کارواں اپنا

ہے ہماری صورت سے ساری صورتیں پیکاںؔ ٭ ہر عیاں کا جلوہ ہے مظہرِ نہاں اپنا

یہاں آئینے کی نگاہ میں رخِ حسن آئینہ ساز ہے ٭ وہاں عکسِ آئینہ رد گیا ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

تری ذات اتنی لطیف ہے جسے راز تک بھی نہ چھو سکا ٭ جہاں راز کا بھی گزر نہیں تو وہاں ہے پردۂ راز میں

بہ حکم رب کئے سجدے اسی کو ٭ ملک پھر بھی نہ سمجھے آدمی کو

پرستار ادب شیدائے اُردو ÷ بھلائیں کس طرح حضرت صفی کو
خطا کیا ہے کہ ناروں میں پڑ کر ÷ چڑھاتے کیوں ہیں سولی پہ کلی کو
اس طرح کٹتی ہے اپنی خانۂ صیاد میں ÷ کچھ چمن کی اور کچھ اہل چمن کی یاد میں
بات یہ اپنی سمجھ میں آج تک آئی نہیں ÷ ہچکیاں کیوں بار بار آتی ہیں انکی یاد میں
خانۂ دل میں یار ہے بس ہے ÷ میرے گھر میں بہار ہے بس ہے
عشق تم سے ہے پیار تم سے ہے ÷ زندگی کی بہار تم سے ہے
مدد کا وقت ہے اے ہوش اب سنبھال مجھے ÷ وہ آرہے ہیں مرے پاس جا رہا ہوں میں!
فنا ہے چار عناصر کو دہر میں پیکاںؔ ÷ پھر اس کے بعد تو ہم صورت لقا ہوں میں
اسباب کیا بنیں گے وہاں عرض حال کے ÷ ملتے ہیں سو جواب جہاں اک سوال کے
افسانے حسن و عشق کے دنیا میں آج کل ÷ احکام سے بری ہیں حرام و حلال کے
اپنی تجدید زندگی کے لیئے ÷ موت کو انتظار ہے اپنا
اک مجھے کیا بنا لیا تو نے ÷ اپنے مقصد کو پا لیا تو نے

○

۳ر اگست ۱۹۷۰ء کو انتقال ہوا اور قادری چمن کے روبرو تکیہ جال بی میں اپنے بھائی بہادر علی جوہر کے بازو دفن ہیں۔ قبر کے کتبے پر خود ان کا کہا ہوا یہ قطعہ کندہ ہے ؎

قطعہ

یہاں کی عارضی ہے زندگانی!
نتیجہ آخرش ہر شئے کا فانی!
بنے مٹی سے ہیں مٹنے کی خاطر
یہ مٹی خود ہے مٹنے کی نشانی

پیکاںؔ صاحب کے فرزند جناب میر راحت علی صاحب نے اپنی خاص دلچسپی کا اظہار فرما کر اپنے تایا خنجرؔ صاحب۔ جوہرؔ صاحب اور والد پیکاںؔ مرحوم کا کلام ہمیں عنایت کیا جس کے لیئے میں اُن کا بیحد ممنون ہوں۔

تابؔ — عبداللہ ابن احمد سُمار

تاریخ وفات: ۲۳ر نومبر ۱۹۷۳ء

جناب عبداللہ ابن احمد تابؔ مرحوم حیدرآباد کے متوطن تھے۔ مدرسہ نظامیہ اور کائستھ پاٹ شالہ میں تعلیم پائی۔ شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ کم عمری ہی سے شعر کہتے تھے۔ ابتداً آوارہ تخلص اختیار کیا اور حیدر پاشاہ کی شاگردی میں داخل ہو کر دانشؔ بنے اور حضرت صفیؔ سے رجوع ہوئے۔ حضرت صفیؔ نے دانشؔ کو تابؔ بنا دیا۔ اس لیے صرف دو تین سال تک ہی یعنی حضرت صفیؔ کے انتقال (۱۹۵۴ء) تک ہی استفادۂ سخن کر سکے۔ ایک عرصہ تک پُرانے شہر کے مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ بعد میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی عاملہ کے رکن بھی رہے۔

غزل سے ان کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا اور غزل خوب کہتے تھے۔ اندازِ بیان میں ندرت اور طرزِ فکر میں جدت تھی۔ ۱۹۵۳ء میں ایک ہفت روزہ اخبار "اردو" بھی جاری کیا جس کے وہ خود مُدیر تھے۔ یہ ہفتہ وار ایک سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد محکمہ بلدیہ میں ملازم ہو گئے اور انتقال تک اسی محکمہ سے وابستہ رہے۔ ابن احمد تابؔ مرحوم کا مجموعۂ کلام "خانۂ دل" ادبی ٹرسٹ کی جانب سے ۶ر مئی ۱۹۷۳ء کو یعنی ان کے انتقال سے صرف چھ مہینے قبل شائع ہوا۔

۲۳ر نومبر ۱۹۷۳ء کو صبح کاماٹی پورہ میں اپنے مکان سے قریب چہل قدمی کے لیے نکلے تھے راستے ہی میں قلب پر حملہ ہوا اور اتنا شدید ہوا کہ وہیں گر پڑے اور انتقال ہو گیا۔ تدفین احاطہ درگاہ حضرت عبداللہ شاہ صدری گنج میں عمل میں آئی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر لگ بھگ پچاس سال تھی۔

تابؔ کے فرزند جناب جابر نے اپنے والد کی فوٹو اور "خامۂ دل" میرے حوالہ کرتے ہوئے جو تعاون کیا اس کا میں شکرگزار ہوں۔

نمونہ کلام

بہت دنوں سے ہیں بیگانہ صبح و شام سے ہم ؂ گزر رہے ہیں خدا جانے کس مقام سے ہم
یہ احتیاط کا عالم بھی کیا قیامت ہے ؂ پکار بھی نہ سکے تجھ کو تیرے نام سے ہم
کرو نہ ہم کو فراموش تم اجالوں میں ؂ تلاشِ صبح میں گم ہو گئے تھے شام سے ہم
نہیں نصیب میں نورِ سحر تو غم بھی نہیں ؂ مگر چراغ کی صورت جلے ہیں شام سے ہم
حاصلِ عمر محبت کا پیام آج بھی ہے! ؂ وجہ تسکینِ غمِ دل ترا نام آج بھی ہے
کبھی آنسو کا سہارا کبھی کعبے کا غلاف ؂ تیرے دیوانے کے دامن کا مقام آج بھی ہے
مسکراتا ہوں یہ انداز تصنع ہی سہی! ؂ میری نظروں میں تبسم کا مقام آج بھی ہے
عمر گزری ہے تری راہ میں چلتے چلتے! ؂ فاصلہ کتنا ہوا طے کبھی سوچا بھی نہیں
ان کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا پیمانہ ہے ؂ جن کو ساقی ابھی پینے کا سلیقہ بھی نہیں
اب تو ہر غم ہے مرے واسطے تحریکِ حیات ؂ ساتھ تو دے کہ نہ دے اب مجھے پروا بھی نہیں
کریں کرم نہ برائے کرم معاف کریں ؂ ہیں بے نیاز زمانے سے ہم معاف کریں
حضور حرف نہ آئے گا کج کلاہی پر ؂ نہ ہو سکے گی جبیں اپنی خم معاف کریں
رہِ حیات میں ممکن ہے چھوٹ جاؤں گا ؂ میں تھک گیا ہوں مرے ہم قدم معاف کریں

رباعی

(۱)

ان کے لیے عار نہیں ہوں یارب ؂ بندوں کا گنہ گار نہیں ہوں یارب
تقویٰ و عبادات سے ہوں دور بہت ؂ لیکن میں ریاکار نہیں ہوں یارب

تاباںؔ ـــــ شمس الدین (محمد عزیز اللہ)

تاریخ پیدائش: ۲۱ر اگست ۱۹۲۲ء ؛ تاریخ وفات: ۱۰ر اپریل ۱۹۸۵ء

محمد عزیز اللہ نام، شمس الدین کنیت اور تاباںؔ تخلص ۔ ۲۱ر اگست ۱۹۲۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے گو کہ ان کا آبائی وطن اورنگ آباد ہے ان کے والد جناب محمد نصیر الدین منصب دار تھے جب حضرت تاباںؔ چار ماہ کے تھے سایۂ سرپرستی سے محروم ہو گئے ان کی والدہ نے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری قبول کی۔ کم عمری ہی سے شاعری کی جانب راغب ہوئے پہلے تخلص شمیمؔ تھا پھر ضمیمؔ ہوئے اور حضرت صفیؔ نے شمس کی مناسبت سے تاباںؔ کر دیا۔ استاد کی نظرِ کرم اس شاگرد کی جانب زیادہ ہوتی ہے جو فرمانبردار ہو۔ حضرت تاباںؔ نے والد کی شفقت سے محروم ہونے پر استاد کے سایۂ شفقت میں پناہ ڈھونڈی وہ اپنے استاد سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ حضرت صفیؔ نے ابتدائی تعلیم کے لیے اپنے ہی شاگرد مولوی سید شاہ سجاد علی صوفیؔ کے سپرد کیا لیکن خداداد صلاحیتوں نے زیادہ عرصہ تک اس دائرہ تلمذی میں قید نہیں رکھا۔ پھر حضرت صفیؔ نے اپنی شاگردی میں لے لیا شعری اصلاح کے علاوہ اخلاقی تربیت سے بھی نوازا۔ حضرت تاباںؔ ایک خوش اخلاق منکسر المزاج، ملنسار، مخلص، ہمدرد، اقربا پرور، حساس اور بے لوث خدمت گزار ہونے کے علاوہ عاشق رسولؐ اور دیندار شخص تھے۔ مولوی جمیل الدین صاحب مرحوم سے قرآن و حدیث، توحید و رسالت کا علم حاصل کیا حضرت یحییٰ پاشاہ قبلہ حضرت عزیز اللہ شاہ قبلہ حضرت سید محی الدین قادری، حضرت عبید اللہ شاہ، حضرت انوار اللہ شاہ حضرت سید ابراہیم قبلہ اور حضرت مرداں شاہ صاحب کے فیضِ صحبت نے ان کے کلام میں تصوف کے رنگ کو ابھارا۔ عادات و اطوار، چال ڈھال، رہن سہن اور بول چال وغیرہ میں حضرت صفیؔ کی پیروی کرتے رہے بقول حضرت خواجہ شوقؔ نہ صدست

آزار نہ دشمن آزار سب کے لیے بے ضرر ہونا ہی اُن کی مقبولیت کا راز ہے"۔

۱۹۵۸ء میں نظام کالج سے فراغت پائی۔ وہ بڑے صابر، شاکر اور ذاکر انسان تھے۔ تغزل پر تصوف کا رنگ اور ذو معنویت مکتب صفی کی دین ہے اور ان کی شاعری کی پہچان بھی ۱۹۷۸ء میں مجموعہ کلام "زنجیرِ زنار" شائع ہو چکا ہے جسے ان کے فرزند رؤف رحیم نے مرتب کیا تھا۔ انھیں حضرت صفی اورنگ آبادی کے مکمل کلام کو شائع کرنے کی فکر تھی لیکن کئی مسائل حائل رہے۔ پھر بھی "گلزارِ صفی" کو اُن کے فرزند رؤف رحیم نے مرتب کیا اور حسامی بکڈپو نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ حضرت تاباںؔ نے فکر کو جذبہ کی آنچ میں تپا کر اپنی شاعری کو کندن بنا دیا تھا۔ وہ ہمیشہ صدارت اور استادی سے دامن بچاتے رہے پھر بھی باندھے پکڑے انھیں "علامہ" کے خطاب سے نوازا گیا۔ حضرت صفی کے خاص شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ غزل میں معیار، صحت زبان، فکر اور جذبہ کے امتزاج پر خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کی شاعری چار دہوں پر حاوی رہی۔ عشقِ رسولؐ کے باعث ان کا نعتیہ کلام اثر انگیز ہوا کرتا تھا۔ کلام پڑھنے کا انداز بھی متاثر کن تھا ترنم اور تحت میں اشعار کے رنگ میں ڈوب کر کلام سناتے تھے اُنھیں فن عروض پر دسترس حاصل تھی فارسی پر عبور حاصل تھا۔ "زنجیرِ زنار" میں اُن کی فارسی کی چند غزلیں موجود ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں محکمہ سیول سپلائز سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ پھر حضرت صفی اورنگ آبادی کے کلام کو جمع کرنے میں جٹ گئے مسلسل کاوشوں کے بعد انھیں حضرت صفی کا غیر مطبوعہ کلام حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی اور اپنے فرزند رؤف رحیم کو کلام صفی کی ترتیب کے لیے مقرر کیا اُن ہی کی رہنمائی میں "گلزارِ صفی" مرتب کی گئی نیز ابھی کئی اشعار اشاعت کے لیے تیار ہیں۔ رؤف رحیم ان ہی کی صحبت میں شاعری کی راہوں پر گامزن ہیں مزاحیہ شاعری کے علاوہ سنجیدہ شاعری میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں ان کا مجموعہ کلام "بساطِ دل" منظر عام پر آ چکا ہے اُن کے ایک اور فرزند یحییٰ جمیل بھی شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

حضرت تاباںؔ عرصہ دراز تک مختلف دواخانوں میں زیرِ علاج رہے عرصہ دراز کے مرضِ تنفس کو آخر کار کینسر کا نام دے دیا گیا۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۸۵ء کو یہ شمسِ ادب اپنی تابانی

لٹاتے لٹاتے ایسا غروب ہوا کہ پھر طلوع نہ ہو سکا لیکن ان کے اِنکا ایکی کرنوں سے آج بھی دُنیائے شعروسخن منور ہے۔ ۱۰راپریل ۸۵ء کو دواخانہ اسریٰ حیدرآباد میں دن کے ۲ بجے جب آفتاب اپنی آب وتاب دکھا رہا تھا حضرت تاباں نے داعی اجل کو لبیک کہا ۱۱راپریل کو مسجد چوک میں نماز جنازہ پڑھائی گئی جس میں ہزاروں وابستگانِ تاباں نے شرکت کی احاطہ درگاہ حضرت سید شاہ راجو محمد محمد الحسینیؒ قبلہ پسری گنج حیدرآباد میں سپردِ لحد کیا گیا۔ رؤف رحیم نے قطعہ تاریخ کو اس طرح پیش کیا ہے۔

تاباں کا قلب مخزنِ عشقِ رسول تھا ؛ جو عاشقِ رسول ہے وہ عاشق خدا
یارب دعا قبول ہو عاصی رحیم کی ؛ "زیب جنان حضرت تاباں" رہیں سدا
۱۹۸۵ء

نمونۂ کلام

مَیں آپ تھا جو تم سے گرا اور تُو ہوا ؛ میری انا کا قتل مرے روبرو ہوا
بس اک نہ اک حریف مرے درپہ ہوا ؛ تم مہرباں ہوئے تو زمانہ عدو ہوا
گردن میں دستِ ناز حمائل نہیں تو کیا ؛ لیکن جنوں کا طوق تو زیبِ گلو ہوا
ساری بہار اہلِ گلستاں نے لوٹ لی ؛ صَرفِ چمن تو صرف ہمارا لہو ہوا
چھوٹے جو ان کے غم سے تو دنیا کے غم ملے ؛ دامن ہی پھٹ گیا جو گریباں رفو ہوا

عزت سے جینا چاہو تو بے مدعا جیو
تاباں تو عرضِ حال سے بے آبرو ہوا

○

کعبہ، کنشت، دیر، کلیسا مدر سے بھی ؛ سب اُن کے راستے میں ہیں گزرو جدھر سے بھی
ڈرتے کہاں تھے یورشِ تیر و نظر سے بھی ؛ اب دل لرز رہا ہے غمِ مختصر سے بھی
وہ بولنے لگا ہے عدو کی زبان میں ؛ اب شک سا ہو رہا ہے مجھے نامہ بر سے بھی
اظہارِ غم بھی کر نہ سکے اُن کے روبرو ؛ حق بات لوگ کہتے رہے دار پر سے بھی
اک طرفہ دوستی تو کوئی دوستی نہیں ؛ سب کچھ تو ہے ادھر سے مگر کچھ اُدھر سے بھی

تاباں وقارِ عشق تھا ضبطِ الم کے ساتھ
آنسو گرے تو گر گئے اپنی نظر سے بھی

تبسم ـــــ سیّد افضل الدین غوری

ولادت: ۱۳؍ اکٹوبر ۱۹۲۲ء ٭ وفات: یکشنبہ ۱۹۷۸ء ۲؍ فروری

جناب سید افضل الدین غوری تبسم ولد سید مخدوم غوری مرحوم حضرت صفی کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد اولاً فوج میں ملازمت کی وہاں سے وظیفہ لینے کے بعد دواخانہ عثمانیہ میں اکونٹنٹ کی حیثیت سے کارگزار رہے (۲۵) سال تک مشقِ سخن جاری رہی مشاعروں میں غزل ترنم سے سنایا کرتے تھے ان کا کلام مقامی اخبارات روزنامہ سیاست اور روزنامہ انقلاب میں جو بمبئی سے نکلتا ہے لیکن حیدرآباد سے بند ہوچکا ہے، شائع ہوچکا ہے۔

موت بہرحال موت ہوتی ہے۔ مرنا ایک دن سب کو ہے لیکن تبسم غوری کی موت بڑی دردناک ہوئی۔ چہرے کے بائیں گال پر کینسر کا حملہ ہوا۔ ان کے ہی جسم کے مختلف حصوں سے گوشت نکال نکال کر گال میں پیوست کیا گیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوسکا۔ بالآخر بروز یکشنبہ ۱۹۷۸ء میں بڑی اذیت و کرب کے عالم میں انتقال ہوا۔ درگاہ حضرت یوسفین ؒ کے بازو ایک مسجد کے صحن میں دفن ہیں۔ ان کے فرزند نے تصویر عنایت کی۔ نمونہ کلام جو میرے پاس موجود تھا وہ قارئین کے نذر کیا جارہا ہے۔

(نمونہ کلام)

لاکھ بڑھ چڑھ کر کسی سے ہم رہے ۔۔۔ آپ کی نظروں میں پھر بھی کم رہے

تیرے کھلا کر اسیرِ غم رہے ۔۔۔ زندگی میں کب خوشی سے ہم رہے

عشق میں ہمت نہ ہاریں گے کبھی! ۔۔۔ سینۂ سوزاں میں جب تک دم رہے

ربط ان کے گیسوئے پُرخم سے ہے ۔۔۔ زندگی میں کیوں نہ پیچ و خم رہے

وہ عیادت کے لیے آئیں گے کب — وقتِ آخر جب لبوں پر دم رہے
جب ہوا میرے گناہوں کا شمار — اس کی رحمت کے مقابل کم رہے
بجھ نہیں سکتا چراغِ آرزو — لاکھ اس کی روشنی مدھم رہے
اے تبسم ان سے یہ پوچھے کوئی!
کس کی خاطر مشکلوں میں ہم رہے

نظر بڑھتی گئی میری جہاں تک — ترے جلوے نظر آئے وہاں تک
ہوگا نزولِ رحمتِ پروردگار دیکھ — مایوس ہونے والے ذرا انتظار دیکھ
اس کو برا کہیں گے بھلا کس زباں سے ہم — جس کے لیے برے ہوئے سارے جہاں سے ہم
نکالے کون اب طوفان سے کشتی — پڑی ہے فکر اپنی ناخدا کو
دل کا کیا حال ہو خدا جانے — پوچھ لیں وہ جو آرزو دل کی
کیا مرا حسنِ طلب اب بھی ہے محتاجِ سوال — کیا بنانی ہی پڑے گی صورتِ سائل مجھے
وعدہ پہ تو نہ آ کبھی بے وعدہ آ تو جا — جاتا رہے نہ دل سے مزہ انتظار کا
شاعری سے غرض تبسم کو!!
کام معنیٰ سے ہے نہ مطلب سے

○

انتخابِ کلامِ صفی

تعریف اور پھر میرے پروردگار کی — منہ میں زباں نہیں، میرے منہ میں زباں نہیں
الٰہی بند مٹھی کا بھرم رکھ لے قیامت میں — نہ کھلوا دشمنوں کے سامنے گٹھڑی گناہوں کی
کون سا آفت زدہ رہتا ہے کوچے میں ترے — شب کو اک آواز آتی ہے "الٰہی کیا کروں"
نہیں بھرتی طبیعت لاکھ دیکھو عمر بھر دیکھو — خدا کی شان ہے ایسے بھی ہوتے ہیں بشر دیکھو
اُسے دیکھا ہے جسکے دیکھنے کو لوگ ترستے ہیں — نظر بازو! ہماری بھی ذرا حدِ نظر دیکھو
دیر کافر تو مسلمان حرم دیکھتے ہیں — اس کا کیا نام ہے یا رب جسے ہم دیکھتے ہیں

تنویر — قاضی سید حامد علی

تاریخ پیدائش : ۱۲؍مارچ ۱۹۲۶ء

جناب تنویر نظامیہ حضرت الحاج مولوی سید اقبال علی قاضی شریعت پناہ تعلقہ دیگلور ضلع ناندیڑ کے فرزند ہیں۔ محلہ اسلامیہ ضلع نظام آباد میں ولادت ہوئی لیکن مستقر تعلقہ دیگلور ضلع ناندیڑ کے متوطن کہلاتے ہیں۔ مدرسہ فوقانیہ نظام آباد سے مڈل کا امتحان کامیاب کیا لیکن چونکہ قاضی گھرانے سے تعلق تھا اس لیے فارسی اور عربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدرسہ نظامیہ حیدرآباد میں داخل ہوئے اور مولوی ابتدائی منشی و منشی فاضل کے امتحانات کامیاب کئے۔ تعلیم سے فارغ ہوکر مدرسہ وسطانیہ مارائن کھیڑ میں بحیثیت مدرس ملازم ہوئے لیکن صرف ایک سال کے بعد استعفیٰ دے کر حیدرآباد آگئے اور چار مینار کے قریب "دارالعربیہ ہوٹل" کرایہ پر لے کر چلانے لگے۔ اس کے ساتھ ندیم مغربی اور ابن احمد تاب کی رفاقت میں ۱۹۵۳ء سے ایک ہفتہ وار "اُردو" شائع کیا جس کا دفتر مدینہ بلڈنگ میں تھا۔ اس سے قبل ۱۹۴۶ء میں جب کہ ان کی سکونت گھانسی بازار میں تھی عبدالرحمٰن رئیس مرحوم کے روزنامہ "وقت" میں تصحیح کا کام بھی کرچکے ہیں۔ اور ۱۹۴۷ء میں ایک ہفتہ وار "انجمن" بھی نکال چکے ہیں۔ ان دنوں مستقلاً تعلقہ دیگلور ضلع ناندیڑ میں قیام ہے اور وہیں قاضی شریعت پناہ و خطیب اہل سنت والجماعت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ شاعری سے ہٹ کر ان کی سماجی اور سیاسی خدمات بھی قابل ذکر ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

صدر : مولانا ابوالکلام آزاد ایجوکیشن سوسائٹی دیگلور

صدر : ادارۂ ادبیاتِ اُردو۔ حیدرآباد۔ شاخ دیگلور

صدر : مسلم فورم۔ تعلقہ دیگلور

صدر : سیرت کمیٹی دیگلور

نائب صدر : جنتا پارٹی ضلع ناندیڑ تعلقہ دیگلور

نائب صدر : انجمن ترقی اردو

رُکن : سرکاری امن کمیٹی دیگلور

رُکن : بلدیہ تعلقہ دیگلور

خطیب جامع مسجد و عیدگاہ دیگلور

کنسلٹنگ ایڈیٹر "آئینہ چشم" اردو ہفتہ وار حیدرآباد۔

جناب تنویر کو ابتداء میں حضرت حیدر پاشاہ حیدر جانشین علامہ ضامن کنتوری سے تلمذ حاصل تھا۔ پھر ان کی زندگی ہی میں یہ اپنے قریبی اور بے تکلف احباب ابن احمد تاب، اور ندیم مغربی کے ساتھ حضرت صفی اورنگ آبادی کے دورِ آخر کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے اور حضرت صفی کے انتقال تک ان سے وابستہ رہے۔ حیدرآباد میں رہنے تک کئی چھوٹے بڑے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ کئی اخبار و رسائل میں کلام بھی شائع ہوتا رہا ہے۔

جناب تنویر کا ہفتہ وار "انجمن" جب ضبط ہو گیا تو بہت سے ساز و سامان لیکر دفتر کا ایک اہلکار فرار ہو گیا۔ اس ساز و سامان میں ان کے کلام کی بیاض بھی تھی۔ اس کے بعد کا جتنا بھی کلام ہے اس کو "انوارِ سخن" کے نام سے ترتیب دیا جارہا ہے۔ اُمید ہے کہ بہت جلد منظر عام پر آجائے گا۔ اس مجموعہ میں (۵۰) غزلیں (۴۰) نعت شریف اور کئی قطعات، سلام، حمد، مناجات اور ترانے شامل ہیں۔

جناب تنویر دیگلور میں بہ پابندی مشاعرے منعقد کیا کرتے ہیں اور مہاراشٹرا کے مختلف علاقوں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔ جس کے باعث یہ مہاراشٹرا، ساتھ ہی ساتھ آندھرا پردیش میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔

﴿ نمونۂ کلام ﴾

پردہ اٹھا سکا نہ کوئی جس کے راز کا	میں ہوں نیاز مند اسی بے نیاز کا
بیماریٔ غرور سے محفوظ رکھ مجھے	یارب عطا مقام ہو عجز و نیاز کا

ثنائے فخرِ عالم جو کلام کبریا میں ہے
کہاں وہ شانِ مدحت اپنی فکرِ نارسا میں ہے

رسولِ پاک کا جب تک توسل التجا میں ہے
بڑا جذب قبولیت غلاموں کی دعا میں ہے

خدا کا مثل ہے کوئی نہ ثانی ہے محمدؐ کا
جواب ان لاجوابوں کا کہاں ارض و سما میں ہے

کرم فرما الٰہی خانہ جنگی سے بچا ہم کو
ترے محبوبؐ کی اُمت ابھی تک کربلا میں ہے

اک تبسم کی نوازش پہ مچل جاتا ہے
دل یہ دیوانہ ہے قابو سے نکل جاتا ہے

ہم غریبوں کی صداقت بھی ہے محتاج دلیل
ہر فریب آپ کا سرکاری ہے چل جاتا ہے

رہبروں کو علم ہے یہ راستے کھنچتے نہیں
قافلے کتنے لٹے ہیں منزلوں کے نام سے

خدا شاہد ہے کتنی آفتیں سہہ کر زمانے کی
میں کوشش کر رہا ہوں آپ کے نزدیک آنے کی

متاعِ غم بھی میری لوٹ لینا چاہتے ہو تم
سمجھتا ہوں سیاست میں تمہارے مسکرانے کی

شہیدِ غم کے ہونٹوں پر تبسم دیکھنے والو
محبت کا فسانہ اور کتنا مختصر ہوگا

مرحلہ دار حدِ موت سے ٹکراتا رہا
سخت جانی مری اللہ غنی کیسی ہے

کیوں نہ تنویر شگفتہ ہو مرا ذوقِ سخن !
خوشبوئے یار خیالوں میں بسی کیسی ہے

لپٹی ہوئی ہے آہ مری پائے عرش سے
بھڑکی کہاں یہ آگ اُٹھا ہے دھواں کہاں

پہلے یہ شعر ایسا تھا

پہنچی ہوئی ہے آہ مری بام عرش پر
بھڑکی کہاں یہ آگ اُٹھا ہے دھواں کہاں

حضرت صفی "پہنچی" کو "لپٹی" سے "بام" کو "پائے" سے اور "پر" کو "سے" سے بدل دیا۔ جس سے شعر کی شان ہی کچھ اور ہو گئی۔

فتنے اُٹھیں گے نہ اُٹھوائیے للہ مجھے
ہوں تو ذرہ ہی، مگر آپ کا پردہ میں ہوں

(صفی)

تہوّرؔ ـــــ صاحبزادہ میر محمّد علیخاں

تاریخ پیدائش : ۹ر جولائی ۱۹۰۸ء

صاحبزادہ میر محمّد علیخاں تہوّر فاروقی حضرت میر مصطفٰے علیخاں صوفی فاروقی مرحوم کے فرزند ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب خلیفہ دوم حضرت سیدنا عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ ان کے جدِ اعلیٰ حکیم غلام حسین خاں مرحوم بہ زمانہ غدر دہلی سے حیدرآباد آکر یہاں آباد ہوگئے ان کے دادا نے چونکہ صاحبزادہ فیروز علیخاں کے خاندان میں عقد کیا تھا اس لیے ننھیالی رشتے سے صاحبزادہ ہیں ٹرسٹ سے تنخواہ بھی پاتے ہیں۔

جمادی الثانی ۲۶ ۱۳ھ م ۹ر جولائی ۱۹۰۸ء میں دیوڑھی صاحبزادہ فیروز علیخاں میں ولادت عمل میں آئی۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد مدرسہ اعزہ میں داخل ہونا چاہا لیکن اخراجات حصول تعلیم کی عدم وصولی کے باعث شرکت نہ ہوسکی (اس زمانے میں تعلیمی اخراجات بھی صاحبزادوں کو ملا کرتے تھے) بالآخر خانگی ذرائع سے تعلیم حاصل کرکے صدر محاسبی صرفخاص واقع حویلی منجھلی بیگم میں اہل کار کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ صدر محاسبی کے انضمام کے بعد اس میں منتقل ہوئے اور وہیں سے وظیفہ حاصل کیا۔

حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے والد مرحوم پہلے ان ہی کے مکان میں کرایہ سے مقیم تھے۔ اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد جب حضرت صفیؔ سے مکان کے تخلیے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے خود ان سے کہیں مکان دلوانے کی درخواست کی جس پر ان کے والد مرحوم نے مولانا حافظ قاری عبدالرحیم مرحوم کا مکان موقوعہ مغل پورہ روبرو چھلّہ غریب نوازؒ دلوایا جہاں وہ تادمِ زیست مقیم رہے۔ حضرت صفیؔ کے انتقال کے بعد ان کی علاتی والدہ (حضرت اماں) بھی تادمِ آخر اسی مکان میں مقیم رہیں۔

صاحبزادہ تہوّر فاروقی اس وقت باصحت و بقیدِ حیات ہیں البتہ دنیا کو

اتنا زیادہ دیکھ لیا کہ بینائی تھک گئی اور آنکھوں سے غائب ہوگئی۔

صاحبزادہ تہور فاروقی حضرت صفیؔ کے دورِ اول کے حلقۂ تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کا رجحانِ شعری صرف نعت اور منقبت کی طرف رہا ہے۔

(نمونۂ کلام)

اسے دیدار ہو کیونکر خدا کا — نہ دیکھا جس نے چہرہ مصطفےٰ کا

سامنا مجھ کو خدا اور مصطفےٰ کا ہو گیا — دل مرا کعبہ بنا دیدہ مدینہ ہو گیا

نظر میں دل میں سینے میں ہے جلوہ غوث اعظمؒ کا — سراپا ہے مرا آئینہ خانہ غوث اعظمؒ کا

ہے لاکھ لاکھ شکر یہ ربِّ قدیر کا — بندہ بنا دیا مجھے پیرانِ پیر کا

صاحبزادہ تہور فاروقی نے میرے مطالبہ پر حالات، نمونۂ کلام اور تصویر مرحمت فرمائی جس کے لیے میں مشکور ہوں۔

صفیؔ کے ضرب الامثال

صفیؔ کو شاعری سے مل گئی ہر دل عزیزی بھی — دروغِ مصلحت آمیز بھی ہے کیا ہنر دیکھو

کسی کو کوئی کیا دے گا کسی سے کوئی کیا لے گا — صفیؔ ہم تو حسابِ دوستاں در دل سمجھتے ہیں

محفل میں حال کہہ نہ سکا میں حجاب سے — یہ پوچھنا تو مفت کرم داشتن ہوا

فرطِ ایذائے زمانہ ہے عروجِ موذی — سانپ کو پر جو نکل آئیں تو اڑ کر کاٹے

بے ذائقہ ہیں جور و ستم آسمان کے — پکوان پھیکے نکلے اس اونچی دکان کے

بلا سے داغِ محبت تری محبت میں! — سلامتی چراغاں فقیر کو پہنچا

جب تک ہے جگر میں خون رو لے — بہتی گنگا ہے ہاتھ دھو لے

اے دل غمِ عشق میں جلا کر — بے کار مباش کچھ تو کیا کر

کون گائے تری غزل کو صفیؔ — جس کا کھاتے ہیں اس کی گاتے ہیں

ثاقب ــــــ صاحبزادہ خواجہ سعادت اللہ خاں

تاریخ پیدائش: ۱۹۲۷ء ٭ تاریخ وفات: یکم اگست ۱۹۷۱ء

صاحبزادہ خواجہ سعادت اللہ خاں ثاقب خلف صاحبزادہ خواجہ احسن اللہ خاں مرحوم نبیرۂ نواب منصور جنگ مرحوم ۱۹۲۷ء میں بمقام مغل پورہ پیدا ہوئے۔ نواب مظفر جنگ مرحوم کے نواسے تھے۔ جاگردار کالج سے میٹرک کامیاب کیا اور عدالت خفیہ بلدہ میں یوڈی سی کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔

حضرت صفی اورنگ آبادی کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ جناب ثاقب بچپن سے ہی شعر فہم تھے اور اس شعر فہمی نے انھیں شاعر بنادیا۔ علمی و ادبی محفلوں میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ مشاعروں میں تحت اللفظ کلام سناتے تھے۔ بزم سخن سرور نگر کے مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے اور بزم کی جانب سے شائع ہونے والے گلدستوں میں ان کا کلام شائع ہوچکا ہے۔

حضرت صفی سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ انتقال کے وقت یہ بھی دواخانہ عثمانیہ میں حضرت صفی کے ساتھ رہے! افسوس کہ آسمان ادب پر ثاقب نمودار ضرور ہوا، تھوڑا بہت چمکا بھی لیکن اچانک صرف (۴۴) سال کی عمر میں ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ان کی تدفین آبائی قبرستان مقبرہ رفیع الدولہ واقع نام پلی میں عمل میں آئی۔

(نمونہ کلام)

رنجیدہ آپ کیوں ہوئے ثاقب کی بات پر
اس کے دماغ میں ہے خلل جانے دیجیئے

اے حضرت دل آج نئی بات سوچیئے
جو ہوگیا سو ہوگیا کل جانے دیجیئے

آتا ہے کوئی حرف جہاں آن بان پر!
خود دار جھیلتے ہیں اُسے اپنی جان پر

ثاقب خدا کے ہاتھ میں اب میری لاج ہے
وہ تو تُلے ہوئے ہیں مرے امتحان پر

جوانی میں سنور کر حسن والے جب نکلتے ہیں
کہاں دل گوشت کے ٹکڑے سے پہاڑ پتھر پگھلتے ہیں

خرامِ ناز سے ہر دم نئے فتنے نکلتے ہیں!!
نہ جانے فتنہ گر یہ کون سے سانچے میں ڈھلتے ہیں

خدا رکھے حسینوں کو تصدق میں حسینوں کے
ہزاروں دل تڑپتے ہیں تو لاکھوں دل بہلتے ہیں

ہماری پیٹھ ہی ہم کو نظر آتی نہیں ثاقب
کسی کی کیا ہمیں اچھی بُری معلوم ہوتی ہے

اس میں بھی ثاقب کی کوئی چال ہے!
کون خوش ہوتا ہے اپنی ہار سے

کہتا ہوں میں کچھ اور سمجھتا ہے تو کچھ اور
یوں بات کے نکال نہ پہلو ہزار دیکھ

(حضرت صفی کی موت پر)

السلام اے ماہرِ شعر و سخن
السلام اے تاجدارِ علم و فن

رو رہا ہے موت پر تیری وطن
علم و فن سے ہو گیا خالی دکن

اب کہاں ڈھونڈوں زباں کی سادگی
اب کہاں وہ شاعری کا بانکپن!

تھی بہار اُردو کی تیرے دم کے ساتھ
بار آور تھا صفی تجھ سے چمن

○

اُستاد اور شاگرد

ہر ہنر خدمتِ استاد سے آتا ہے صفی
لیکن اس بات میں شاگرد بھی استاد رہے

صفی، جب باپ، کا استاد کا رتبہ برابر ہے
مرے کیا حضرتِ کیفی کہ سایہ اٹھ گیا سر سے

صفی استاد بننا ہے تو استادانِ عالم کی
اٹھاؤ جوتیاں تازہ کرو جتنے پھرو چلیں

اُٹھ گئی ہائے عجب فرد زمانے سے صفی
آدمی حضرتِ کیفی سے بھی کم دیکھتے ہیں

جاویدؔ — پیرزادہ سید غوث محی الدین قادری

تاریخ پیدائش: ۲۱ر جون ۱۹۲۷ء

پیرزادہ سید غوث محی الدین قادری (جاویدؔ قادری) حضرت سید شاہ یوسف الدین قادری ایڈیٹر ماہنامہ "ارشاد" کے فرزند ہیں۔ دیوڑھی فیروز یار جنگ واقع چیلہ پورہ حیدرآباد میں ۲۱ر جون ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب کئی واسطوں سے حضرت غوث آعظم دستگیرؒ سے ملتا ہے۔ مدرسۂ دارالعلوم سے میٹرک کامیاب کیا۔ اس کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے ایم اے بی ایڈ اور پی ایڈ کامیاب کیا۔ ابتداً مدرسہ دارالعلوم ہی میں ملازمت اختیار کی اور اپنا تعلیمی سلسلہ بھی جاری رکھا۔ پرانے شہر میں تعلیمی پسماندگی کو دیکھ کر قوم و ملت کی خدمت کا خیال پیدا ہوا تو ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مغلپورہ میں "جاوید ماڈل اسکول" اور "جاوید ٹیوٹوریل کالج کی بنیاد ڈالی۔ جو اس وقت پورے زور و شور سے کارکرد ہیں۔ اسی اسکول اور کالج کی آمدنی ان کا ذریعہ معاش ہے۔ والد محترم کے انتقال کے بعد ماہنامہ ارشاد کی ادارت سنبھال کر کئی برسوں تک یہ ماہنامہ نکالتے رہے ہیں۔ چونکہ مولوی عبدالرب کوکب مُدیر ماہنامہ اتالیق اور مولوی عبدالوہاب عندلیب مُدیر رسالہ "واعظ" ان کے ماموں اور نانا تھے اور وہ شاعر تھے اس لیے ننھیال سے ان کو ذوقِ شاعری ملا، اور طالب علمی کے زمانے سے شعر کہنے لگے۔ حسنِ اتفاق سے یہ مغل پورہ میں واقع اس مکان میں رہتے تھے جو حضرت صفیؔ کے مکان کے روبرو واقع تھا۔ اس قربت نے اِنھیں حضرت صفیؔ سے تلمذ اختیار کرنے میں مدد دی اور وہ ان کے دورِ وسطیٰ کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔

جناب جاوید قادری کا میلان طبع غزل کی طرف زیادہ ہے۔ شعر اچھے اور سلجھے ہوئے کہتے ہیں۔ مختلف اخبار و رسائل میں کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام

کا نام حضرت صفی نے "جاودانی" تجویز کیا تھا۔ جو اسی نام سے زیر طبع ہے۔

نمونہ کلام

پھول کیا شئے ہے کیوں وہ پیارا ہے
آپ کے رخ سے استعارا ہے

مجھ پہ وہ یوں عتاب کرتے ہیں
جیسے کارِ ثواب کرتے ہیں

ایسے جینے سے فائدہ اے خضر
کام تھوڑے سے کئے قیام بہت

ان کے چہرے پہ جو کھلتی ہے حیا کی سرخی
سامنے پانی بھرے اسکے حنا کی سرخی

اللہ کے سوائے کسی پر نظر نہیں
سائل ہوں میں تو سب سے بڑی بارگاہ کا

ابلیس کو پھر راستہ جنّت کا دکھا دو
دنیا کی تباہی کو تو انسان بہت ہے

الٰہی بھیج جنّت میں اسی محبوب بندی کو
لگائیں حور سے کیا دل وہ کوئی اجنبی ہوگی

یوں تو گلشن میں سبھی دوست ہیں اپنے جاوید
کون مخبر ہے جو بجلی کو پتا دیتا ہے

زاہد و تم کو ریا کاری مبارک لیکن
دل کے اک کونے میں ایمان پڑا رہنے دو

رونقِ خانقاہ کی خاطر
رب سے بندے کو مت جدا کیجئے

ہیں ہر اک شئے سے ہزاروں ترے جلوے ظاہر
اور ہر جلوہ سے ظاہر تری یکتائی ہے

وفا کے اشک سے لبریز دل کی آنکھوں سے
غمِ حسینؓ میں جتنا بھی روئیے کم ہے

خود بھی شہید اور دو فرزند بھی شہید
تنہا خصوصیت ہے یہ حضرت علیؓ کے ساتھ

اسی کے فیض نے مجھکو کیا ہے زندہ جاوید
نہ کیوں یاد نبیؐ میں آنکھ دریا بار ہو جائے

خوب سمجھا دیا تھپیڑوں نے
نا خدا کیا ہے اور خدا کیا ہے

جلوہ تمہارا قلب حزیں میں بسا لیا
سینے کو اپنے وادیٔ سینا بنا لیا

صفی کو سب اچھا سمجھنے لگے
زمانہ یہ کیسا برا آگیا

جعفر ـــــ رحیم الدین حسین خان

حضرت جعفر مرحوم حضرت صفی کے دور اول کے تلامذہ میں سے ہیں۔ حیدرآباد ہی میں کوتوالِ شہر جناب لال خاں کے گھر بڑی تمناؤں کے بعد پیدا ہوئے اور مدرسے میں داخل ہونے تک اپنی والدہ سے دینی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد نصابی تعلیم کی تکمیل کر کے محکمہ پولیس میں ملازمت اختیار کی۔ اپنے والد کی طرح کوتوال شہر تو نہ ہوئے لیکن خون کے اثر کے تحت اسی دبدبے سے ملازمت کی اور وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

حضرت جعفر کا نہ تو سنہ پیدائش ہی معلوم ہو سکا اور نہ سنہ وفات بس دنیا میں آئے، شان سے زندگی گزاری اور کسی کو اپنی عمر بتائے بغیر خاموشی سے اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔ اولاد نرینہ نہیں تھی۔ صرف دو لڑکیاں تھیں جن کا پتہ معلوم نہ ہو سکا۔

شعر بہت کم کہتے تھے البتہ مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے چاہے طرح میں غزل ہو کہ نہ ہو۔ حضرت صفی سے بہت مانوس تھے اور جب تک ان سے مل نہ لیتے گھر واپس نہیں ہوتے تھے۔ ان کا ذخیرہ کلام بہت کم ہے اور وہ بھی دستیاب نہیں ہے جو کچھ اِدھر اُدھر سے فراہم ہو سکا وہ نمونہ کلام کے طور پر پیش ہے ؎

نظر ملی بھی کسی سے خیال ہے اِتنا
پھر اس کے بعد کسی بات کا خیال نہیں

کہیں کسی پہ وہ افشائے راز کرتے ہیں
تمہارے چاہنے والوں کی یہ مجال نہیں

تمہارے حسن کے ارض و سما میں ہیں چرچے
وہ تم حسین ہو جس کی کہیں مثال نہیں

خوشی سے موت بھی جعفر کو اب گوارا ہے
بقیدِ زیست میسّر اگر وصال نہیں

میرے مالک دم میں جب تک دم رہے — لب پہ تیرا نام ہی پیہم رہے
کیسے حاصل ہو سکونِ زندگی — جب نظامِ زندگی برہم رہے
اک نہ اک دن جان پر بن جائے گی — دردِ دل کا گر یہی عالم رہے
یوں تو اچھے وقت کے ساتھی ہیں سب — دوست وہ ہے جو شریکِ غم رہے
کیا بتاؤں میں کسی کی یاد میں — سامنے کیا کیا مرے عالم رہے
کچھ تڑپنے کے مزے مل جائیں گے — دردِ دل جعفر اگر پیہم رہے

اپنا بنا کے اور بھی دیوانہ کر دیا — میں جان و دل سے ہو گیا ان پر نثار آج
جعفر نہیں ہے دل میں اگر کوئی جاگزیں — پھر کون کر رہا ہے مجھے بیقرار آج

حضرت صفی کے بارے میں:-

صفی مرحوم حیدر آباد کی قدیم تہذیب کا مکمل نمونہ تھے۔ شرافت نفس اور خودداری ان کی فطرت کے نمایاں جوہر تھے۔ بڑے یار باش اور دوستوں کے دل دادہ تھے آداب مجلس کا ان کو بڑا خیال رہتا تھا کبھی ایسی کوئی بات نہ کرتے جس سے دوسروں کو دکھ پہونچے۔ شیخی اور   سے انھیں نفرت تھی۔ اپنے ہم عمروں حتیٰ کہ نوجوان شاعروں کے اچھے اشعار کی دل کھول کر داد دیتے۔ رشک و حسد کو وہ گناہ عظیم سمجھتے تھے۔ ہر نئے ملنے والے سے وہ خندہ پیشانی سے ملتے۔ ان کی گفتگو کا انداز بھی عجیب تھا مختصر الفاظ میں اپنا مطلب ادا کر کے بات کو فوراً ختم کر دیتے تھے۔

صفی اورنگ آبادی پر ایک سرسری نظر۔
پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد
ماہنامہ سب رس صفی نمبر

جمیل — تراب علی

جناب تراب علی جمیل مرحوم حیدرآباد کے متوطن تھے۔ جامعہ نظامیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ شاعری کا ذوق کب سے تھا اور حضرت صفی سے کب تلمذ حاصل کیا۔ اس کی تفصیل ان کی تاریخ پیدائش و انتقال کی طرح دستیاب نہیں ہوسکی۔ چونکہ حضرت صفی خود نوشتہ فہرست "تلامذہ" میں ان کا نام موجود ہے اس لیے اندازاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان کے دورِ وسطیٰ کے "تلامذہ" میں سے ہونگے۔ مشاعروں میں شرکت کرنے کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ مشاعروں کے گلدستوں میں ان کا کلام ملتا ہے۔

(نمونۂ کلام)

ہے یہ دہشت کہیں امروز نہ فردا ہوجائے
ورنہ فردا کی نہیں نام کو دہشت دل میں

آپ کے جاتے ہی اندھیر سا چھا جاتا ہے
آپ کے آتے ہی آجاتی ہے ہمت دل میں

رنج ہے درد ہے سوزش ہے خلش ہے پیہم
کیا کہوں کس سے کہوں کیا ہے مصیبت دل میں

○

جوہرؔ ــــ الحاج میر بہادر علی

تاریخ پیدائش: ۷ر شعبان ۱۳۲۲ھ تاریخ وفات: ۱۲ر ڈسمبر ۱۹۷۱ء

حضرت میر بہادر علی جوہرؔ حضرت میر لیاقت علی سیفؔ مہتمم خزانہ پائیگاہ نواب معین الدولہ بہادر کے دوسرے فرزند تھے ۷ر شعبان ۱۳۲۲ھ کو محلہ چوک اسپان شاہ علی بنڈہ حیدرآباد میں ولادت عمل میں آئی۔ منشی فاضل کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی۔ پولیس ایکشن کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوگئے اور معین الدولہ بہادر کے دوسرے صاحبزادے نواب مظہر الدین خان بہادر کے اسٹیٹ سمستان نارائن پور میں بہ حیثیت معتمد کام انجام دیتے رہے۔

ذوق شاعری موروثی تھا۔ بچپن ہی سے نہایت چست شعر کہا کرتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی میر یاور علی خنجرؔ کی ہدایت پر حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے آگے زانوئے ادب تہہ کئے اور ان کے دورِ اول کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ بے حد پرگو اور زود گو شاعر تھے شاعری کے آغاز سے مسلسل ۴۲ سال تک بڑے دبدبے کے ساتھ شعر کہتے رہے۔ بے شمار مشاعروں میں شرکت کی۔ اکثر مقامی روزناموں اور ماہناموں میں کلام بھی شائع ہوا ہے۔ حضرت صفیؔ کی زندگی میں جو بزم تلامذہ قائم ہوئی تھی اس کے تادمِ آخر صدر رہے۔ زندگی مجرد گزاری، بڑے خلیق اور شریف الطبع انسان تھے ۱۹۶۵ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ ماہ شعبان ۱۳۹۱ھ میں فالج کا حملہ ہوا اور دو ماہ دواخانہ چارمینار میں زیرِ علاج رہ کر ۲۳ر شوال ۱۳۹۱ھ م ۱۲ر ڈسمبر ۱۹۷۱ء کو انتقال کر گئے۔ تدفین ان کے بھائی میر احمد علی پیکاںؔ مرحوم کے بازو قادری چمن کے روبرو تکیہ حیال بی میں عمل میں آئی۔ قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر ان ہی کا کہا ہوا قطعہ کندہ ہے۔ ؎

قطعہ

اشرف المخلوق کا بخشا شرف!
خاک کے پتلے کو کیا سے کیا کیا!
میرا منشا میری مرضی کچھ نہ تھی!
اپنا منشا آپ نے پورا کیا!

جناب پیکاں کے فرزند میر راحت علی صاحب نے تصویر اور مجموعہ کلام عنایت کیا۔ میں ان کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نمونہ کلام

میں ان کا چاہنے والا ضرور ہوں جوہر — مگر زبان سے کہوں یہ میری مجال نہیں
دیکھتے ہیں مجھے وہ مڑ مڑ کر — اپنے سائے سے ڈر گئے شاید
سیر کو تم اکیلے نکلے ہو — چاہنے والے مر گئے شاید
سانس آنے لگی ہے رک رک کر — داغ دل کے ابھر گئے شاید
دیا ہے عشق جسے پھر اسے ملال نہ دے — عروج دے کے کسی کو خدا زوال نہ دے
شمار اشک دم اضطراب ہو نہ سکا — ستاروں کا تو کسی سے حساب ہو نہ سکا
یا تیری شوخیوں کا اثر اس میں آ گیا — یا بجلیاں بھری ہیں دلِ بیقرار میں
جو دیکھتے ہیں کہہ نہیں سکتے زبان سے — نیرنگیٔ زمانہ بھی گونگے کا خواب ہے
دہرائی میری بات کچھ اس طرح آپ نے — گویا میرا سوال ہی میرا جواب ہے
محبت میں سکونِ دل میسّر ہو نہیں سکتا — میں جتنا غور کرتا ہوں یہی محسوس کرتا ہوں
غصے میں ان سے عرض تمنّا جناب دل — دریا چڑھاؤ پر ہے اتر جانے دیجئے
قبر میں کہاں راحت ہے زمین بھی سر پہ — اور بڑھ گیا گویا ایک آسماں اپنا
کیا بات ہے مزاج میں کچھ برہمی سی ہے — کیوں خیر تو ہے آج طبیعت کو کیا ہوا
باتوں باتوں میں بگڑ جانا بھی آتا ہے انھیں — اور پھر ہنس کر ملا لینا بھی ان کو یاد ہے
منہ پہ نقاب ڈال کر سرکار آپ نے — محروم کر دیا مری آنکھوں کو نور سے

غم جنوں سے زیادہ ہیں طعنہ ہائے جنوں
یہ دل میں چبھنے کے کانٹے نہ تھے بیاباں میں

توڑنا مبارک ہو دل نیازمندوں کا
اب لئے پھرو سر پہ سنگِ آستاں اپنا

زخم ہی نہیں کافی دل کو داغ بھی دیجئے
داشتہ بکار آید اور اک نشاں اپنا

وصل گر نہیں ممکن کاٹ آہ و زاری میں!
دیکھ کر نہ اے جوہر وقت رائگاں اپنا

گزرے جو مجھ پہ آپ گزر جانے دیجئے
بے آس جی کے کیا کروں مر جانے دیجئے

آ ہی گئے ہیں آپ تو اِتنا بھی ہو کرم
دم بھر ہنسی خوشی سے گزر جانے دیجئے

عاشق کا دل ابھی سے نہ کیجئے ملاحظہ
تھوڑے سے داغ اور ابھر جانے دیجئے

دیکھیئے گزارہ ہو کس طرح کہاں اپنا
دشمن اِفترا پیشہ دوست بدگماں اپنا

ان کی نظر کے کھیل عجب ہیں!
چوٹ کہیں ہے درد کہیں ہے

اترے گی میری بات ہر اک دل میں کس طرح
تیری نظر کا میری زباں میں اثر نہیں

ساقی کے انتظام کے قربان جائیے
دیکھو تو کوئی چیز ادھر کی اُدھر نہیں

حضرت صفی کے تلامذہ میں یہ خصوصیت صرف حضرت جوہر کو حاصل تھی کہ وہ حضرت صفی کے رنگ سے اتنے متاثر تھے کہ ان کے ہی رنگ میں ڈوب کر شعر کہتے تھے، اور اتنا ڈوب کر کہ اکثر ان کے کلام پر حضرت صفی کے کلام کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

حضرت صفی کے بارے میں :-

صفی کا غزل گوئی میں بلند تر مقام ہے ؎

غزل میں صنف سخن میں وجود ہے جب تک
رہے گا یاد ہر اک کو دکن میں نام صفی

بیابات
پنڈت راگھونیدر راؤ جذب عالمپوری
سب رس۔ صفی نمبر

حامد ــــ احمد بن سعید (مسمار)

تاریخ وفات ۱۳۴۶ھ

حضرت احمد بن سعید حامد مرحوم قبیلہ مسمار سے تعلق رکھتے تھے۔ حیدرآباد کے ایک مضافاتی علاقہ بارکس میں پیدا ہوئے اور صرفخاص میں ملازم تھے۔ یہ حیدرآباد کے ایک مشہور شاعر ابن احمد تاب کے والد تھے۔ ابتداءً حضرت کیفی مرحوم سے تلمذ اختیار کیا جس کا ذکر محمد سردار علی مرحوم مولف یورپین شعراء اردو "تذکرۂ شعرائے اورنگ آباد" نے اپنی تالیف "تصویر افکار" میں جو ۱۳۴۶ھ میں شائع ہوئی" کیا ہے

حضرت حامد مولوی خیر المبین (نبی خانہ) کے مرید تھے اور اپنے پیر و مرشد خیر المبین کے مواعظ سے متعلق ایک کتاب "صداقت الاسلام" مرتب وطبع کرواکر نبی خانہ میں شرکائے محفل وعظ میں تقسیم کی ہے

شاعری کا ذوق ماحول کا پیدا کردہ تھا لیکن حضرت کیفی اور ان کے بعد حضرت صفی کی صحبت و تلمذ نے اس میں آمد کا رنگ بھر دیا اس لیے بڑے سلجھے ہوئے شعر کہتے تھے۔ حضرت صفی کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں سے تھے۔ عمر بہت کم پائی یعنی (۲۸) سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ تدفین احاطہ درگاہ حضرت پیر مومن رحمۃ چپ علی آباد میں ہوئی۔ سعی بسیار کے باوجود تاریخ پیدائش معلوم نہ ہوسکی اور نہ کوئی تصویر ہی دستیاب ہوسکی۔ انتقال ۱۳۴۶ھ میں کیا۔ چند شعر جو بمشکل دستیاب ہوسکے نمونہ کلام کے طور پر پیش ہیں۔

(نمونہ کلام)

نہ نکلیں اشک اے دل زیرِ خنجر دیدۂ تر سے
شہادت تو اسی کی ہے جو پانی کیلئے ترسے

کم از کم مے کشو اتنا اثر پیدا تو ہو تم میں
جہاں آئے خیال مے کشی بارش وہیں برسے

خدا کی شان دیکھو جرم اظہارِ محبت پر
گلا کٹتا ہے کس کا میرا، کس کے تیر خنجر سے

پیار کی باتیں کرو کچھ ڈھب نکالو پیار کا
چار سے ملنا ہو تو سیکھو طریقہ چار کا

ساقی بنے اگر تو وہ انقلاب ہوگا
مٹے پانی پانی ہوگی پانی شراب ہوگا!

جب دیکھنے کے قابل تیرا شباب ہوگا
خود تجھکو اے ستمگر تجھ سے حجاب ہوگا

حضرت صفی کے بارے میں :-

باقاعدہ بیٹھ کر خطوط نویسی نہیں کی۔ جو کچھ لکھا قلم برداشتہ ہی لکھا جس طرح کلام میں سلاست و روانی ہے۔ سادگی ہے روزمرہ اور محاورات کا برمحل استعمال ہے دادئی کسک ہے بذلہ سنجی اور خوش طبعی ہے اس کے علاوہ طرز بیان کی دل کشی اور ان کا اپنا ایک خاص لب و لہجہ ایسی ہی خوبیاں ہیں ان کی نثر میں ملتی ہیں ایک خط میں وہ خود فرماتے ہیں " ارمان ہے کہ میرے خط بھی غزلوں کی طرح چٹپٹے ہوا کریں ان کو پڑھنے والے مزے لے لے کر پڑھا کریں " حکیم عبدالقادر کو اپنی بیماری کی کیفیت لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ حکیم صاحب کیفیت کی چھوٹوں پر نسخہ تجویز کرتے تھے۔ اور اِسی کے ساتھ بعض وقت صفی کی شگفتہ بیانی اور ان کی معلومات سے متاثر ہو کر بڑے تعریفی کلمات لکھ بھیجتے تھے۔ ملاحظہ ہو:

آپ کی نادر بیانی۔ دیدہ زیب خوش خطی نکات ، بعض بعض خاص استفسارات کو میں اپنے قلم سے ادا نہیں کر سکتا "

خطوط
سوانح عمری صفی اورنگ آبادی
محمد نور الدین خان

ثنائے فخرِ عالم جو کلام کبریا میں ہے
کہاں وہ شانِ مدحت اپنی فکرِ نارسا میں ہے

رسولِ پاک کا جب تک توسل التجا میں ہے
بڑا جذب قبولیت غلاموں کی دعا میں ہے

خدا کا مثل ہے کوئی نہ ثانی ہے محمد کا
جواب ان لاجوابوں کا کہاں ارض و سما میں ہے

کرم فرما الٰہی خانہ جنگی سے بچا ہم کو
ترے محبوب کی امت ابھی تک کربلا میں ہے

اک تبسم کی نوازش پہ مچل جاتا ہے
دل یہ دیوانہ ہے قابو سے نکل جاتا ہے

ہم غریبوں کی صداقت بھی ہے محتاج دلیل
ہر فریب آپ کا سرکاری ہے چل جاتا ہے

رہبر دل کو علم ہے یہ راستے کہتے نہیں
قافلے کتنے لٹے ہیں منزلوں کے نام سے

خدا شاہد ہے کتنی آفتیں سہہ کر زمانے کی
میں کوشش کر رہا ہوں آپ کے نزدیک آنے کی

متاعِ غم بھی میری لوٹ لینا چاہتے ہو تم
سمجھتا ہوں سیاست میں تمہارے مسکرانے کی

شہیدِ غم کے ہونٹوں پر تبسم دیکھنے والو
محبت کا فسانہ اور کتنا مختصر ہوگا

مرحلہ دار حادثوں سے ٹکراتا رہا
سخت جانی مری اللہ غنی کیسی ہے

کیوں نہ تنویر شگفتہ ہو مرا ذوقِ سخن!
خوشبوئے یار خیالوں میں بسی کیسی ہے

لپٹی ہوئی ہے آہ مری پائے عرش سے
بھڑکی کہاں یہ آگ اٹھا ہے دھواں کہاں

پہلے یہ شعر ایسا تھا ۔

پہنچی ہوئی ہے آہ مری بامِ عرش پر
بھڑکی کہاں یہ آگ اٹھا ہے دھواں کہاں

حضرت صفی "پہنچی" کو "لپٹی" سے "بام" کو "پائے" سے اور "پر" کو "سے" سے بدل دیا۔ جس سے شعر کی شان ہی کچھ اور ہو گئی۔

قلتے اٹھیں گے نہ اٹھوائیے للہ مجھے
ہوں تو در پر ہی، مگر آپ کا پردہ ہی ہوں
(صفی)

صدر : سیرت کمیٹی دیگلور
نائب صدر : جنتا پارٹی ضلع ناندیڑ تعلقہ دیگلور
نائب صدر : انجمن ترقی اردو
رکن : سرکاری امن کمیٹی دیگلور
رکن : بلدیہ تعلقہ دیگلور
خطیب جامع مسجد و عیدگاہ دیگلور
کنسلٹنگ ایڈیٹر "آئینہ چشم" اردو ہفتہ وار حیدر آباد۔

جناب تنویر کو ابتداء میں حضرت حیدر پاشاہ حیدر جانشین علامہ ضامن کنتوری سے تلمذ حاصل تھا۔ پھر ان کی زندگی ہی میں یہ اپنے قریبی اور بے تکلف احباب ابن احمد تاب، اور ندیم مغربی کے ساتھ حضرت صفی اورنگ آبادی کے دورِ آخر کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے اور حضرت صفی کے انتقال تک ان سے وابستہ رہے۔ حیدر آباد میں رہنے تک کئی چھوٹے بڑے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ کئی اخبار و رسائل میں کلام بھی شائع ہوتا رہا ہے۔

جناب تنویر کا ہفتہ وار "انجمن" جب ضبط ہوگیا تو بہت سے ساز و سامان لیکر دفتر کا ایک اہلکار فرار ہوگیا۔ اس ساز و سامان میں ان کے کلام کی بیاض بھی تھی اس کے بعد کا جتنا بھی کلام ہے اس کو "انوارِ سخن" کے نام سے ترتیب دیا جارہا ہے امید ہے کہ بہت جلد منظر عام پر آجائے گا۔ اس مجموعہ میں (۵۰) غزلیں (۴۰) نعت شریف اور کئی قطعات، سلام، حمد، مناجات اور ترانے شامل ہیں۔

جناب تنویر دیگلور میں بہ پابندی مشاعرے منعقد کیا کرتے ہیں اور مہاراشٹرا کے مختلف علاقوں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔ جس کے باعث یہ مہاراشٹرا، ساتھ ہی ساتھ آندھرا پردیش میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔

(نمونہ کلام)

پردہ اٹھا سکا نہ کوئی جس کے راز کا	میں ہوں نیاز مند اسی بے نیاز کا
بیماریٔ غرور سے محفوظ رکھ مجھے	یارب عطا مقام ہو عجز و نیاز کا

تہور — صاحبزادہ میر محمد علیخاں

تاریخ پیدائش: ۹ر جولائی ۱۹۰۸ء

صاحبزادہ میر محمد علیخاں تہور فاروقی حضرت میر مصطفےٰ علیخاں صوفی فاروقی مرحوم کے فرزند ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب خلیفہ دوم حضرت سیدنا عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ ان کے جد اعلیٰ حکیم غلام حسین خاں مرحوم بہ زمانہ غدر دہلی سے حیدرآباد آکر یہاں آباد ہوگئے ان کے دادا نے چونکہ صاحبزادہ فیروز علیخاں کے خاندان میں عقد کیا تھا اس لیے ننھیالی رشتے سے صاحبزادہ ہیں ٹرسٹ سے تنخواہ بھی پاتے ہیں۔

جمادی الثانی ۱۳۲۶ھ م ۹ر جولائی ۱۹۰۸ میں دیوڑھی صاحبزادہ فیروز علیخاں میں ولادت عمل میں آئی۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد مدرسہ اعزہ میں داخل ہونا چاہا لیکن اخراجات حصول تعلیم کی عدم وصولی کے باعث شرکت نہ ہوسکی (اس زمانے میں تعلیمی اخراجات بھی صاحبزادوں کو ملا کرتے تھے) بالآخر خانگی ذرائع سے تعلیم حاصل کر کے صدر محاسبی صرفخاص واقع حویلی منجھلی بیگم میں اہل کار کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ صدر محاسبی کے انضمام کے بعد اس میں منتقل ہوئے اور وہیں سے وظیفہ حاصل کیا۔

حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے والد مرحوم پہلے ان ہی کے مکان میں کرایہ سے مقیم تھے۔ اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد جب حضرت صفیؔ سے مکان کے تخلیے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے خود ان سے کہیں مکان دلوانے کی درخواست کی جس پر ان کے والد مرحوم نے مولانا حافظ قاری عبدالرحیم مرحوم کا مکان موقوعہ مغل پورہ روبرو چھلہ غریب لوازؒ دلوایا جہاں وہ تادم زیست مقیم رہے حضرت صفیؔ کے انتقال کے بعد ان کی علاتی والدہ (حضرت اماں) بھی تادم آخر اسی مکان میں مقیم رہیں۔

صاحبزادہ تہور فاروقی اس وقت باصحت و بقید حیات ہیں البتہ دنیا کو

اِتنا زیادہ دیکھ لیا کہ بینائی تھک گئی اور آنکھوں سے غائب ہوگئی۔

صاجزادہ تہور فاروقی حضرت صفیؔ کے دورِ اول کے حلقۂ تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کا رجحانِ شعری صرف نعت اور منقبت کی طرف رہا ہے۔

(نمونۂ کلام)

اسے دیدار ہو کیونکر خدا کا — نہ دیکھا جس نے چہرہ مصطفےؐ کا
سامنا مجھ کو خدا اور مصطفےؐ کا ہوگیا — دل مرا کعبہ بنا دیدہ مدینہ ہوگیا
نظر میں دل میں سینے میں ہے جلوہ غوث اعظمؒ کا — سراپا ہے مرا آئینہ خانہ غوث اعظمؒ کا
ہے لاکھ لاکھ شکر یہ ربِّ قدیر کا — بندہ بنادیا مجھے پیرانِ پیر کا

صاجزادہ تہور فاروقی نے میرے مطالبہ پر حالات، نمونۂ کلام اور تصویر مرحمت فرمائی جس کے لیے میں مشکور ہوں۔

صفیؔ کے ضرب الامثال

صفیؔ کو شاعری سے مل گئی ہر دل عزیزی بھی — دروغِ مصلحت آمیز بھی ہے کیا ہنر دیکھو
کسی کو کوئی کیا دے گا کسی سے کوئی کیا لے گا — صفیؔ ہم تو حسابِ دوستاں دردل سمجھتے ہیں
محفل میں حال کہہ نہ سکا میں حجاب سے — یہ پوچھنا تو مفت کرم داشتن ہوا
فرطِ ایذائے زمانہ ہے عروجِ موذی — "سانپ کو پر جو نکل آئیں تو اڑ کر کاٹے"
بے ذائقہ ہیں جور وستم آسمان کے — پکوان پھیکے نکلے اس اونچی دکان کے
جلتا ہے داغِ محبت تری محبت میں! — سلامتی چراغاں فقیر کو پہنچا
جب تلک ہے جگر میں خون رولے — بہتی گنگا ہے ہاتھ دھولے
اے دلِ غمِ عشق میں جلا کر — بے کار مباش کچھ تو کیا کر
کون سمجھے گا تری غزل کو صفیؔ — جس کا کھاتے ہیں اس کی گاتے ہیں

ثاقبؔ ــــــ صاحبزادہ خواجہ سعادت اللہ خاں

تاریخ پیدائش: ۱۹۲۷ء ٭ تاریخ وفات: یکم اگست ۱۹۷۱ء

صاحبزادہ خواجہ سعادت اللہ خاں ثاقبؔ خلف صاحبزادہ خواجہ احسن اللہ خاں مرحوم نبیرۂ نواب منصور جنگ مرحوم ۱۹۲۷ء میں بمقام مغل پورہ پیدا ہوئے۔ نواب مظفر جنگ مرحوم کے نواسے تھے۔ جاگیردار کالج سے میٹرک کامیاب کیا اور عدالت خفیہ بلدہ میں لوڈی سی کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔

حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ جناب ثاقبؔ بچپن سے ہی شعر فہم تھے اور اس شعر فہمی نے انھیں شاعر بنا دیا۔ علمی و ادبی محفلوں میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ مشاعروں میں تحت اللفظ کلام سناتے تھے۔ بزم سخن سرور نگر کے مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے اور بزم کی جانب سے شائع ہونے والے گلدستوں میں ان کا کلام شائع ہو چکا ہے۔

حضرت صفیؔ سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ انتقال کے وقت یہ بھی دواخانہ عثمانیہ میں حضرت صفیؔ کے ساتھ رہے! افسوس کہ آسمان ادب پر ثاقب نمودار ضرور ہوا، تھوڑا بہت چمکا بھی لیکن اچانک صرف (۴۴) سال کی عمر میں ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ان کی تدفین آبائی قبرستان مقبرہ رفیع الدولہ واقع نام پلی میں عمل میں آئی۔

(نمونہ کلام)

رنجیدہ آپ کیوں ہوئے ثاقبؔ کی بات پر
اس کے دماغ میں ہے خلل جانے دیجیے

اے حضرت دل آج نئی بات سوچیے
جو ہو گیا سو ہو گیا کل جانے دیجیے

آتا ہے کوئی حرف جہاں آن بان پر!
خوددار جھیلتے ہیں اُسے اپنی جان پر

ثاقب خدا کے ہاتھ میں اب میری لاج ہے
وہ تو تُلے ہوئے ہیں مرے امتحان پر

جوانی میں سنور کر حسن والے جب نکلتے ہیں
کہاں دل گوشت کے ٹکڑے سے پہلاں پتھر پگھلتے ہیں

خرامِ ناز سے ہر دم نئے فتنے نکلتے ہیں!!
نہ جانے فتنۂ گریہ کون سے سانچے میں ڈھلتے ہیں

خُدا رکھے حسینوں کو تصدق میں حسینوں کے
ہزاروں دل تڑپتے ہیں تو لاکھوں دل بہلتے ہیں

ہماری بیٹھ ہی ہم کو نظر آتی نہیں ثاقب
کسی کی کیا ہمیں اچھی بُری معلوم ہوتی ہے

اس میں بھی ثاقب کی کوئی چال ہے!
کون خوش ہوتا ہے اپنی ہار سے

کہتا ہوں میں کچھ اور سمجھتا ہے تو کچھ اور
یوں بات کے نکال نہ پہلو ہزار دیکھ

(حضرت صفؔی کی موت پر)

السلام اے ماہرِ شعر و سخن
السلام اے تاجدارِ علم و فن

رو رہا ہے موت پر تیری وطن
علم و فن سے ہو گیا خالی دکن

اب کہاں ڈھونڈوں زباں کی سادگی
اب کہاں وہ شاعری کا بانکپن!

تھی بہار اُردو کی تیرے دم کے ساتھ
بار آور تھا صفؔی تجھ سے چمن

○

اُستاد اور شاگرد

ہر ہنر خدمتِ استاد سے آتا ہے صفؔی
لیکن اس بات میں شاگرد بھی اُستاد رہے

صفؔی، جب باپ، کا استاد کا رُتبہ برابر ہے
مرے کیا حضرتِ کیفؔی کہ سایہ اُٹھ گیا سر سے

صفؔی استاد بنتا ہے تو استادانِ عالم کی
اُٹھاؤ جوتیاں تازہ کرو حق پھر وہ چلیں

اُٹھ گئی ہائے عجب فرد زمانے سے صفؔی
آدمی حضرتِ کیفؔی سے بھی کم دیکھتے ہیں

جاوید — پیرزادہ سید غوث محی الدین قادری

تاریخ پیدائش: ۲۱ر جون ۱۹۲۷ء

پیرزادہ سید غوث محی الدین قادری (جاوید قادری) حضرت سید شاہ یوسف الدین قادری، ایڈیٹر ماہنامہ "ارشاد" کے فرزند ہیں۔ دیوڑھی نیروز یار جنگ واقع چیلہ پورہ حیدرآباد میں ۲۱ر جون ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب کئی واسطوں سے حضرت غوث اعظم دستگیرؒ سے ملتا ہے۔ مدرسۂ دارالعلوم سے میٹرک کامیاب کیا۔ اس کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے ایم اے بی ایڈ اور پی ایڈ کامیاب کیا۔ ابتدأ مدرسہ دارالعلوم ہی میں ملازمت اختیار کی اور اپنا تعلیمی سلسلہ بھی جاری رکھا۔ پرانے شہر میں تعلیمی پسماندگی کو دیکھ کر قوم و ملت کی خدمت کا خیال پیدا ہوا تو ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مغلپورہ میں "جاوید ماڈل اسکول" اور "جاوید ٹیوٹوریل کالج کی بنیاد ڈالی۔ جو اس وقت پورے زور و شور سے کارکرد ہیں۔ اسی اسکول اور کالج کی آمدنی ان کا ذریعہ معاش ہے۔ والد محترم کے انتقال کے بعد ماہنامہ ارشاد کی ادارت سنبھال کر کئی برسوں تک یہ ماہنامہ نکالتے رہے ہیں۔ چونکہ مولوی عبدالرب کوکب مدیر ماہنامہ اتالیق اور مولوی عبدالوہاب عندلیب مدیر رسالہ "واعظ" ان کے ماموں اور نانا تھے اور وہ شاعر تھے اس لیے ننھیال سے ان کو ذوق شاعری ملا، اور طالب علمی کے زمانے سے شعر کہنے لگے۔ حسن اتفاق سے یہ مغل پورہ میں واقع اس مکان میں رہتے تھے جو حضرت صفیؔ کے مکان کے روبرو واقع تھا۔ اس قربت نے انھیں حضرت صفیؔ سے تلمذ اختیار کرنے میں مدد دی اور وہ ان کے دورِ وسطیٰ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔

جناب جاوید قادری کا میلان طبع غزل کی طرف زیادہ ہے۔ شعر اچھے اور سلجھے ہوئے کہتے ہیں۔ مختلف اخبار و رسائل میں کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام

کا نام حضرت صفی نے "جاودانی" تجویز کیا تھا۔ جو اسی نام سے زیرِ طبع ہے۔

نمونہ کلام

پھول کیا شئے ہے کیوں وہ پیارا ہے
آپ کے رُخ سے استعارا ہے

مجھ پہ وہ یوں عتاب کرتے ہیں
جیسے کارِ ثواب کرتے ہیں

ایسے جینے سے فائدہ اے خضر
کام تھوڑے سے کتنے قیام بہت

ان کے چہرے پہ جو کھلتی ہے حیا کی سرخی
سامنے پانی بھرے اسکے حنا کی سُرخی

اللہ کے سوائے کسی پر نظر نہیں
سائل ہوں میں تو سب سے بڑی بارگاہ کا

ابلیس کو پھر راستہ جنّت کا دکھا دو
دنیا کی تباہی کو تو انسان بہت ہے

الٰہی بھیج جنّت میں اسی محبوب بندی کو
لگائیں حور سے کیا دل وہ کوئی اجنبی ہوگی

یوں تو گلشن میں سبھی دوست ہیں اپنے جاوید
کون مخبر ہے جو بجلی کو پتا دیتا ہے

زاہدو تم کو ریاکاری مبارک لیکن
دل کے اک کونے میں ایمان پڑا رہنے دو

رونقِ خانقاہ کی خاطر
رب سے بندے کو مت جدا کیجئے

ہیں ہر اک شئے سے ہزاروں ترے جلوے ظاہر
اور ہر جلوہ سے ظاہر تری یکتائی ہے

وفا کے اشک سے لبریز دل کی آنکھوں سے
غمِ حسینؓ میں جتنا بھی روئیے کم ہے

خود بھی شہید اور دو فرزند بھی شہید
تنہا خصوصیت ہے یہ حضرت علیؓ کے ساتھ

اسی کے فیض نے مجھکو کیا ہے زندۂ جاوید
نہ کیوں یادِ نبیؐ میں آنکھ دریا بار ہو جائے

خوب سمجھا دیا تھپیڑوں نے
نا خدا کیا ہے اور خُدا کیا ہے

جلوہ تمہارا قلبِ حزیں میں بسا لیا
سینے کو اپنے وادیٔ سینا بنا لیا

صفی کو سب اچھا سمجھنے لگے
زمانہ یہ کیسا بُرا آگیا

جعفر — رحیم الدین حسین خان

حضرت جعفر مرحوم حضرت صفی کے دورِ اول کے تلامذہ میں سے ہیں۔ حیدر آباد ہی میں کوتوالِ شہر جناب لال خاں کے گھر بڑی تمناؤں کے بعد پیدا ہوئے اور مدرسے میں داخل ہونے تک اپنی والدہ سے دینی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد نصابی تعلیم کی تکمیل کر کے محکمہ پولیس میں ملازمت اختیار کی۔ اپنے والد کی طرح کوتوال شہر تو نہ ہوئے لیکن خون کے اثر کے تحت اسی دبدبے سے ملازمت کی اور وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

حضرت جعفر کا نہ تو سنہ پیدائش ہی معلوم ہو سکا اور نہ سنہ وفات بس دنیا میں آئے، شان سے زندگی گزاری اور کسی کو اپنی عمر بتائے بغیر خاموشی سے اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔ اولاد نرینہ نہیں تھی۔ صرف دو لڑکیاں تھیں جن کا پتہ معلوم نہ ہو سکا۔

شعر بہت کم کہتے تھے البتہ مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے چاہے طرح میں غزل ہو کہ نہ ہو۔ حضرت صفی سے بہت مانوس تھے اور جب تک ان سے مل نہ لیتے گھر واپس نہیں ہوتے تھے۔ ان کا ذخیرہ کلام بہت کم ہے اور وہ بھی دستیاب نہیں ہے جو کچھ اِدھر اُدھر سے فراہم ہو سکا وہ نمونہ کلام کے طور پر پیش ہے ؎

نظر ملی بھی کسی سے خیال ہے اِتنا — پھر اس کے بعد کسی بات کا خیال نہیں
کہیں کسی پہ وہ افشائے راز کرتے ہیں — تمہارے چاہنے والوں کی یہ مجال نہیں
تمہارے حسن کے ارض و سما میں ہیں چرچے — وہ تم حسین ہو جس کی کہیں مثال نہیں
خوشی سے موت بھی جعفر کو اب گوارا ہے — بقیدِ زیست میسّر اگر وصال نہیں

میرے مالک دم میں جب تک دم رہے
لب پہ تیرا نام ہی پیہم رہے

کیسے حاصل ہو سکونِ زندگی
جب نظامِ زندگی برہم رہے

اک نہ اک دن جان پر بن جائے گی
دردِ دل کا گر یہی عالم رہے

یوں تو اچھے وقت کے ساتھی ہیں سب
دوست وہ ہے جو شریکِ غم رہے

کیا بتاؤں میں کسی کی یاد میں
سامنے کیا کیا مرے عالم رہے

کچھ تڑپنے کے مزے مل جائیں گے
دردِ دل جعفر اگر پیہم رہے

اپنا بنا کے اور بھی دیوانہ کر دیا
میں جان و دل سے ہو گیا ان پر نثار آج

جعفر نہیں ہے دل میں اگر کوئی جاگزیں
پھر کون کر رہا ہے مجھے بیقرار آج

حضرت صفی کے بارے میں:—

صفی مرحوم حیدرآباد کی قدیم تہذیب کا مکمل نمونہ تھے۔ شرافت نفس اور خودداری ان کی فطرت کے نمایاں جوہر تھے۔ بڑے یار باش اور دوستوں کے دل دادہ تھے آدابِ مجلس کا ان کو بڑا خیال رہتا تھا کبھی ایسی کوئی بات نہ کرتے جس سے دوسروں کو دکھ پہونچے۔ شیخی اور سے انھیں نفرت تھی۔ اپنے ہم عصروں حتیٰ کہ نوجوان شاعروں کے اچھے اشعار کی دل کھول کر داد دیتے۔ رشک و حسد کو وہ گناہ عظیم سمجھتے تھے۔ ہر نئے ملنے والے سے وہ خندہ پیشانی سے ملتے۔ ان کی گفتگو کا انداز بھی عجیب تھا مختصر الفاظ میں اپنا مطلب ادا کر کے بات کو فوراً ختم کر دیتے تھے۔

صفی اورنگ آبادی پر ایک سرسری نظر۔
پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد
ماہنامہ سب رس صفی نمبر

جمیلؔ — تُراب علی

جناب تراب علی جمیلؔ مرحوم حیدرآباد کے متوطن تھے۔ جامعہ نظامیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ شاعری کا ذوق کب سے تھا اور حضرت صفیؔ سے کب تلمذ حاصل کیا۔ اس کی تفصیل ان کی تاریخ پیدائش و انتقال کی طرح دستیاب نہیں ہوسکی۔ چونکہ حضرت صفیؔ خود نوشتہ فہرست تلامذہ میں ان کا نام موجود ہے اس لیے اندازاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں سے ہونگے۔ مشاعروں میں شرکت کرنے کا ثبوت اس سے ملتاہے کہ مشاعروں کے گلدستوں میں ان کا کلام ملتاہے۔

(نمونۂ کلام)

ہے یہ دہشت کہیں امروز نہ فردا ہوجائے
ورنہ فردا کی نہیں نام کو دہشت دل میں

آپ کے جاتے ہی اندھیر سا چھا جاتا ہے
آپ کے آتے ہی آجاتی ہے ہمت دل میں

رنج ہے درد ہے سوزش ہے خلش ہے پیہم
کیا کہوں کس سے کہوں کیا ہے مصیبت دِل میں

○

جوہرؔ — الحاج میر بہادر علی

تاریخ پیدائش: ۷/شعبان ۱۳۲۲ھ تاریخ وفات: ۱۲/دسمبر ۱۹۷۱ء

حضرت میر بہادر علی جوہرؔ حضرت میر لیاقت علی سیفؔ مہتمم خزانہ پائیگاہ نواب معین الدولہ بہادر کے دوسرے فرزند تھے ۷/شعبان ۱۳۲۲ھ کو محلہ چوک اسپان شاہ علی بنڈہ حیدرآباد میں ولادت عمل میں آئی۔ منشی فاضل کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی۔ پولیس ایکشن کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور معین الدولہ بہادر کے دوسرے صاحبزادے نواب مظہر الدین خان بہادر کے اسٹیٹ سمستان نارائن پور میں بہ حیثیت معتمد کام انجام دیتے رہے۔

ذوق شاعری موروثی تھا۔ بچپن ہی سے نہایت چست شعر کہا کرتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی میر بہادر علی خنجرؔ کی ہدایت پر حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے آگے زانوئے ادب تہہ کئے اور ان کے دورِ اول کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ بے حد پرگو اور زودگو شاعر تھے شاعری کے آغاز سے مسلسل ۴۲ سال تک بڑے دبدبے کے ساتھ شعر کہتے رہے۔ بے شمار مشاعروں میں شرکت کی۔ اکثر مقامی روزناموں اور ماہناموں میں کلام بھی شائع ہوا ہے۔ حضرت صفیؔ کی زندگی میں جو بزم تلامذہ قائم ہوئی تھی اس کے تادمِ آخر صدر رہے۔ زندگی مجرد گزاری، بڑے خلیق اور شریف الطبع انسان تھے بسنہ ۱۹۶۵ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ ماہ شعبان ۱۳۹۱ھ میں فالج کا حملہ ہوا اور دو ماہ دواخانہ چارمینار میں زیرِ علاج رہ کر ۲۳/شوال ۱۳۹۱ھ م ۱۲/دسمبر ۱۹۷۱ء کو انتقال کر گئے۔ تدفین ان کے بھائی میر احمد علی پیکاںؔ مرحوم کے بازو قادری چمن کے روبرو تکیہ حبال بی میں عمل میں آئی۔ قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر ان ہی کا کہا ہوا قطعہ کندہ ہے۔ ؎

قطعہ

اشرف المخلوق کا بخشا شرف!
خاک کے پُتلے کو کیا سے کیا کیا!
میرا منشا میری مرضی کچھ نہ تھی!
اپنا منشا آپ نے پورا کیا!

جناب پیکاںؔ کے فرزند میر راحت علی صاحب نے تصویر اور مجموعہ کلام عنایت کیا۔ میں ان کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نمونہ کلام

میں ان کا چاہنے والا ضرور ہوں جوہرؔ
مگر زبان سے کہوں یہ میری مجال نہیں

دیکھتے ہیں مجھے وہ مڑ مڑ کر
اپنے سائے سے ڈر گئے شاید

سیر کو تم اکیلے نکلے ہو
چاہنے والے مر گئے شاید

سانس آنے لگی ہے رک رک کر
داغ دل کے اُبھر گئے شاید

دیا ہے عشق جسے پھر اسے ملال نہ دے
عروج دے کے کسی کو خدا زوال نہ دے

شمار اشک دم اضطراب ہو نہ سکا
ستاروں کا تو کسی سے حساب ہو نہ سکا

یا تیری شوخیوں کا اثر اس میں آ گیا!
یا بجلیاں بھری ہیں دلِ بیقرار میں

جو دیکھتے ہیں کہہ نہیں سکتے زبان سے
نیرنگیٔ زمانہ بھی گونگے کا خواب ہے

دہرائی میری بات کچھ اس طرح آپ نے
گویا میرا سوال ہی میرا جواب ہے

محبت میں سکونِ دل میسّر ہو نہیں سکتا
میں جتنا غور کرتا ہوں یہی محسوس کرتا ہوں

غصّے میں ان سے عرضِ تمنّا جناب دل
دریا چڑھاؤ پر ہے اُتر جانے دیجئے

قبر میں کہاں راحت ہے زمیں بھی سر پہ
اور بڑھ گیا گویا ایک آسماں اپنا

کیا بات ہے مزاج میں کچھ برہمی سی ہے
کیوں خیر تو ہے آج طبیعت کو کیا ہوا

باتوں باتوں میں بگڑ جانا بھی آتا ہے انھیں
اور پھر ہنس کر ملا لینا بھی ان کو یاد ہے

منہ پہ نقاب ڈال کر سرکار آپ نے
محروم کر دیا مری آنکھوں کو نور سے

غم جنوں سے زیادہ ہیں طعنہ ہائے جنوں
یہ دل ہیں چھبنے کے کانٹے نہ تھے بیاباں ہیں

توڑنا مبارک ہو دل نیاز مندوں کا
اب لئے پھرو سر پہ سنگِ آستاں اپنا

زخم ہی نہیں کافی دل کو داغ بھی دیجئے
داشتہ بکار آید اور اک نشاں اپنا

وصل گر نہیں ممکن کاٹ آہ و زاری میں!
دیکھ کر نہ اے جوہر وقت رائگاں اپنا

گزرے جو مجھ پہ آپ گزر جانے دیجئے
بے آس جی کے کیا کروں مر جانے دیجئے

آ ہی گئے ہیں آپ تو اتنا بھی ہو کرم
دم بھر ہنسی خوشی سے گزر جاتے دیجئے

عاشق کا دل ابھی سے نہ کیجئے ملاحظہ
تھوڑے سے داغ اور ابھر جاتے دیجئے

دیکھیئے گزارہ ہو کس طرح کہاں اپنا
دشمن افترا پیشہ دوست بدگماں اپنا

ان کی نظر کے کھیل عجب ہیں!
چوٹ کہیں ہے درد کہیں ہے

اترے گی میری بات ہر اک دل میں کس طرح
تیری نظر کا میری زباں میں اثر نہیں

ساقی کے انتظام کے قربان جایئے
دیکھو تو کوئی چیز ادھر کی اُدھر نہیں

حضرت صفی کے تلامذہ میں یہ خصوصیت صرف حضرت جوہر کو حاصل تھی کہ وہ حضرت صفی کے رنگ سے اتنے متاثر تھے کہ ان کے ہی رنگ میں ڈوب کر شعر کہتے تھے، اور اتنا ڈوب کر کہ اکثر ان کے کلام پر حضرت صفی کے کلام کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

حضرت صفی کے بارے میں:-

صفی کا غزل گوئی میں بلند تر مقام ہے

غزل میں صنفِ سخن میں وجود ہے جب تک
رہے گا یاد ہر اک کو دکن میں نام صفی

بیانات
پنڈت راگھونیدر راؤ جذب عالمپوری
سب رس۔ صفی نمبر

حامد — احمد بن سعید (مسمار)

تاریخ وفات ۱۳۴۶ھ

حضرت احمد بن سعید حامد مرحوم قبیلہ مسمار سے تعلق رکھتے تھے۔ حیدرآباد کے ایک مضافاتی علاقہ بارکس میں پیدا ہوئے اور صرفخاص میں ملازم تھے۔ یہ حیدرآباد کے ایک مشہور شاعر ابن احمد تاب کے والد تھے۔ ابتداءً حضرت کیفی مرحوم سے تلمذ اختیار کیا جس کا ذکر محمد سردار علی مرحوم مولف "یورپین شعراء اردو" "تذکرہ شعرائے اورنگ آباد" نے اپنی تالیف "تصویر افکار" میں جو ۱۳۴۶ھ میں شائع ہوئی" کیا ہے

حضرت حامد مولوی خیر المبین (نبی خانہ) کے مرید تھے اور اپنے پیر و مرشد خیر المبین کے مواعظ سے متعلق ایک کتاب "صداقت لوا الاسلام" مرتب و طبع کروا کر نبی خانہ میں شرکائے محفلِ وعظ میں تقسیم کی ہے

شاعری کا ذوق ماحول کا پیدا کردہ تھا لیکن حضرت کیفی اور ان کے بعد حضرت صفی کی صحبت و تلمذ نے اس میں آمد کا رنگ بھر دیا اس لیے بڑے سلجھے ہوئے شعر کہتے تھے۔ حضرت صفی کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں سے تھے۔ عمر بہت کم پائی یعنی (۲۸) سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ تدفین احاطہ درگاہ حضرت میر مومنؒ چپ علی آباد میں ہوئی۔ سعئ بسیار کے باوجود تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو سکی اور نہ کوئی تصویر ہی دستیاب ہو سکی۔ انتقال ۱۳۴۶ھ میں کیا۔ چند شعر جو بشکل دستیاب ہو سکے نمونہ کلام کے طور پر پیش ہیں۔

(نمونہ کلام)

نہ نکلیں اشک اے دل زیرِ خنجر دیدۂ تر سے
شہادت تو اسی کی ہے جو پانی کیلئے ترسے

کم از کم مئے کشو اتنا اثر پیدا تو ہو تم میں
خدا کی شان دیکھو جرم اظہارِ محبت پر
پیار کی باتیں کرو کچھ ڈھب نکالو پیار کا
ساقی بنے اگر تو وہ انقلاب ہوگا
جب دیکھنے کے قابل تیرا شباب ہوگا

جہاں آئے خیال مے کشی بارش وہیں برسے
گلا کٹتا ہے کس کا میرا، کس نے تیر خنجر سے
چاہے سے ملنا ہو تو سیکھو طریقہ چاہ کا
مٹے پانی پانی ہوگی پانی شراب ہوگا!
خود تجھکو اے ستمگر تجھ سے حجاب ہوگا

حضرت صفی کے بارے میں :-

باقاعدہ بیٹھ کر خطوط نویسی نہیں کی۔ جو کچھ لکھا قلم برداشتہ ہی لکھا جس طرح کلام میں سلاست وروانی ہے۔ سادگی ہے روزمرہ اور محاورات کا برمحل استعمال ہے دادئی کسک ہے بذلہ سنجی اور خوش طبعی ہے اس کے علاوہ طرزِ بیان کی دل کشی اور ان کا اپنا ایک خاص لب ولہجہ ایسی ہی خوبیاں ہمیں ان کی نثر میں ملتی ہیں ایک خط میں وہ خود فرماتے ہیں " ارمان ہے کہ میرے خط بھی غزلوں کی طرح چٹپٹے ہوا کریں ان کو پڑھنے والے مزے لے لے کر پڑھا کریں "۔ حکیم عبدالقادر کو اپنی بیماری کی کیفیت لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ حکیم صاحب کیفیت کی چھپوں پر نسخہ تجویز کرتے تھے۔ اور اِسی کے ساتھ بعض وقت صفی کی شگفتہ بیانی اور ان کی معلومات سے متاثر ہو کر بڑے تعریفی کلمات لکھ بھیجتے تھے۔ ملاحظہ ہو:

آپ کی جادو بیانی۔ دیدہ زیب خوش خطی نکات ، بعض بعض خاص استفسارات کو میں اپنے قلم سے ادا نہیں کر سکتا "۔

خطوط
سوانح عمری صفی اورنگ آبادی
محمد نور الدین خان

حامی ـــــ صالح المصلی

سنہ پیدائش ۱۸۹۰ء ؛ تاریخ وفات ڈسمبر ۱۹۸۱ء

حضرت صفی اورنگ آبادی کے یوں تو کئی شاگرد ہوئے لیکن صالح المصلی حامی کو جو مقام حاصل ہوا وہ بہت کم شاگردوں کو نصیب ہوا وہ حضرت صفی کے استاد بھائی بھی تھے، شاگردِ رشید بھی اور راز دار و دمساز بھی۔ حضرت حامی ولد سعید بن علی ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ صحیح تاریخ پیدائش اور مقام پیدائش کا علم نہیں ہوسکا۔ زندگی کا آخری دور حیدرآباد ہی میں گزرا، ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۱ء تک حضرت تاباں مرحوم کی تیار کردہ "بزمِ ادبستان دکن" کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔

حضرت صفی اورنگ آبادی سے حضرت حامی کو بڑا خاص لگاؤ تھا۔ حضرت صفی بھی انھیں اپنے قریب رکھتے تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ دواخانہ عثمانیہ میں حضرت حامی کے زانو پر حضرت صفی کا دم نکلا۔ "گلزارِ صفی" کی اشاعت کے سلسلہ میں ان کا بے حد تعاون رہا۔ ضعیفی کی حالت میں کم از کم دو کلومیٹر دور کالے پتھر سے شکر گنج تک پیدل آیا جایا کرتے تھے اس سے ان کی والہانہ عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے ۸۵ سال کی عمر میں اتنا فاصلہ طے کرنا صرف عزم اور جذبہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ رؤف رحیم کے ساتھ گلزارِ صفی کی ترتیب میں حصّہ لیتے رہے لیکن افسوس کہ اس کی ترتیب میں اتنی دیر ہوگئی کہ حضرت صفی کی جو نظمیں ان کے پاس تھیں وہ ان کے پاس رہ گئیں اور شریکِ گلزارِ صفی نہ ہوسکیں۔ کیونکہ وہ اس اثناء میں بعمر ۹۰ سال ڈسمبر ۱۹۸۱ء میں اس جہان فانی کو خیرباد کہہ گئے۔

حضرت حامی بے حد پُرگو شاعر تھے جو صفی مکتب کی خصوصیات میں سے ہے۔ کلام میں روزمرہ ضرب المثال کا استعمال بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تغزل و تصوف کا رچاؤ بھی ملتا ہے۔ حیدرآباد دکن کے شعراء کی روایت کے مطابق ان کا کلام

بھی شائع نہیں ہو سکا۔ نامی گرامی ادبی اداروں نے کبھی اِن کے بارے میں نہیں سوچا۔ اور انھوں نے خونِ جگر سے شعر و ادب کی جو آبیاری کی وہ منظرِ عام پر نہ آسکی بلکہ ان کے گھر کی چار دیواری میں ہی رہ گئی۔

حضرت حامی المصلی حضرت صفی کے دورِ اول کے تلامذہ میں سے ہیں۔ میں جناب حامی کے فرزند ناصر مصلی کا مشکور ہوں جنھوں نے اپنے والد کی تصویر اور نمونہ کلام میرے حوالہ کیا۔

(نمونہ کلام)

جھکے دشمن کے آگے تیری خاطر اور سر میرا
بہت کچھ اب بھی قابو ہے دلِ بیتاب پر میرا

محبت میں تری جاں نذر ہے حاضر ہے سر میرا
الٹ جائے دل مضطر کہ اب لٹ جائے گھر میرا

وفورِ عشق نے تکلیف کا خوگر بنایا ہے
مسیحا جا نہیں سکتا ہے اب دردِ جگر میرا

محبت میں کوئی قابل بھروسے کے نہیں ہوتا
نہ تم میرے، نہ دل میرا، نہ جاں میری نہ گھر میرا

کیا ترکِ تعلق خود ہی کچھ اتنا تعلق ہے
زبانِ یار پر ہے تذکرہ آٹھوں پہر میرا

ابھی اچھے بُرے کو پہچاننا تو آ نہیں سکتا
اُڑائیں گے عدو کیا خاک اندازِ نظر میرا

یہ کہہ کر ڈھونڈتے پھرتے تھے وہ دن یاد ہیں تم کو
نظر آتا نہیں کیوں حامیِ خستہ جگر میرا!

تقدیر اپنی آج تو پھر آزما کے دیکھ
شاید وہ مان جائے اسے پھر منا کے دیکھ

واعظ نہ جب حرم کو ذرا دیر کو بھی چل
حُسنِ بتاں میں بھی تو ہیں جلوے خدا کے دیکھ

مر جاؤں میں تو یہ مری قسمت کی بات ہے
تو مجھ سے ایک بار نظر تو ملا کے دیکھ

اے محوِ ناز آئینہ کیا داد دے سکے
دیتے ہیں داد ہم کو تو جلوہ دکھا کے دیکھ

ہم کو تو پاسِ خاطرِ دردِ جگر ہے بس
تو لاکھ بار اور یونہی آزما کے دیکھ

ہو جائے ایک جیت جو تیری تو کیا عجب
حامی تو اب کے جان کی بازی لگا کے دیکھ

حادیؔ ـــــ الحاج غُلام علیؒ

تاریخ پیدائش ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ ۵ مارچ ۱۹۶۹ء تاریخ وفات ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ

حضرت غلام علی حادیؔ ولد محمد عباس علی مرحوم، حضرت صفیؔ کے دورِ اول کے تلامذہ میں سے ہیں۔ ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ کو محلہ چھاؤنی غلام مرتضیٰ کمنداں بیرون لال دروازہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ذوقِ علم ایسا تھا کہ صرف (۲۳) سال کی عمر میں یعنی ۱۳۴۰ھ م ۱۹۲۳ء میں جامعہ نظامیہ حیدرآباد سے مولوی کا امتحان کامیاب کر لیا۔ مولوی کے امتحان کے بعد اصولاً منشی فاضل کا امتحان دینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن طبیعت میں تجسس و تنوع ایسا تھا کہ ۱۹۳۰ء میں پنجاب جاکر پنجاب یونیورسٹی سے اور ۱۹۳۱ء میں مدراس جاکر مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔ عجب حال تھا کہ اگر السنۂ شرقیہ کے امتحانات اگر چین میں ہوتے تو وہ چین بھی جاتے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اولاً سر یمین السلطنت مہاراجہ کرشن پرشاد کی پیشی کے خوش نویس مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ۱۳۳۹ف میں خزانہ عامرہ سرکار عالی میں مامور ہوئے اور وہاں (۳۵) سال ملازمت کر کے ۱۹۵۴ء میں وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ اوائل طالب علمی ہی سے شعر کہنے کا ذوق تھا اور شاعری میں ایک عالمانہ شان جھلکتی تھی۔ حضرت صفیؔ اورنگ آبادی سے تلمذ حاصل کرنے کے بعد اپنے انتقال تک باقاعدہ مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ پہلے ان کا تخلص توصیف تھا لیکن حضرت صفیؔ کے شاگرد ہونے کے بعد حضرت کیفی مرحوم نے تخلص بدلنے کا مشورہ دیا۔ اور "حادیؔ" کا تخلص یہ کہتے ہوئے سرفراز کیا کہ "یہ تخلص ہمارے پاس محفوظ تھا جو تم کو دیا جاتا ہے۔"

حضرت حادیؔ نہ صرف اُردو بلکہ فارسی اور عربی میں بھی شعر کہتے تھے۔ بعض

قطعات تاریخ عربی زبان میں ملتے ہیں۔ ان کی اکثر غزلیں اور نظمیں اُس دَور کے رسائل "دین و دنیا" (دہلی) ہمایوں (دہلی) اور "النور" حیدرآباد میں چھپ چکی ہیں۔ غزل ہمیشہ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ حضرت حادی حضرت صفؔی کے انتقال کے بعد متفقہ طور پر جانشین صفؔی قرار دیے گئے۔ حضرت صفؔی بعض اوقات اپنے تلامذہ کو حضرت حاؔدی سے رجوع ہونے کا مشورہ دیتے بلکہ خود بھی فارسی میں مشورہ فرماتے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "جو باتیں میرے ذہن میں مبہم ہوتی ہیں یا جو شبہ دل میں ہوتا ہے وہ حادی سے دور کر لیا کرتا ہوں"۔ غور کیجیے نہایت صاف الفاظ میں دوسروں کو ہدایت کرنا اور خود بھی گاہے گاہے عمل پیرا ہونا کتنا بڑا پن ہے۔ یہ باتیں صرف سلف میں پائی جاتی ہیں۔ اکثر دریافت کرنے پر فرماتے کہ "حادی سب پر حاوی ہے"۔ ۵ مارچ ۱۹۶۹ء میں بعارضہ فالج انتقال ہوا اور قادری چمن میں تدفین عمل میں آئی۔ اِن کے ایک ہی صاحبزادے محمد یحییٰ خالد ہیں جو ان دِنوں کینیڈا میں مقیم ہیں۔ استادی حضرت حادی مغفور نے اپنے مجموعہ کلام کا نام "خیالاتِ حادی" رکھا تھا جو زیر ترتیب ہے۔

(نمونہ کلام)

ناخوشگوار وقت کے سانچوں میں ڈھل گئے
دُنیا کو جو بدل نہ سکے خود بدل گئے

میلانِ نگاہ ان کی جانب
اتنے سے جُھکاؤ پر گرا ہوں

موت اور شئے ہے حُسن پہ مَرنا کچھ اور ہے
وہ زندگی کے بعد ہے یہ زندگی کے ساتھ ہے

رودادِ زندگی تجھے حادی سنائے کیا
۶۷ سینتیسٹھ برس سے سینۂ گیتی پہ بار ہوں

قدموں سے اُٹھا لیجیے نہ اپنے
گرنا تھا جہاں وہیں گرا ہوں

جنّت کا حُسنِ ظن ہے کسی کے مکان پر
مجھ کو خدا معاف کرے اس گمان پر

قرابت اپنی رگِ جاں سے وہ بتاتے ہیں
یہ کیسے رشتے ہیں کیا جانے کیسے ملتے ہیں

دینے والا کس قدر ہوگا سخی
مانگنے والا اگر حاتم رہے

کِسی پہ کھل نہ سکی راہ ان کے آنے کی
سب آنے والے تو آنکھوں سے دل میں آئے ہیں

کیفیت اس کی آنہیں سکتی بیان میں!
غصّے کو پی کے دیکھ یہ کیسی شراب ہے

درباں کا کیا اثر ہو بھلا گھر کے چور پر — پوشیدہ ہیں ضمیر کے دھوکے نگاہ سے

یہ آنسو آنکھ میں دل کا لہو ہے!! — نہ سمجھو بھی تو عاشق سرخ رو ہے

یہ زاہد کیوں مراقب قبلہ رو ہے — نظر ہو تو تجلی چار سو ہے

دل حاملِ انا ہے انا ہے محلِّ علم — سادہ سا یہ ورق ہی مکمل کتاب ہے

وسوسے بڑھتے ہیں تاخیر سے آنے والے — ہم ہیں پل پل کی تری خیر منانے والے

اور کیا تکلیف پہنچی گردشِ ایام سے — ہم ذرا کروٹ بدل کر سو گئے آرام سے

حادی زبان کو بھی زباں داں پہ ناز ہے — اہلِ زباں کو ناز اگر ہے زبان پر!!

پانی چرا رہا ہے کوئی زخمِ دل ضرور — ورنہ یہ آنکھ عالمِ رقت میں تر نہ ہو!

آئینہ رو ہیں آپ یہ سب پر ہے آئینہ — سینے میں دل بھی چاہیے آئینے کی طرح

توبہ شکن بہار ہے تقویٰ شکن ہے یار — پرہیزگار بھی نہیں پرہیزگار آج

گنتا ہوں آسمان کے تارے فراق میں — یہ شب ہے میرے واسطے روزِ شمار آج

دخترِ رز منہ نہیں لگتی کبھی — شیخ نامحرم کے نامحرم رہے

گدائی سے غرض کیا اس گدا کو — خدا سے مانگتا ہے جو خدا کو

خرامِ ناز ان کا دیکھتا ہوں — نگاہیں چومتی ہیں نقشِ پا کو

اگر ہے مانگنے کا شوق حادی — رکھو ملحوظ آدابِ دعا کو!

مٹی کے ڈھیر میں رہے کیا شانِ احترام — ہے صاحبِ مزار سے رتبہ مزار کا

قاتل کی جب نگاہ دمِ ذبح لڑ گئی — وہ ہو گیا شکار خود اپنے شکار کا

وہ خلافِ امید آ پہنچے!! — اپنی آنکھیں بھی ہم بچھا نہ سکے

خود کو یادش بخیر بھول گئے — اس کو دل سے مگر بھلا نہ سکے

انھیں کو دیکھ رہا ہوں ہر ایک صورت میں — یہ واقعہ ہے کوئی خواب یا خیال نہیں

حضرت حادی ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک ماہر عروض داں بھی تھے اکثر تلامذہ کے توجہ دلانے اور پیہم اصرار کرنے پر وہ عروض پر ایک مبسوط کتاب لکھنے پر آمادہ بھی ہو گئے تھے اور لکھنا شروع بھی کر دیا تھا لیکن افسوس کہ زندگی نے وفا نہیں کی اور کتاب کی تصنیف مکمل نہ ہو سکی۔

میں صاحبزادہ عاقل کا مشکور ہوں جنھوں نے استادی حادی مرحوم کی تصویر مرحمت فرمائی۔ حالات و نمونہ کلام خود حضرت نے اپنی زندگی میں میرے مطالبہ پر عنایت فرمایا تھا جس کی ایک نقل میں نے خواجہ حمیدالدین شاہد حال مقیم پاکستان کو ۱۹۵۷ء میں بغرض اشاعت "شیرازۂ پریشاں" کے لیے دی تھی۔

۸۷

حضرت صفی کے بارے میں:

جناب تمکین کاظمی صاحب نے اپنے متذکرہ مضمون میں جو واقعہ لکھا ہے وہ صفی کے رفتار طبع کی حیرت انگیز مثال ہے فرماتے ہیں " ان کا وہ لاابالی پن زندگی کے ہر شعبے پر چھایا ہوا رہا۔ تقریباً بیس ۲۱ اکیس سال کی بات ہے کہ چار منار کے پاس ایک کپڑے کی دکان پر صبح سویرے صفی بیٹھے ہوئے نظر آئے سلام علیک کے بعد مجھے روکا اور مرے ساتھ چل کر علی میاں کے ہوٹل میں چائے پینے گئے اس کے بعد میں چلا گیا اور صفی وہیں ٹھہرے رہے۔ ڈھائی تین بجے جب میں لوٹا تو دیکھتا کیا ہوں کہ صفی کے گھر سے جنازہ نکل رہا ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ صفی کے والد کا جنازہ ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے صبح میں انتقال کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ کہنے لگے آپ سے جب ملاقات ہوئی تو میں کفن کے لیے کپڑا خرید رہا تھا پھر ادھر کی باتوں میں لگا تو ذکر کرنا بھول گیا۔ یہ رنگ تھا ان کی طبیعت کا!

ملازمت۔
سوانح عمری صفی اورنگ آبادی

مرتبہ
محمد نورالدین خان

بھلا اب کوئی چشمِ مستِ ساقی کے برابر ہے
نہ پیمانے کا ظرف اتنا نہ اتنا ظرف ساغر ہے

نہ سر محتاجِ بالیں ہے نہ تن مرہونِ بستر ہے
تکلف برطرف فرشِ زمیں آغوشِ مادر ہے

جو رتبہ دوستی کا ہے قرابت سے بھی بڑھ کر ہے
برادر بھی اگر ہو دوست تو بے شک برادر ہے

نہ ہو جائے سے باہر دل مرا سینہ کے اندر ہے
"یکے نقصان مایہ" کیا کہوں۔ ہے اے ستم گر ہے

کبھی عشاق پر تجھ کو ترس کھاتے نہیں دیکھا
ترے سینہ میں شاید دل نہیں ہے کوئی پتھر ہے

علامت سرکشی کی ہے فلک کی سرنگونی بھی
یہ شاید سوچتا رہتا ہے میرا کون ہمسر ہے

جگر نے درد پایا، سر نے سودا آنکھ و غم دل نے
وظیفہ عشق کی سرکار سے سب کو مقرر ہے

جنابِ شیخ بھی اب پڑ گئے دنیا کے پیچوں میں
بظاہر دیکھنے کو تو بڑا شملہ بڑا سر ہے

زبانی ان کی ہمدردی ہے اپنے ملنے والوں سے
کہ ایسا ہو تو اچھا اور ویسا ہو تو بہتر ہے

میرے دل پہ ہے جو نقشِ دلفگار داغِ ناکامی
بہت ہی کم سہی لیکن بڑا پُر کیف منظر ہے

کوئی شطرنج کی بازی ہے جاں بازی محبت کی
جو نکلے چال کوئی مات کی یہ موت کا گھر ہے

اگرچہ دل کی گنتی تو ہے اعضائے رئیسہ میں
مگر یہ خسروِ اقلیمِ تن ہے تخت و افسر ہے

تعجب ہے کہ جس کی یاد نے تڑپا دیا دل کو
اسی کی یاد پھر وجہِ سکونِ قلبِ مضطر ہے

محبت اندھی ہوتی ہے تو پھر شاعر بھی اندھے ہوں
کہ جیسے ایشیاء کا "رودکی" یورپ کا "ہومر" ہے

بہت خود رو ہے پیداوار اپنی فکر کی حاوی
زمینِ گلشنِ شعر و سخن مدت سے بنجر ہے

نہ بُرے تم نہ بُرے ہم نہ ملاقات بُری
کیوں خفا ہوتے ہو ہوتی ہے بُری بات بُری

اس لیے ہوتی ہے ہر دم کی ملاقات بُری
باتوں باتوں میں نکل جاتی ہے اک بات بُری

جب ملنا ہے تو ملنے کے طریقے سے ملو
میں نے ٹھٹھے سے کہا تم کو لگی بات بُری

آپ جو چاہیں کہیں آپ سے میں کچھ نہ کہوں
آپ کی بات بھلی اور مری بات بُری

تیری فرقت میں تڑپنے کے مزے خوب ملے
کوئی دن ہی نہ بُرا تھا نہ کوئی رات بُری

آپ خود بات نہ کرتے جو کسی سے حاوی
آج کیوں سنتے کسی غیر کی یہ بات بُری

بات ہم سے عدو بنا نہ سکے | منہ کی کھائی تو منہ پہ آنہ سکے
ان کا برتاؤ ناگوار کہاں | ہم اگر زیرِ بحث لا نہ سکے
دل کسی پر جو لوٹ کر آیا | کسی پہلو سے ہم بچا نہ سکے
خود کو یادش بخیر بھول گئے | اس کو دل سے مگر بھلا نہ سکے
پڑ گئی اوس خندۂ گل پر | یہ تمہاری ہنسی اڑا نہ سکے
دیدہ و دل کی ہے بساط ہی کیا | ان کے جلوے کہیں سما نہ سکے
ہے ملامت ضمیر کی ایسی | جس کی آواز کو دبا نہ سکے
عرش کے ساتھ ہو گی عرش کی بات | دل کی وسعت کو لوگ پا نہ سکے
جو ہوا و ہوس کے بندے ہیں | وہ خدا کو خدا بنا نہ سکے
میں تصدق ترے تبسم پر | غنچے اس طرح مسکرا نہ سکے
اتنا دلچسپ اور ملکِ عدم | جو گئے پھر پلٹ کے آ نہ سکے
اس نے تیور سے کر لیا محسوس | دل کی تشویش ہم چھپا نہ سکے
دل ہے معمارِ آرزو حاوی | وہ عمارت بنی کہ ڈھا نہ سکے
اسی کے دیکھتا ہوں انفس و آفاق میں جلوے | نظر آتا ہے مجھ کو لامکاں والا مکانوں میں
آپ کی بدگمانیاں توبہ | شکر بھی باعثِ شکایت ہے

صفی کے منتخب اشعار

سچ تو یہ ہے کہ تیری دوری بھی
شرحِ حبل الورید ہوتی ہے

معشوق وہ کسی کے نہیں تو نہیں سہی
لیکن یہ پوچھیے کہ صفی کس کا نام ہے

گنہگاروں کے چہرے دل پر یہ کیسا خون دوڑ آیا!
ترے جلوے نے صورت ہی بدل دی روسیاہوں کی

الحاج ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی

پیدائش ۱۶ اپریل ۱۹۱۶ء — تاریخ وفات ۳۰ نومبر ۱۹۸۵ء

محمد شرف الدین خان نام ابو النصر حضرت صفی کا عطا کردہ خطاب حیدرآباد دکن میں ۱۶ ۱۹۱ء کو ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے آبا و اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا لیکن ان کے والد نے تجارت کو ذریعہ معاش بنایا۔ ابتدائی تعلیم محلہ کے مدرسہ میں اس کے بعد مدرسہ دینیہ مسجد میاں مشک (پرانے پل) بعد ازاں مدرسہ عثمانیہ دار العلوم سے ۱۹۲۸ء میں میٹرک کامیاب کیا۔ اور ۱۹۳۴ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی آپ نے حضرت سید قطب الدین محمودی صاحب لکچرر چادر گھاٹ سے فارسی اور عربی پڑھی۔ ۱۹۳۶ء میں تاریخ اسلام سے ایم اے میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ ملازمت سے قبل ہی استادِ محترم کے حقیقی بھوائی جناب سید نظام الدین صاحب امین جنگلات کی صاحبزادی سے ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو شادی ہوگئی اس طرح جناب مبارز الدین رفعت لکچرر گلبرگہ آپ کے برادر نسبتی ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد دار الترجمہ عثمانیہ میں مترجم کی حیثیت سے کارگزار رہے یہیں ان کی ملاقات اور پھر دوستی جناب سید ابو الخیر مودودی صاحب اور ان کے بھائی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب سے ہوئی اس عرصہ میں جب مولوی جمیل الرحمٰن پروفیسر تاریخ اسلام جامعہ عثمانیہ کا ۱۹۴۲ء میں انتقال ہوگیا۔ ان کی جگہ بہ حیثیت استاد تاریخ اسلام جناب خالدی کا انتخاب ہوا۔ پھر اسی شعبہ تاریخ اسلام کے ریڈر مقرر ہوئے۔ حکومت حیدرآباد سرکار عالی کی جانب سے منتخب ذہین اساتذہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک بھیجا جاتا تھا چنانچہ جب جناب خالدی کا انتخاب ہوا تو انھوں نے یورپ جانے کی بجائے "مصر" **جامعۃ القاہرہ کا انتخاب** کیا اور ۱۹۴۶ء میں مصر روانہ ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں وہاں سے ڈی لٹ کی ڈگری لے کر وطن لوٹے اور سابقہ خدمت ریڈر تاریخ اسلام پر رجوع ہوئے اور ۱۹۴۰ء

میں وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہو گئے۔ آخر دم تک تاریخ، ادب اور قرآن فہمی کی تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف رہے اور تاریخ، ادب، اسلامیات اور دکنی ادب پر کئی تحقیقی مقالے اور مضامین لکھے۔ آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ قاموس الوفیات لاعیان الاسلام ۲۔ مقدمہ: اسلامی نظم دلنسق (ترجمہ) ۳۔ ہندوستان کے متعلق جاحظ کے اجمالی معلومات کا تفصیلی مطالعہ ۴۔ مسلمانوں کی بحری سرگرمیاں: بعض اساسی معلومات اور ان کی توضیح ۵۔ تقویم ہجری وعیسوی ۶۔ کلام معظم بیجاپوری۔

اِن کی تصانیف ان کی اولاد معنوی کی حیثیت رکھتی ہیں جو ان کے نام کو زندہ و پائندہ رکھیں گے۔ انھیں چھ صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں ہیں تمام تعلیم یافتہ ہیں خصوصًا ان کے ایک فرزند عمر خالدی جو امریکہ میں رہتے ہیں انھیں تاریخ اور تحقیق کا ذوق ورثہ میں ملا ہے خالدی صاحب کی ایک صاحبزادی جو جناب معین الدین صاحب عزمی کی اہلیہ ہیں اپنی والدہ کے ساتھ مہدی پٹنم میں رہتی ہیں اور بقیہ سب امریکہ میں مقیم ہیں۔ جناب ابوالنصر خالدی صاحب اعلیٰ انسانی اوصاف سے متصف تھے۔

حضرت صفی اورنگ آبادی سے ملاقات کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ جناب خالدی اپنے والد کا مکان چھوڑ کر مسجد چوک میں قیام پذیر ہوئے اسی طرح دکن کے استاد سخن محمد بہبود علی صفی اورنگ آبادی بھی [اس موقع پر جناب محمد انور الدین خان صاحب کی تصنیف "سوانح عمری صفی اورنگ آبادی" کا حوالہ ضروری ہے کیوں کہ یہ کتاب زیادہ تر جناب خالدی سے انٹرویو پر مشتمل ہے] وہ لکھتے ہیں "جناب خالدی نے صفی سے اپنی پہلی ملاقات کا واقعہ یوں سُنایا کہ مسجد چوک کے کتب خانہ میں وہ ایک کتاب کے مڑے ہوئے اوراق (شکن کاغذ) بھیگے کپڑے سے بڑے سلیقہ کے ساتھ درست کر رہے تھے ایک صاحب وہاں بیٹھے اِن کی مصروفیت کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے جب جناب خالدی نے اپنا کام ختم کرلیا تو ان صاحب نے جناب خالدی کی سلیقہ مندی کی داد دیتے ہوئے مُسکرا کر کہا "اگر تم لڑکی ہوتے تو میں تم سے شادی کرلیتا"۔ جناب خالدی فرماتے تھے یہ بات ۱۹۲۶ء کی ہے۔ [صفحہ ۲۰] بعد کو جناب خالدی کو معلوم ہوا کہ "یہ صاحب" حیدرآباد کے شاعر صفی اورنگ آبادی" ہیں۔

جناب خالدی صاحب کی زندگی کا یہ بھی ایک موڑ تھا کہ حضرت صفیؔ کی ان کو سنگت ملی۔ لیکن اُنھوں نے اِس موقع کو غنیمت جان کر صفیؔ صاحب سے جن کو خدا نے ذہانت اور فضل و کمال سے بہرہ ور کیا تھا ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ فارسی ادب اور فارسی شعراء کا کلام انھوں نے حضرت صفیؔ سے پڑھا یہی وجہ ہے جناب خالدی ہمیشہ حضرت صفیؔ کو "مولوی صاحب" ہی سے مخاطب کرتے تھے جب کچھ دن بعد صفیؔ کو اپنے والد کی بیماری کی اطلاع ملی تو اپنے والد کی تیمارداری اور خدمت گزاری کے لیے وہ گھر واپس ہوئے جناب صفیؔ سے کچھ ایسے مخلصانہ روابط استوار ہو چکے تھے کہ جناب خالدی بھی چند روز بعد صفیؔ کے گھر منتقل ہو گئے اور ان کے ساتھ رہ کر تیمارداری میں اِن کا ہاتھ بٹایا۔ رکاب گنج موسیٰ میر کی کمان، مغل پورہ کمان کے متصل کا مکان، غرض جہاں جہاں صفیؔ والد کو لے کر منتقل ہوتے رہے جناب خالدی بھی ان کے ساتھ رہے۔ ایک سعادتمند شاگرد کی طرح اپنے استاد کی خدمت گزاری کرتے رہے۔ جب جناب خالدی نے بی اے میں داخلہ لیا تب حضرت صفیؔ سے جُدا ہوئے لیکن حضرت صفیؔ کی زندگی تک آپس میں بڑے خوشگوار اور مخلصانہ روابط قائم رہے۔ جناب محمد نورالدین خان نے ان سے پوچھا کہ کیا صفیؔ آپ کے دوست تھے لیکن صفی صاحب کی عظمت و احترام ان کے دِل میں ایسا تھا کہ میرے پوچھنے پر اُنھوں نے جھٹ ہاتھ کانوں پر رکھا اور فرمایا "نہیں میاں میں ان کا دوست نہیں ادنیٰ خادم ہوں"

جناب خالدی شاعر نہ تھے ایک شعر بھی اُنھوں نے نہیں لکھا البتہ ان کے سخن فہم اور نقادِ سخن ہونے میں کلام نہیں بے شمار شعر اردو اور فارسی کے یاد تھے اس حیثیت سے ان کو شاگردِ صفیؔ سمجھا جا سکتا ہے کہ انھوں نے فارسی ادب کی کتابیں صفیؔ سے پڑھی تھیں اور سخن فہمی میں ان سے استفادہ کیا تھا۔

خالدی محترم اکثر حضرت صفیؔ اور تنگ آبادی کا تذکرہ بڑے خلوص اور احترام سے کیا کرتے تھے اپنی تعلیم و تربیت میں حضرت صفیؔ کی مشفقانہ سرپرستی کا ذکر کرتے اور فرماتے تھے "میرا سلیقہ، میری نفاست پسندی اور رکھ رکھاؤ

حمیدہ
مولوی صاحب کی حسن تربیت کا رہون منت ہے: صفی مرحوم کے منجملہ اور اوصاف کے غیرت اور خودداری کی صفت نے کبھی کسی سے ذلت سوال گوارا نہیں کیا۔
استاد کی طبیعت اور تربیت نے خالدی محترم کو بھی اسی سانچے میں ڈھالا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا ابوالنصر محمد خالدی سے اپنی ملاقات کے بعد حیدرآباد سے واپسی پر "صدق جدید" کی اشاعت ماہ اکتوبر ۱۹۶۳ء شمارہ (۱۱) جلد (۴) میں اپنے تاثرات "سفر دکن" کے عنوان سے تحریر فرمائے ہیں۔
کسی بات کی تحقیق کے سلسلہ میں اپنی علالت کے دوران اپنے آخری دور کے ایک شاگرد رشید ابراہیم صاحب سے خط لکھوا کر مولانا علی میاں کے نام بھجوایا تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے جواب مورخہ ۶/ ستمبر ۱۹۸۵ء میں تحریر فرمایا تھا:

"مولانا ابوالنصر محمد خالدی صاحب مسلمانوں اور ہندوستان کا علمی سرمایہ اور قیمتی متاع ہیں۔ میں ان کی دقت نظر اور تحقیقی کاموں کا پرانا قدرداں ہوں۔ ان کی علالت اور تکالیف کی اطلاع سے تکلیف ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ تعالیٰ تمام امراض سے شفا عطا فرمائے" شرحد ستخط

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

وہ اخلاق کا نمونہ، وضع دار، سادگی پسند، بلند حوصلہ، خوددار اور عزم و استقلال کا پیکر علم و ادب کے ایک مستند محقق اور اسلامیات کے خاموش خدمت گزار ۳/ نومبر ۱۹۸۵ء کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جسد خاکی کی تدفین درگاہ حضرت سید محمود مکی رحمۃ اللہ علیہ حسینی ٹیکری کشن باغ میں ہوئی۔

پروفیسر ڈبلیو۔ سی۔ اسمتھ (ہارورڈ یونیورسٹی) نے صاحبزادہ عمر خالدی کے نام، اپنے پیام تعزیت میں لکھا تھا: "Saints abide by the GOD, and he was surely one of them."

"خدا رسیدہ لوگ، اللہ کے فرمانبردار ہوتے ہیں اور یقیناً وہ (مرحوم ابو نصر خالدی) ان میں سے ایک تھے"

جناب خالدی صاحب کے تمام علمی، ادبی اور اسلامیات سے متعلق تصانیف اور تالیفات کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں کرنا مشکل ہے۔ ان کی غیر مطبوعہ کتابوں کی تفصیل یہ ہے:-

۱. نظام الملک طوسی ۲. تذکرۃ الملوک: رفیع الدین ابراہیم شیرازی (فارسی)
۳. احوال سلاطین بیجاپور (فارسی) ۴. دفیات اعیان ہند ۵. نعتیہ قصیدہ: نصرتی ۶. عبدالملک بن مروان (م ۸۶ھ) اور ان کے زمانے کی سیاسی حالت۔
۷. مختار بن ابی عبید الثقفی ۸. عربی صرف ۹. الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم از مقاتل بن سلیمان بلخی (م ۱۵۰ھ) (ترجمہ)

میں مولانا ابوالنصر محمد خالدی کے سلسلہ میں ان کے داماد جناب معین الدین صاحب عزمی سے ملاقات کیا۔ انھوں نے اس ضمن میں مولانا کی تصویر، ان کے تفصیلی حالات اور دیگر مشاہیر کی آراء کے علاوہ تصنیف و تالیف وغیرہ کے مکمل معلومات فراہم کرنے میں میرا تعاون کیا۔ اس کے لیے میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

حضرت صفی کے بارے میں:

ہم سمجھتے ہیں کہ صفی اب ہماری صفوں میں موجود نہیں ہیں لیکن یہ جھوٹ بھی اب موت کے کنارے پہنچ گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ایک بلند وبالا، کشادہ پیشانی، بڑی نشیلی آنکھوں والا ایک مرد قلندر کاندھے پر رومال ڈالے، تہمد و کرتے میں ملبوس، ضعف و تنفس سے لڑکھڑاتا پسینہ میں شرابور، لکڑی کے سہارے مغل پورہ کی گلیوں میں گھومتا نظر آتا ہے۔ نگاہیں اسے تلاش کرتی رہیں اور فضاؤں میں گونجتے ہوئے ان شعروں کی تصویر بن کر جب وہ سامنے آتا ہے تو یارائے ضبط نہیں رہتا۔

آفت کشان عشق کے دل ٹوٹ جائیں گے — میرا آخیر وقت آسان نہ ہو سکا
کون سا آفت زدہ رہتا ہے کوچہ میں ترے — شب کو اک آواز آتی ہے الٰہی کیا کروں

.... صفی زندہ ہے زندہ تھا اور زندہ ہی رہیگا (آب حیات کا آخری شاعر" سید عبدالحفیظ ماہتاب دکن مئی ۱۹۵۶ء)

خلوص ـــــ محمد یوسف علی

ولادت: ۱۹۰۱ء ؛ وفات: ۲۶ر اکتوبر ۱۹۸۹ء

یوسف علی نام خلوص تخلص ۱۹۰۱ء میں پُرانے شہر حیدرآباد کے محلے سلطان شاہی میں حضرت شیخ ظفر علی کے چشم چراغ بن کر پیدا ہوئے۔ آپ کے چچا جناب شیخ تلاوت علی ادیب اچھے شاعر تھے۔ جناب شمس الدین تاباں مرحوم نے شاگردوں کے کلام پر صفی اورنگ آبادی کی اصلاحیں" کے عنوان پر اپنے ایک مضمون میں جناب یوسف علی خلوص کے بارے میں لکھا تھا: "آپ (خلوص صاحب) کا نام نامی اسم گرامی یوسف علی ہے تخلص کی مناسبت سے جہاں آپ سیرتاً پُرخلوص آدمی ہیں وہاں صورتاً اسم بامسمیٰ بھی رہے ہوں گے یہ پہلے دَور کے سینیر شاگردوں میں نُمایاں حیثیت کے مالک رہے ہیں اردو فارسی میں کافی دست گاہ رکھتے ہیں آپ نے فارسی کی تعلیم ہندوستان کے مشہور حیدرآبادی شاعر کیفی علیہ الرحمہ سے حاصل کی۔"

حضرت خلوص نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ بیرون حیدرآباد گزارا ملازمتوں کے سلسلہ میں پربھنی، ورنگل، سنگا ریڈی وغیرہ میں مقیم رہے عدالت العالیہ اُمور مذہبی سے وابستہ رہے اور آخر میں ہائیکورٹ سے وظیفۂ حُسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ دینیات سے شغف رکھتے تھے وہ معلم مدرسہ دینیات مندامری عادل آباد بھی رہے مندامری، بیلم پلی لکشٹی پیٹ، رام کشٹا پور وغیرہ کے قاضی بھی رہے۔

گلابی مائل گورا رنگ، خوبصورت آنکھ ناک اور ڈیل ڈول ہیں نزاکت خُدا نے ان کے نام کو اسم بامسمیٰ بنادیا تھا۔ جناب خلوص ایک کہنہ مشق شاعر تھے لیکن وہ صرف مخصوص حلقۂ احباب میں اپنے کلام کو پیش فرماتے اور گمنامی کی زندگی کو اس دورِ تشہیر میں ضمیر فروشی سے ہونے والی ناموری پر مقدم سمجھتے تھے ادبی سیاست نے بھی انھیں آگے بڑھنے کا

موقع نہیں دیا۔ سلاست، فصاحت، بلاغت، محاورہ بندی ضرب الامثال کا استعمال مکتب صفی کی خصوصیات ہیں۔ حضرت یوسف علی خلوص کے کلام میں تغزل کا رنگ نمایاں ہے رعایت لفظی اور سلاستِ بیان بدرجہ اتم موجود ہے چونکہ ان کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا ادبی دنیا ان کی صلاحیتوں سے محروم ہے۔ رؤف رحیم معتمد ادبستان دکن ان کے کلام کو مرتب کر کے شائع کروانے کی سعی کر رہے ہیں۔ جناب خلوص کے فرزند محمد صدیق علی روزنامہ "منصف" میں سب ایڈیٹر ہیں۔ جن کے تعاون سے کلام فراہم ہو سکا ہے۔ حضرت صفی اورنگ آبادی کے تلامذہ میں حضرت یوسف علی خلوص ایک خاص مقام رکھتے تھے ان کے کلام پر "صفی صاحب کی اصلاحات" شائع ہو چکی ہیں۔ افسوس ہے کہ اتنا عمدہ کلام لکھنے والا پیکرِ خلوص گوشۂ گمنامی سے سیدھا داعی اجل کو لبیک کہا اور ادبی دنیا کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔

جناب یوسف علی خلوص ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۹ء بروز پنجشنبہ گیارہ بجے دن عثمان باغ کا ماٹی پورہ میں انتقال کر گئے۔ اور باقر نگر نزد جدید عیدگاہ میر عالم سپرد خاک کئے گئے۔ آپ کے فرزند محمد صدیق علی سب ایڈیٹر روزنامہ "منصف" نے نمونۂ کلام حالات و تصویر مرحمت فرمائی جس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔

مرنا بھی ایک نام ہے شاید حیات کا
اہلِ وفا سمجھتے ہیں وعدہ وفا ہوا

حادثے پر حادثہ افتاد پر افتاد ہے
زندگی دنیا کی یارب کتنی بے بنیاد ہے

کب گری دل پر مرے بجلی نہیں اس کا خیال
مسکرا کر اس نے دیکھا تھا بس اتنا یاد ہے

ساتھ اُن کے ان کے حسن و عشق کے چرچے گئے
اب نہ وہ مجنوں نہ وہ یوسف نہ وہ فرہاد ہے

بیکسی میں کوئی اپنا پوچھنے والا نہیں
دل جو اک مونس ہے خود اپنی جگہ ناشاد ہے

دیکھ کر دنیائے مطلب آشنا کو اے خلوص
کنج تنہائی ہے اب میں ہوں خدا کی یاد ہے

اک نظر تجھ کو جو اے انجمن آرا دیکھے — دونوں عالم کو نظر میں تہہ و بالا دیکھے
ناز بردار کوئی ناز اُٹھائے تیرے — اور انداز کوئی دیکھنے والا دیکھے
میں اِدھر غش رہوں آئینہ اُدھر سکتے میں — وہ اسی شان سے اپنا رُخِ زیبا دیکھے

آج کل دل میں ہے بس ایک یہ ارمان خلوص
جس کو میں دیکھ رہا ہوں اُسے دُنیا دیکھے

○

پوشیدہ وہ نگاہ سے میری کہاں رہے — میں سایہ بن کے ساتھ رہا وہ جہاں رہے
ٹھکرا کے میری قبر کو کہتا ہے وہ شریر — آخر ہمارے آنے کا کچھ تو نشاں رہے
مطلب زباں پہ آ نہ سکا رعبِ حسن سے — ہم اس کی بزم میں جو رہے بے زباں رہے

بے یار و غمگسار رہی اپنی کٹی خلوص!
دُنیا میں مثلِ یوسفِ بے کارواں رہے

○

گھڑی بھر چین دل نے وصل میں پایا نہ فرقت میں — الٰہی کیا اثر رکھا ہے تُو نے اس محبت میں
ترے بے وعدہ آنے نے بڑھایا رتبہ عاشق کا — شہادت پائی اس نے ڈوب کر بحرِ ندامت میں
ڈرانے کیلئے وہ ہاتھ میں تلوار لائے تھے — یہاں تو زور پیدا ہو گیا شوقِ شہادت میں
نہ پوچھو مجھ سے کچھ تعریف دیکھو آئینہ دیکھو! — نکالوں عیب پھر کس میں نکالوں ایسی صورت میں!

خلوصِ خانماں برباد ہو اور آپ کا کوچہ
بڑی تقدیر پائی جیتے جی گویا ہے جنت میں

○

اس کو سمجھو، جو سمجھ سے دُور ہے — معرفت کا ایک ہی دستور ہے
کون سمجھے عقل خود معذور ہے — پاس وہ جتنا ہے اُتنا دُور ہے
بندہ سب کچھ ہو کے پھر کچھ بھی نہیں — اس طرح مختاریوں مجبور ہے
شیخ صاحب غیر میں سمجھوں کیسے — ذرے ذرے میں اسی کا نور ہے
کیوں ہے تو تسکین کا طالب خلوص — دل تڑپنے کے لیے مامور ہے

خلیق ــــــ محمد حسین

جناب محمد حسین خلیق حیدرآباد کے متوطن اور جامعہ نظامیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ معلمی کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ شاعری کا ذوق اوائل عمری کا تھا۔ شعر سلجھے ہوئے اور چست کہتے تھے۔ اکثر رسائل میں ان کا کلام شائع ہوا ہے۔ ابتداً حضرت کیفی مرحوم سے تلمذ اختیار کیا۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت صفی اورنگ آبادی کے تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ اس طرح وہ حضرت صفی کے استاد بھائی بھی تھے اور شاگرد بھی۔

تاریخ پیدائش و انتقال اور تصویر دستیاب نہ ہوسکی۔

(نمونۂ کلام)

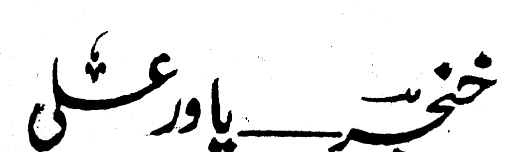
کیوں نہ ہو ناز کے قابل یہ مقدر اپنا
مصطفےٰ اپنے ادھر خالقِ اکبر اپنا

زلف مشکیں کا تصور رخِ انور کا خیال
رات دن شغل یہی رہتا ہے اکثر اپنا

خلیق اب باز آئیں آپ عشقِ زلف و عارض سے
کہ جھگڑا چھڑ گیا ہے آج کل ہندو مسلماں کا

شاد ہے وہ جس کے پہلو میں دلِ ناشاد ہے
جو اسیرِ زلف ہے تیرا وہی آزاد ہے

[سخن ورانِ دکن]



تاریخ پیدائش: رمضان المبارک ۱۳۱۹ھ ٭ تاریخ وفات: جون ۱۹۵۲ء

حضرت یاور علی خنجر مرحوم حضرت میر لیاقت علی سیف مرحوم مہتمم خزانہ پائیگاہ نواب معین الدولہ بہادر کے فرزندِ اکبر تھے۔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور علوم شرقیہ میں فارغ التحصیل تھے۔ انگریزی تعلیم سے بھی بہرہ ور تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے والد مرحوم کی خدمت پر مہتمم خزانہ پائیگاہ مقرر ہوئے اور انتقال تک خدمت انجام دی۔ نواب معین الدولہ بہادر کے انتقال کے ۱۲ سال بعد جون ۱۹۵۲ء میں انتقال کیا۔ اور ریاض مدینہ میں اپنے پیر و مرشد کے پائین دفن ہیں۔

ذوقِ شعری سوروثی تھا۔ نہایت کم عمری ہی سے چست شعر کہا کرتے تھے۔ حضرت صفی کو جب نواب معین الدولہ بہادر نے باریاب کیا تو وہاں ان کو بالمشافہ سُن کر ان کے استادانہ رنگ سے بے حد متاثر ہوئے اور شاگرد ہونے کی درخواست کی جس کو حضرت صفی نے بخوشی قبول کر لیا۔ اس طرح یہ حضرت صفی کے دَورِ اول کے تلامذہ میں سے ہیں بلکہ ان میں بھی کافی سینئیر تھے۔ شعر اپنے والد لیاقت علی سیف کے رنگ میں کہتے تھے لیکن حضرت صفی سے تلمذ حاصل کرنے کے بعد ان کا رنگ اختیار کر لیا۔ ذخیرۂ کلام اتنا ہے کہ دو ضخیم دیوان طبع ہو سکتے ہیں۔ لیکن اپنوں اور زمانے کی روایتی کس مپرسی کے باعث کلام کا ایک معمولی گلدستہ بھی طبع نہ ہو سکا۔

(نمونہ کلام)

موسیٰ کی آرزو تو نکل جانے دیجیے ٭ جلتا ہے کوہ طور تو جل جانے دیجیے

یاروں نے رینگ رینگ کے منزل کو پا لیا ٭ ہم راستے کے خار ہٹاتے ہی رہ گیا

آپ انگڑائی سوچ کر لیجئے
کہیں محشر بپا نہ ہو جائے

جس کو اپنا وہ بناتے ہیں مٹا دیتے ہیں
کس محبت سے محبت کی سزا دیتے ہیں

بتوں سے عشق تو کر دل کو بتکدہ نہ بنا
خدا کے گھر کو خدارا حرم سرا نہ بنا

ہمارے گورکن بھی چار آنسو
کوئی پھر قبر پر آئے نہ آئے

حسن گر مائلِ جفا ہوتا
عشق بے موت مر گیا ہوتا!

ہے جو جنت کی حقیقت وہ ہمیں معلوم ہے
کب بہکنے والے ہیں واعظ کے بہکانے سے ہم

آنکھ جب دیدہ ور ہو گئی!!
غیر کے غم میں تر ہو گئی

زندگی وقتِ آخر نہ آئی قریب
دور سے خیریت پوچھتی رہ گئی

گر کے ہم خود ہی سنبھل جائیں گے
دوستو تم نہ سنبھالو ہم کو!

پھر کسی موقع سے دیکھا جائے گا
یہ تقاضے روز کے اچھے نہیں!

کہتی ہے دل سے یاد کسی چشم مست کی
میں دیکھنے میں پھول کھٹکنے میں خار ہوں

منتخب اشعارِ صفی

ہم ذلتِ سوال گوارا نہ کر سکے
اور اُن کے ذہن میں کوئی سائل نہیں رہا

دوست دشمن پہ برابر کی پڑی جاتی ہیں
اُن نگاہوں کے نگہبان کہاں سے لاؤں

لاکھ سمجھائے کوئی لاکھ کوئی پاؤں پڑے
اُف رے بیدردی کسی پر نہ تری چھاؤں پڑے

کی ہم آغوشی کی خواہش غیر نے
آڑے ہاتھوں آپ نے مجھ کو لیا

خوشتر — ابوالہاشم سید محمد حبیب اللہ

جناب ابوالہاشم سید محمد حبیب اللہ خوشتر مرحوم حیدرآباد کے متوطن اور ایک مشائخ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

حضرت صفی اورنگ آبادی نے اپنے قلم سے جو فہرست تلامذہ ترتیب دی ہے اس کی بناء پر یہ ان کے حلقہ تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

ان کی تاریخ پیدائش و وفات دستیاب نہ ہوسکی، بعض قدیم تلامذہ صفی سے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ بڑے حلیم الطبع اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ شاعری کب سے کرتے تھے یہ بھی معلوم نہ ہوسکا۔ البتہ مولانا حامد قریشی تلمیذ امام الفن جلیل القدر حضرت جلیل مرحوم محرک و موسس اول ادارہ سخنستان کے مرتبہ گلدستہ سخن "سرمدی سویرا" میں جسے مولوی احمد معین الدین معتمد انتظامی کمیٹی درگاہ حضرت برہنہ شاہؒ نے شائع کیا ہے آپ کی ایک طرحی غزل موجود ہے۔ جو مولانا انیس احمد کلیم خلف حضرت جلیل مرحوم کی صدارت میں ۸ ار ڈسمبر ۵۶ء کو منعقدہ طرحی مشاعرے میں پڑھی گئی تھی بس وہی ایک غزل نمونہ کلام کے طور پر پیش کی جاتی ہے ؎

عجب شئے ہے یہ دنیا سے محبت پوچھتے کیا ہو
خدا کی ہے عطا اس کی عنایت پوچھتے کیا ہو

نہ شب کو نیند آتی ہے نہ دن کو چین آتا ہے
دلِ مضطر کی بے تابانہ حالت پوچھتے کیا ہو

بہار آئی گھٹا گھنگھور چھائی ہے گلستاں پر
پھر ایسے وقت ساقی کی عنایت پوچھتے کیا ہو

جگر میں ٹیس سی اک گدگدی سی دل میں ہوتی ہے
حسین بانکی نرالی اچھی صورت پوچھتے کیا ہو

جہاں اس کا خیال آیا وہیں سجدے میں سر رکھا
جناب شیخ خوشتر کی عبادت پوچھتے کیا ہو

خیالی ـــــ محمد عبدالحمید خاں

تاریخ پیدائش: جمادی الآخر ۱۳۰۸ھ؛ تاریخ وفات: ۱۹۶۰ء

حضرت محمد عبدالحمید خاں خیالی مرحوم حضرت محمد عبدالکریم خاں مرحوم کے فرزند ہیں۔ ماہ جمادی الآخر ۱۳۰۸ھ میں تعلقہ گوڑنگل میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد منتقل ہونے کے بعد جامعہ نظامیہ سے مولوی فاضل کا امتحان کامیاب کیا، اور محکمہ نظامت اُمورِ مذہبی سرکارِ عالی میں بحیثیت منتظم ملازم ہوئے جہاں ان کے ذمہ صیغہ اعراس تھا۔ ریاستِ حیدرآباد سے جو رقومات حرمین شریفین اور اجمیر شریف کو روانہ کی جاتی تھیں اس کی نگرانی کا کام ان کے ذمہ تھا۔ ان کے والد حضرت محمد عبدالکریم خاں کشن گڈھ اجمیر شریف کے باشندے تھے اور حیدرآباد میں جمعداران مندوزئی کے مختار عام تھے۔ حیدرآباد آنے کے بعد محلہ چیلہ پورہ میں حضرت نوراللہ حسینیؒ کے مکان "طریقت منزل" سے متصل مکان خریدا جس میں حضرت خیالی مرحوم بھی تادم آخر سکونت پذیر رہے۔ اسی مکان میں دبستان صفی کے ماہانہ طرحی و غیر طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ایک مشاعرے میں حضرت جگر مرادآبادی بھی شریک ہوئے تھے۔

حضرت صفی کی زندگی ہی میں ۱۹۵۳ء میں "بزم تلامذہ صفی" کا قیام عمل میں آچکا تھا جس کے خود حضرت صفی سرپرست تھے۔ حضرت صفی کے انتقال کے بعد اس کے سرپرست حضرت غلام علی حاوی مقرر ہوئے۔ ان ہی دنوں میں ایک اور "بزم ادبستان صفی" کا قیام عمل میں آیا جس کے سرپرست حضرت خیالی بنائے گئے اور اس کے پہلے ادبی اجلاس و مشاعرے میں ان کی جانشینی کا اعلان کیا گیا۔

حضرت خیالی ایک فطری اور پرگو شاعر تھے۔ ابتداء میں نواب جہانگیر علیخاں

آنف دہلوی سے مشورۂ سخن کیا۔ اس کے بعد حضرت عبدالولی فروغ شاگرد حضرت داغ
دہلوی کے شاگرد ہوئے جن سے خود حضرت صفی بھی مشورۂ سخن کرتے تھے۔ اس
طرح یہ حضرت صفی کے استاد بھائی بھی ہوتے تھے۔ حضرت فروغ کے انتقال
کے بعد اپنے استاد بھائی حضرت صفی اورنگ آبادی سے رجوع ہو گئے۔ اس
وقت حضرت کے تلامذہ میں حضرت یاور علی خنجر، حضرت بہادر علی جوہر، سید غوث لقیق اور حضرت
غلام علی ہادی سر فہرست تھے۔ جب حضرت خیالی اس حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے تو دورِ اول کے
تلامذہ میں پانچواں درجہ پایا۔ ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ یہ حضرت صفی سے عمر میں دو سال بڑے تھے۔

ان کا ذخیرۂ کلام بہت ہے لیکن کوئی مجموعہ کلام طبع نہیں ہو سکا۔ البتہ رسالہ
نورس کے غزل نمبر ۱۹۵۸ء میں ان کا کلام چھپا ہے۔ اور کتاب سخنورانِ دکن مؤلفہ
تسکین عابدی میں ان کا ذکر و نمونہ کلام ملتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا اور زینت پورہ
کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

(نمونہ کلام)

اے باغباں جو رہتا بلبل کا دوست بن کے
پھولوں کے دام بکتے کانٹے ترے چمن کے

پہلے دشمن کی طرف ہاتھ نہ یوں بڑھتے تھے
اور انداز ہے اب تو تری انگڑائی کا

بغیر درد لطف زندگی کیا!
سفر کے سب مزے ہیں ہمسفر سے

عمر گزری ہے نگاہِ مست ساقی دیکھتے
کیا کریں اب امتیاز بادہ و پیمانہ ہم

شوق کیا چیز ہوا کرتا ہے اللہ اللہ
وہ دکھائی نہیں دیتا ہے مگر دیکھتے ہیں

اب اسی کا جی نہ چاہے تو کسی کا کیا قصور
بیچ والوں نے تو جتنا ہو سکا اتنا کیا

کتنے منظر دیکھ ڈالے کتنے منظر رہ گئے
تشنہ کام دید پھر بھی دیدۂ تر رہ گئے!

بولنے سے تلخیاں کم ہو گئیں غم کی تو کیا
دل میں کچھ گزری ہوئی یادوں کے نشتر رہ گئے

اس قدر دل بجھ گیا ہے کثرتِ آلام سے
اے خیالی ہم نہ رہنے کے برابر رہ گئے

دل کی چوٹیں دیکھتے یا دیدۂ تر دیکھئے
زندگی جو کچھ دکھائے زندگی بھر دیکھئے

میں نہیں کہتا کہ حالِ دل مکرر دیکھئے
بن گئے ہیں کتنے احساسات نشتر دیکھئے

اُن کے جلوے تو بہرحال ان کے جلووں میں مگر
دیکھنے والی نگاہوں کا مقدر دیکھئے

آدمیت وسعتِ فکر و نظر کا نام ہے
جس کسی کو دیکھئے اپنے برابر دیکھئے

ہے بہت آساں کنارے سے خیال آرائیاں
رہ کے طوفانوں میں طوفانوں کے منظر دیکھئے

یہ سکوتِ ظاہری کیوں ہے مجھے معلوم ہے
وہ ذرا آجائیں تو پھر دل کے تیور دیکھئے

ان کی محفل میں خیالی جا رہے تو ہیں مگر
کیا خبر کیا رنگ لائے قلبِ مضطر دیکھئے

عیش بھی بنیادِ غم پایا گیا
غم گئے اور لطف جینے کا گیا

زندگی پھر اتنی فرصت دے نہ دے
دیکھ جب تک بھی اسے دیکھا گیا

اب نہیں چھپتا نگاہوں میں کوئی
آپ کا جلوہ قیامت ڈھا گیا

دردِ دل ہر ایک کو ملتا نہیں
یہ جسے بخشا گیا بخشا گیا

اے خیالی دل کو وہ تڑپا گئے
اور میرا دل مجھے تڑپا گیا

حضرت خیالی کا ایک لڑکا پولیس ایکشن میں محاذ پر جاکر آج تک لاپتہ ہے ان کا مکان بھی فروخت ہو چکا ہے۔

صفی کے منتخب اشعار

اے صفی اب دکن کہاں وہ دکن !!
اب تو ہندوستان ہے پیارے

موت کو کیوں بلا رہے ہو صفی !
دردِ دل کی دوا نہیں کرتے !

ذرا سی بھی کمی ہو نفس میں تو تم ہی سمجھو
نہیں ہوتا ہے کچھ دو چار گز کا ڈھلک کم بھی میں

قرض کی پی ہے ایک حضرت نے
لوگ تو بھی ادھار کرتے ہیں

کدھر کدھر کے چلے آتے ہیں یہ بے دولت
کہاں کہاں کے تمہارے مکاں میں بستے ہیں

راغب ـــــ محمد عبدالرحیم

تاریخ پیدائش: ۵ جولائی ۱۹۲۴ء

جناب عبدالرحیم راغب فاروقی کے والد مولوی محمد علی فاروقی کا اصل وطن موضع کنجرلہ کلاں تحت پٹن چیرو تعلقہ کلیگور ضلع میدک ہے۔ جناب راغب حیدرآباد میں محلہ گولی گوڑہ مسجد بنگ کے قریب موقوعہ مکان میں ۵ آذر ۱۳۳۳ ف م ۵ جولائی ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے۔ تحتانوی تعلیم مدرسہ تحتانیہ اردو شریف فوقانی تعلیم مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم میں پائی اور ۱۹۴۶ء میں میٹرک کامیاب کیا۔ دوران ملازمت "مدھیہ بھارت انٹر" ۱۹۶۲ء میں کامیاب کیا۔ اور ۱۹۶۴ء میں بی اے عثمانیہ کا امتحان کامیاب کیا۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد محکمہ پولیس میں محاسب پولیس پٹیلہ برج حیدرآباد کے تحت کوتوالی میں تقرر عمل میں آیا اور ۱۹۸۴ء میں منتظم دفتر کوتوالی کی ملازمت سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

ذوق شعرگوئی بچپن ہی سے تھا جو دارالعلوم میں تعلیم کے دوران اپنے ہم جماعت شاعر طلباء کی صحبت میں اور پروان چڑھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنی شاعری کو پروان چڑھانے کے لیے کسی استاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کا خیال آیا تو نظر حضرت صفی اورنگ آبادی پر اٹھی اور بالآخران کے دور آخر کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوگئے، اور حضرت صفی کے انتقال ۱۹۵۴ء تک ان سے وابستہ رہ کر استفادہ سخن کرتے رہے۔

مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے جس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ پہلے پہل ترنم سے کلام سناتے تھے جس کو بعد میں ترک کردیا اور اب تحت اللفظ کلام سناتے ہیں۔

حضرت صفی کے انتقال کے بعد بعض سرگرم تلامذہ صفی نے ایک "بزم ادبستان صفی" کے نام سے قائم کی۔ اور جناب راغب کو معتمد عمومی کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔

جناب راغب کا کلام اکثر مقامی روزناموں کے علاوہ بیرونی ماہناموں میں بھی شائع ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔ حال ہی میں یعنی ۲۲ ستمبر ۱۹۹۰ء کو مشہور ہفتہ وار بلٹز میں ان کی ایک نظم "خلیج کی نذر" شائع ہوئی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے بھی ۱۹۸۵ء سے کلام نشر کرتے ہیں۔ ۲۶ فروری ۱۹۸۹ء کو آل انڈیا ریڈیو میں پہلی بار فی البدیہہ مشاعرہ منعقد ہوا تو اس میں جناب راغب بھی سرز خواجہ شوق، نظیر علی عدیل، حیدر رونق، اشرف حیدرآبادی، فاروق شکیل، قائم جعفری وغیرہ کے ساتھ مدعو تھے۔

کوئی مجموعہ کلام اب تک شائع تو نہیں ہوا۔ لیکن غزلوں کا ایک مجموعہ نظموں کا ایک مجموعہ اور حمد و نعت پر مشتمل کلام کا ایک مجموعہ قریب قریب مرتب ہو چکا ہے۔ جس کی عنقریب اشاعت عمل میں آنے والی ہے۔

(نمونہ کلام)

ہر آنے والا باعث تسکین دل نہیں
یارب وہ آئے جس کا مجھے انتظار ہے

ضبط کرتا ہوں تو اٹھتا ہے دھواں سینے سے
آہ کرتا ہوں تو توہین وفا ہوتی ہے

غم بھی دیا تو قوتِ برداشت دیکھ کر
احسان دیکھئے مرے پروردگار کا

یہ داغ داغ زمیں منتشر خس و خاشاک
گماں ہے قافلے اکثر یہاں پہ ٹھہرے ہیں

حسن دونوں میں عیب دونوں میں
صبح اجلی ہے اور کالی رات

کرے گا کون بھرا ایسے شخص کی یارب
بھٹک رہا ہے جو ہاتھوں میں روشنی لے کر

جب اس کو نیند آگئی ہم خود بھی سو گئے
وہ دل تمام عمر جو بے خواب تھا میاں

چاند سورج اگا تے ہیں لوگ
خوب ہے شاعری کی زمین!

دونوں عالم کی دولت ہے یہ
بجھ نہ جائے چراغِ یقیں!

حسن والے جانتے ہیں اپنے دیوانوں کی بات
شمع سے پوچھو کبھی تم اس کے پروانوں کی بات

تم نے پہچان لیا فضل خدا ہے راغب
ہر کوئی ان کی نگاہوں کو سمجھتا کیسے

کاغذ تو تھا طویل درِ قتل گاہ پر
لیکن تھا میرا نام ہی اس پر لکھا ہوا

دیکھا تھا حق شناس کچھ آئے تو تھے وہاں
حیرت ہے خشک پیڑ تھا کیسے ہرا ہوا

قاتلو اپنے عزائم پہ نظر رکھو تم
ناتوانوں میں بھی کچھ تاب و تواں ہوتی ہے

فلک عدو سہی الفت کی خو بھی رکھتا ہے
بنے ہیں ہجر میں انجم رفیق تنہائی

غرورِ فیل ، ابابیل نے کچل ڈالا
نہ سمجھا ابرہا بیت الحرم تیرا ہے

طیبہ کے ذرے ذرے میں عظمت خدا کی ہے
ہر سمت روشنی مرے شمس الضحیٰ کی ہے

چار دن کی زندگی اور آدمی
چاہتا ہے ساری دُنیا چاہیے

آج تک ہم نے جسے دل میں بسا رکھا تھا
ہائے افسوس وہ اپنا نہیں بیگانہ تھا

کس طرح پیار ہوا یہ بھی عجب قصہ تھا
پیار بن جائے گا خنجر یہ نہیں سمجھا تھا

مجھے وہ حوصلہ کیجئے عطا محبوبِ سبحانیؒ
کہ ظالم ظلم کی پائے سزا محبوبِ سبحانیؒ

خدا بھی اس سے خوش ہے اور محبوبِ خدا بھی خوش
رہا جو کوئی غم سے باوفا محبوبِ سبحانیؒ

صفیؔ کے منتخب اشعار

کیا کہوں منہ سے کہ قرآن سند ہے ورنہ
حمد کا لفظ تو زیبا تھا محمدؐ کے لیے

نفس ہے گنبدِ خضرا کے نظر آنے تک
میں نے اس سانپ کو پالا ہے زمرد کیلئے

وہ جلوہ اور طورِ مقدس پہاڑ کے
کیسی شراب کس کو پلا دی پچھاڑ کے

بچے نہیں ہیں آپ کھلونا نہیں ہوں میں
جب جی میں آئی پھینک دیا توڑ تاڑ کے

آلائشِ زمانہ سے دامن بچا صفیؔ
"کتا بھی بیٹھتا ہے جگہ اپنی جھاڑ کے"

ربط — صاحبزادہ میر رحیم الدین علیخان

تاریخ پیدائش ۱۱؍اپریل ۱۹۲۵ء تاریخ وفات ۱۹؍مارچ ۱۹۸۷ء

صاحبزادہ میر رحیم الدین علیخان ربطؔ مرحوم صاحبزادہ میر نظام الدین علیخان (مغل پاشا) کے فرزند ہیں مارچ ۱۹۲۶ء میں دیوڑھی جہاندار جاہ موقوعہ ہری باؤلی حیدرآباد میں آنکھ کھولی۔ میٹرک تک جاگیردار کالج اور سٹی کالج میں تعلیم حاصل کر کے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا اور گریجویشن کی تکمیل کی۔ یہ اس دور کے طیلسانین ہیں جب طبقہ صاحبزادگان میں موود دے چند سے طیلسانین ہوا کرتے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں صاحبزادہ اشرف الدین علیخان لکچرار نظام کالج اور صاحبزادہ شرف الدین علیخان ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ہیں۔ بی اے کامیاب کرنے کے بعد محکمہ مارکٹنگ میں مہتمم مارکٹ کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد اور اکثر اضلاع میں گزارنا پڑا۔ اور جب ڈپٹی ڈائرکٹر ہوئے تو مستقلاً حیدرآباد میں تعیناتی عمل میں آئی جہاں سے وہ جوائنٹ ڈائرکٹر کے عہدہ سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے بہ عارضۂ کینسر ۱۹۸۷ء میں طویل علالت کے بعد انتقال کیا اور احاطہ جلوہ گاہ حضرت محمد حسین ابو العلائی واقع آغا پورہ میں تدفین عمل میں آئی۔

شاعری کا ذوق بچپن سے تھا۔ میلان طبع غزل کی طرف زیادہ تھا۔ نظمیں بھی کہی ہیں۔ حضرت صفیؔ چونکہ ان کے والد مغل پاشا مرحوم کے دوست تھے اور اکثر دیوڑھی میں آتے جاتے تھے اس لیے ان سے تلمذ اختیار کیا۔ ان کے ذوق کو دیکھتے ہوئے حوصلہ افزائی کی غرض سے ان کے والد اکثر دیوڑھی میں مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے جن میں حضرت صفیؔ کے علاوہ سعید شہیدی، نظیر علی عدیل، ارادت جہاندار جاہی، جہاندار افسر، خواجہ شوق وغیرہ شرکت کر چکے ہیں۔ سرمایہ کلام اتنا مختصر ہے کہ ایک گلدستہ بھی طبع نہیں کیا جاسکتا۔

(نمونہ کلام)

نیند میری رفیقِ ہجراں تھی! — یہ بھی اب رات بھر نہیں آتی

غریبوں کی وہاں پرسش ہی کب ہے — بھلا ہم کیا ہماری آرزو کیا

معشوق بن گیا تو میرا بھی بُرا نہیں — جس وقت آنکھ لڑتی ہے کچھ سوجھتا نہیں

ریا شریک ہے زاہد تری عبادت میں — نہ جا سکیں گے فرشتے بھی تیرے جنت میں

بہارِ گل کو کب وہ سیر کے قابل سمجھتے ہیں — ہر اک ٹوٹے ہوئے غنچے کو میرا دل سمجھتے ہیں

وہی ہم وہی دل وہی دل کی حسرت — قیامت میں بچھڑے ہوئے مل گئے ہیں

وہ عذرِ گنہ یہ کہہ رہے ہیں — یہ دوسری آپ نے خطا کی

خارِ غم سے زندگی دشوار ہے — ایک برچھی ہے کہ دل کے پار ہے

کام سارے منحصر ہیں وقت پر — موت کو بھی زندگی درکار ہے

وہ بھولنے کی بات ہے کہتے ہیں جس کو موت — وہ دیکھنے کی چیز ہے دنیا کہیں جسے

ہم بھی پیتے نہیں ہیں مے اے رابط
جب گھٹا جھوم کر نہیں آتی

صفی کے منتخب اشعار

بدحواسی عشق میں دن رات ہے
زندگانی ہو بہو سکرات ہے!

آدمی اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے
نیک و بد دنیا کا ہاتھوں ہات ہے

ہم نشیں! خاموش جی گھبرا گیا
یہ تری باتیں ہیں، یا برسات ہے

حسن سے خالی صفی کی شاعری
عیب سے خالی خدا کی ذات ہے

رضاؔ ـــــ محمد عبدالرزاق فاروقی

تاریخ پیدائش ۱۹۰۵ء تاریخ وفات ۸ ؍مئی ۱۹۶۲ء

جناب محمد عبدالرزاق رضاؔ فاروقی نے ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد کے محلہ شاہ گنج میں اپنے والد حضرت محمد زماں فاروقی کے گھر میں آنکھ کھولی اور ۸ ؍مئی ۱۹۶۲ء کو یعنی نصف صدی سے سات سال زیادہ جی کر دنیا سے آنکھ پھیر لی اور دائرۂ میر مومن رح میں دفن ہو گئے۔

جینے کے لیے جن دو اُمور کا لزوم ہے (یعنی تعلیم و معیشت) ان کی تکمیل اس طرح کی کہ ابتدائی تعلیم قاری فخر الدین سے حاصل کی۔ پھر جامعہ نظامیہ میں تعلیم حاصل کیجئے۔ معیشت کے لیے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ تجارت بھی ایسی کہ جس کے بغیر علم و ادب کی صوری تشکیل ممکن ہی نہیں یعنی ہر قسم کی روشنائی، سیاہی اور پنسل سے لے کر بال پن اور فونٹن پن کے بیوپار کے لیے "ہلال پن اسٹور" کے نام سے ایک شاندار دکان قائم کی۔ جو گلزار حوض کے پاس کرشنا ٹاکیز سے متصل واقع ہے۔ جس کو آج کل ان کے بڑے فرزند ضیاء فاروقی جو خود بھی شاعر ہیں بڑی تندہی سے چلا رہے ہیں۔

جہاں تک مشاعروں میں کلام سنانے کا تعلق ہے، جناب رضاؔ فاروقی اپنا کلام تحت اللفظ سناتے تھے۔ اردو ہال، ایوان اردو، بزم کامل اور بزم غالب میں منعقد ہونے والے مشاعروں کے علاوہ کرنول کے کل ہند مشاعرے میں بھی کلام سنا چکے ہیں۔ جس کی صدارت اُس وقت کے گورنر بھیم سین سچر نے کی تھی۔ اخبار د رسائل میں چھپنے کے سلسلے میں بھی یہ اپنے دیگر استاد بھائیوں کے مقابلہ میں نسبتاً آگے آگے ہی رہے۔ یعنی ان کا کلام روزنامہ رہنمائے دکن، روزنامہ

ہمدم، روز نامہ "انگارے" کے علاوہ ماہنامہ ارشاد، ماہنامہ سب رس اور ماہنامہ نقوش کراچی (پاکستان) میں بارہا چھپ چکا ہے۔

جناب رضا فاروقی حضرت صفیؔ کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ حضرت صفیؔ کی زندگی تک بڑی باقاعدگی سے شعر گوئی کی، مشاعروں میں بھی پابندی سے شرکت کرتے رہے لیکن ان کے انتقال کے بعد انھوں نے شعر گوئی سے قریب قریب کنارہ کشی اختیار کرلی۔ استاد بھائیوں اور احباب کے توجہ دلانے پر بڑے دلگیر لہجے میں کہتے کہ اب شاعری میں مزہ نہیں رہا۔ تاہم یادِ صفیؔ کے سلسلہ میں اکثر اپنے مکان "مامنِ علی" موقوعہ سلطان شاہی پر ماہانہ اور سالانہ شعری محفلیں منعقد کرتے رہے۔ جن کے منجملہ بعض مشاعروں میں محترمہ اشرف رفیع (موجودہ صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ) پس پردہ رہ کر اپنی طرحی غزلیں سناچکی ہیں۔

(نمونہ کلام)

نیرنگِ جلوہ ہے کہ کمالِ نظر کہوں
بے پردہ آگیا کوئی بے اختیار آج

ان کے خرامِ ناز نے پامال کردیا
میرا مزار ہے نہ نشانِ مزار آج

غم زیادہ مری خوشی کم ہے
یا شعورِ خود آگہی کم ہے

ان کے کوچے میں جارہا ہے مگر
دل کو اُمیدِ واپسی کم ہے

ہر ایک بات یہ کھاتے ہیں وہ خدا کی قسم
خدا کو لوگ سمجھتے ہیں کیا خدا معلوم

یہ کون لے رہا ہے رضاؔ دل میں چٹکیاں
یہ کس کی یاد مجھ کو ستاتی ہے شام سے

تجارتی کاروبار میں بھی رضاؔ کی مشقِ سخن ہے جاری
ہزار طوفان آرہے ہیں یہ ناو کاغذ کی چل رہی ہے

نہ جانے ہوتی ہیں دربار داریاں کیسی
نہ ہاں میں ہاں کا سلیقہ نہ جی بجا معلوم

سوچ میں ہے مزاج دھاروں کا
کھُل نہ جائے بھرم کِنا روں کا

حالِ دل کیا کہیں اسوقت میں کیا ہوتا ہے
جب گلے مل کے کوئی ہم سے جُدا ہوتا ہے

تم جو کہتے ہو کہ احساس ہے غم کا میرے
صرف احساس ہی احساس سے کیا ہوتا ہے

جان بھی عشق میں دے دینے سے کیا ہوتا ہے
حق محبت کا بھلا کس سے ادا ہوتا ہے

ترتیب بزم اور ترے اہتمام سے — اچھے اصول بنتے ہیں اچھے نظام سے

آپس کی دوستی کے مسائل سلجھ گئے — ماحول ساز گار ہوا انتقام سے

مرا یہ حال نہ کرتے تو اور کیا کرتے — انھیں تو سب کو تماشا مرا دکھانا تھا

ھمیں ابھرتے ہیں موجوں سے کھیلنے کیلئے — وہ لوگ ڈوب گئے جن کو ڈوب جانا تھا

غریب آپ کے ہر دور میں رہے مجبور — نہ یہ زمانہ ہے ان کا نہ وہ زمانہ تھا

خلوص ہو گیا معلوم یار لوگوں کا — دلوں میں دشمنی ظاہر میں دوستانہ تھا

چاہنے والا ترا سب میں تماشا کیوں نہ ہو — جب ترا منشا ہی ایسا ہے تو ایسا کیوں نہ ہو

لگی کچھ آنکھ ایسی موت کی ٹھنڈی فضاؤں میں — کہ میں نے پڑھتے پڑھتے زندگی کی داستاں رکھ دی

یہ کوئی آنا ہے قربان ایسے آنے کے — تمہارے پاؤں سے لپٹی ہوئی سحر آئی

حال تیرا دلِ پر سوز بتا کیا ہوگا — شمع کی لو کا ہے انجام دھواں ہو جانا

کیا ہنسیں پھول آپ کے آگے — منہ اُتر جائے گا بہاروں کا

جناب رضا فاروقی مالک ہلال پن اسٹور (گلزار حوض) کے ہم شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اپنے والد کے حالات، نمونہ کلام اور تصویر مرحمت فرمائی۔

صفی کے منتخب اشعار

یہ تکیہ اور بستر ٹھاٹھ ہیں سب اہلِ دنیا کے
جنھیں اُس پر ہے تکیہ اُن کو تکیہ ہے نہ بستر ہے

حضورِ دوست، منہ سے کیا نکالوں بزمِ دشمن میں
الٰہی ! دم بخود ہوں غیر کا گھر تھوک کا ڈر ہے

جہاں اس کی اماں ہو، لاکھ دشمن ہوں تو کیا پرواہ
وہاں جالے کو مکڑی اور انڈے کو کبوتر ہے

نہیں بڑھتے ہیں اپنی حد سے زندے ہوں کہ مردے ہوں
سب اُتنے پاؤں پھیلاتے ہیں جتنی انکی چادر ہے

رفعت ــــ سید مبارز الدین

پیدائش ۱۹۱۸ء ٭ تاریخ وفات ۱۸ر جون ۱۹۷۶ء

جناب سید مبارز الدین رفعت حیدرآباد کے اک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو برسوں رشد و ہدایات کا مرکز رہا ہے۔ حضرت سید محمود مکیؒ (مکی میاں) ان کے نانا تھے جو مشہور پیر طریقت گزرے ہیں ان کے جد اعلیٰ حضرت سید شاہ حبیب اللہ تھے جن کا مزار موتی گنبد کے نام سے مشہور ہے ان کا خاندان نلور اور مدراس سے ہوتا ہوا حیدرآباد پہنچا اور یہیں کو سکونت پذیر ہوگیا۔

جناب سید مبارز الدین رفعت (رفعت ان کا عرف ہے) جس کو جزو نام بنا لیا گیا پیدائش حیدرآباد کی ہے تعلیم کے مختلف مراحل طے کرکے انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے ۴۳ ۱۹ء میں فارسی سے ایم اے کیا ۴۵ ۱۹ء میں سٹی کالج میں فارسی کے لکچرر ہوئے۔ ۴۸ ۱۹ء میں اورنگ آباد کالج تبادلہ ہوگیا۔ بزمانہ قیام اورنگ آباد ناگپور سے اردو میں ایم اے کیا ۵۴ ۱۹ء میں اورنگ آباد میں اور ۵۴ ۱۹ء سے ۶۳ ۱۹ء تک نو سال گلبرگہ میں رہے پھر ۶۳ء سے ۷۳ء تک مہارانی کالج میسور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور دس سال تک اس عہدہ پر فائز رہنے کے بعد بعمر ۵۵ سال ۷۳ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے اور میسور ہی میں مقیم رہے۔

جناب رفعت کو زمانہ طالب علمی ہی سے لکھنے کا شوق تھا۔ وہ رسالہ "الموسیٰ" اور مجلہ عثمانیہ کی ادارت بھی کرچکے ہیں۔ کئی انگریزی اور فارسی مضامین اور کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ کئی تراجم شائع بھی ہوچکے ہیں جن میں "عرب اور اسلام"، "اسلامی فن تعمیر" اور "تاریخ ادبیات ایران" شامل ہیں دوسری تصانیف میں "مشاہیر کی بیویاں" "پن چکی" "مقام غالب"، مقام جمال الدین افغانی اور سجاد حیدر یلدرم

وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ادارۂ دانش وحکمت حیدرآباد کی جانب سے افسانوں کا مجموعہ "دامنِ تہی" ۱۹۴۲ء میں طبع ہوا۔

جناب ابوالنصر خالدی کے برادر نسبتی ہوتے ہیں اور خالدی صاحب کے ذریعہ ہی حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے ان کا شمار حضرت صفیؔ کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں ہوتا ہے۔

نثر نگاری اور علمی تحقیقی کاموں میں مصروفیت کے باعث شعرگوئی کی طرف توجہ نہیں دے سکے ابتدائی زمانے میں شاید دو چار غزلیں کہی ہوں گی جن کے (۳) شعر درج ذیل ہیں۔

تم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا
اک انقلاب باعثِ صد انقلاب ہے

تفسیر زندگی ہے مری اتنی مختصر
اُڑتا ہوا غبار رہِ کارواں ہوں میں !

اُلفت کی لگی آگ بجھانے سے بجھے کیا
اشکوں نے بجھادی تو پھر آہوں نے لگادی

جناب مبارز الدین رفعت کو ترجمہ کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا اس باب میں ان کے دو ترجمے [فلپ ہِٹی کی "عرب اور اسلام" انگریزی سے] اور "تاریخ ادبیات ایران" از رضا زادہ شفق فارسی سے اردو میں ترجمہ بہت مقبول ہوئے چنانچہ ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۸۵ء میں اس کتاب کا نواں ایڈیشن شائع کیا۔ "تاریخ ادبیات ایران" ایم اے کے نصاب میں شریک ہے۔

کثرتِ کار اور سگریٹ نوشی کی بے اعتدالی نے بلڈ پریشر کا عارضہ پیدا کر دیا ۱۹۷۲ء میں جسم کے بائیں حصہ پر فالج کا حملہ ہوا۔ جمعہ ۱۸ر جون ۱۹۷۶ء نصف شب اچانک قلب بند ہوجانے سے میسور میں انتقال ہوا وہیں ٹیپو سلطان کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے اولاد میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں جو امریکہ، ریاض اور میسور ہی میں مقیم ہیں۔

نثر نگاری کا نمونہ :

" واقعی شوق اور آرزو جب مچل کر میدان میں آجاتے ہیں تو ضبط و احتیاط عزم و اختیار کی ایک نہیں چلتی انہیں مجبوراً کسی کونے میں ہٹ جانا پڑتا ہے کسی گوشے میں پناہ لینی پڑتی ہے " ۔ [دامن تہی]

دامن تار تار گریباں چاک چاک، پیوند کو ٹکڑا نہیں، رفو کا سامان نہیں، سامانِ حیات نہیں، ہمت نہیں، حوصلہ نہیں نیند اچاٹ، قہقہہ بے رس، آنسو بے اثر سانسیں بے ڈھنگی، شوق ٹھنڈا تمنا فضول، آرزو بے حاصل، صحت بیماری کے کانٹوں میں الجھی ہوئی، نظر سطحی دل و دماغ کی استعداد فکر و عمل کے لیے بالکل ناکافی ۔ [دامن تہی]

—— ایک بھٹکا ہوا مسافر، منزل سے دور، تھکا ہارا، مریض پریشاں، مفلس، نادار، بھوکا پیاسا، بےحیا، بےغیرت تادم مرگ شرمسار کھویا ہوا، بے سروساماں، خالی ہاتھ بے دست و پا، بے یار و مددگار،

موجیں مارتا سمندر اور ٹوٹی پھوٹی کشتی، بے آب و گیاہ، ریگستان، راہی بے مرکب، بے قافلہ چلچلاتی دھوپ، چٹیل میدان، گھنا جنگل تاریکی اور وحشت، بوکھلایا ہوا، گھبرایا ہوا، بے بضاعت، بے مایہ لڑکھڑاتی چال، اندوہ گیں حال، حسرت بھری آہیں آوارہ و سرگرداں، خانہ بدوش، آغاز سے رنجور انجام سے مجبور ——
(دامن تہی)

میں رفعت مرحوم کے بھانجے داماد جناب معین الدین عزمی کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ میرے مطالبہ پر حالات ۔ تصانیف کے اقتباسات اور تصویر مرحمت فرمائی ۔

صیاد نے اشارہ کیا میں سمجھ گیا
باتیں پکار کے نہیں کرتے شکار میں (صفی)

رفیق ——— اکبر علی القادریؒ

جناب اکبر علی رفیق القادری حضرت صفی کی بقلم خود مرتبہ فہرست تلامذہ کے بموجب ان کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ سوائے (۳) غزلوں کے چند اشعار کے زندگی اور شاعری سے متعلق کسی قسم کا مواد کہیں سے نہیں مل سکا کیونکہ ایک عرصہ قبل وہ پاکستان منتقل ہو چکے ہیں۔

نمونہ کلام

سرِ بالیں مریضِ غم کی حالت پوچھتے کیا ہو
ہے مرغ روح اب مائل بہ رحلت پوچھتے کیا ہو

تمہارا دل تو ہے نا آشنا دردِ محبت سے
محبت کرنے والوں سے محبت پوچھتے کیا ہو

ہے قاتل نازنیں تلوار نازک خوشنما مقتل
پھر ایسے میں ہر شوقِ شہادت پوچھتے کیا ہو

رفیقِ زار اب کیونکر سنائے قصۂ فرقت
خود اس کی ہو گئی ہے غیر حالت پوچھتے کیا ہو

○

وہ آنکھ ہے کب جس میں ذوقِ دید نہ ہو
وہ دل بھی دل نہیں جب حسرتِ وصال نہیں

مذاق اُڑانے پہ کیوں تل گئے نظر والے
مرا نصیب اگر میرے حسبِ حال نہیں

رسائی تو ذرا دیکھو مری نگاہوں کی
وہ شکل دیکھی ہے جسکی کوئی مثال نہیں!

نہ ہو جو عشق تو پھر لطفِ زندگی کیا ہے
بغیر عشق کے جینا کوئی کمال نہیں

جو مانگنا ہے خدا سے ہی مانگتا ہوں میں
بجز خدا کے کسی سے مرا سوال نہیں

بہ فیضِ عشق میسر تو ہے غمِ الفت
رفیق یوں بھی پریشان و خستہ حال نہیں

○

حسن کی بڑھ گئی نگاہِ فلاح — عشق کو مل گئی ہے راہِ فلاح
خیر ہو میکدے کی اے ساقی — کچھ پلا دے مجھے ذرا ہ فلاح
بن گئے خارزار بھی گلشن — اس کو کہتے ہیں دستگاہِ فلاح
لڑ گئیں اس کی صلح جو آنکھیں — بڑھ گئی آج رسم و راہِ فلاح

درِ میخانہ کھل گیا ہے رفیق
مل گئی ہے تلاش راہِ فلاح

سرکاری اصطلاحات اور عشق

حکومت کے الفاظ لکھے ہیں ہم کو
یہ نامے ہیں یا "نیم سرکاریاں" ہیں

اُن سے لطفِ ستم آمیز کوئی کیا سمجھے
خط بھی آتے ہیں تو "محصول طلب" آتے ہیں

کوئی مجنوں کی عزت عشق کی سرکار میں دیکھے
بڑی خدمت پہ ایسا آدمی "مامور" ہوتا ہے

مجنوں کی قدر کچھ نہیں سرکارِ عشق میں
"اُمیدوار" "محکمۂ جنگلات" ہے

قصورِ بادہ نوشی ہے نہ اس میں جرمِ ساقی ہے
مرا بے ہوش ہونا "وارداتِ اتفاقی" ہے

رفیقؔ ـــــ الحاج غلام حسن قادری

ولادت ۲۲ر نومبر ۱۹۰۴ء ÷ وفات ۲۵ر اگست ۱۹۸۰ء

جناب غلام حسن قادری رفیقؔ جناب محمد غوث کے صاحبزادے تھے ۲۲ر نومبر ۱۹۰۴ء مطابق ۱۳ر رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ کو یاقوت پورہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ لاہور سے منشی فاضل کیا۔ ابتداً دفتر مہتمم خزانہ ضلع نلگنڈہ، صدر محاسبی حکومت نظام اور محکمہ امور مذہبی حیدرآباد میں خدمات انجام دیں آخر میں مددگار کوتوال بلدہ کی حیثیت سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ وظیفہ کے بعد تقریباً ۱۵ سال صرفخاص مبارک میں بحیثیت مددگار حساب خدمات انجام دیتے رہے۔

پہلے پہل حضرت عاصمؔ نلگنڈوی سے تلمذ حاصل رہا بعد میں حضرت صفیؔ کے آگے زانوئے ادب تہہ کئے چونکہ سکونت مغل پورہ میں تھی اسی لیے حضرت صفیؔ سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ اکثر ان کے مکان پر شطرنج کی محفلیں جمتیں جس میں قریبی دوست احباب تشریف لاتے جن میں مولانا معز الدین ملتانی مرحوم مولوی مسیح الدین، مولانا مفتی اشرف علی، مولانا ہاشم علی، جناب یاور علی خنجرؔ، جناب سراجؔ حیدرآبادی، جناب امجدؔ حیدرآبادی، جناب حکیم عبدالستار جوشؔ اور مولوی داؤد خان (مالک داؤد واچ کمپنی شریک رہتے۔ حضرت صفیؔ سے صبح و شام ملاقات ہوا کرتی۔ حضرت صفیؔ کی صحبت نے آپ کے کلام میں حضرت صفیؔ کا رنگ پیدا کیا۔ ابتداء میں عام مشاعروں میں شرکت فرماتے تھے لیکن بعد میں صرف منقبتی مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ ان کے کلام میں تغزل کے ساتھ ساتھ صوفیانہ رنگ بھی ملتا ہے کلام کا کافی ذخیرہ تھا لیکن استاد کی طرح ان کا بہت سارا کلام جو غزلیات، رباعیات، نعتوں اور منقبتوں کا تھا تلف ہوگیا۔

۲۵ اگست ۱۹۸۰ء کو اس جہانِ فانی کو خیرباد کیا اور اپنے مرشد کے قریب قادری چمن میں سپرد لحد کئے گئے۔ جناب رفیق حضرت صفی کے دورِ وسطیٰ کے حلقۂ تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

جناب رفیق کے فرزند غلام محمود صاحب نے حالات، کلام اور تصویر عنایت فرمائی جس کے لیے میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(نمونہ کلام)

مخلوق کیا بگاڑ سکے گی مرا رفیق — خلاقِ دو جہاں کا بنایا ہوا ہوں میں
جھکی ہوئی ہے جبینِ نیاز کیا کہنا — درِ حضورؐ پہ میری نماز کیا کہنا
عجیب لطف کی نسبت ہے یہ مری نسبت — میں بندہ اور وہ بندہ نواز کیا کہنا
ہوا جو حاضر دریار بھر لیا دامن — عطائے خواجہ بندہ نواز کیا کہنا

ایک نعتیہ مسدس کے چند بند

ناز ہے اور بجا ناز ہے تقدیر پہ آج — بارک اللہ کہ تو تیرہ ہے توقیر پہ آج
دنگ خورشید بھی ہے قلب کی تنویر پہ آج — خواب کو رشک ہے کیوں خواب کی تعبیر پہ آج

تیرہ بختی گئی آنکھوں کا نصیبا جاگا
شکرِ صد شکر کہ اب گنبدِ خضرا دیکھا

عرض کیا کیجئے کس جا ہے رسائی اپنی — سرفراز آج ہوئی ناصیہ سائی اپنی
قسمت اپنی ہے کہ اُمید بر آئی اپنی — عمر بھر کی تھی یہی ایک کمائی اپنی

شکر صد شکر کہ دربارِ گہربار میں ہیں
فخر ہے سرورِ کونینؐ کی سرکار میں ہیں

دیر سے ہے درِ دولت پہ رفیق اپنی صدا — چھوڑ کر آئے ہیں گھر بار بہ اُمیدِ عطا
اب جو جائیں گے تو کچھ لیکے ہی جائینگے گدا — اے شہنشاہِ رسل معدنِ الطاف و سخا

چشم پُر فیض و پُر انوار کی ہو ایک نظر
منتظر ہیں ترے دربار میں سب خستہ جگر

روحیؔ ۔ پیرزادہ سید محی الدین قادری

تاریخ پیدائش نومبر ۱۹۲۰ء

پیرزادہ سید محی الدین روحیؔ قادری حضرت پیر سید باسط علی قادری مرحوم کے گھر کے چشم و چراغ ہیں جو سلسلہ خانوادہ قادریہ سے ہے۔ اور حبیب علی شاہؒ کی درگاہ کے سجادہ ہیں۔ حیدرآباد ہی میں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد جامعہ نظامیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ کوئی مستقل ذریعہ معاش نہیں رکھتے۔ ۱۹۶۰ء میں ساٹھ سالہ عمر کی تکمیل کے بعد حکومت نے ماہانہ ۱۵۰ روپے کا وظیفہ پیرانہ سالی جاری کیا جو تاحال جاری ہے۔

ذوقِ شعر بچپن سے ہے جو نہ صرف جوان العمری میں شباب پر تھا بلکہ اب ان کی ضعیفی میں بھی شباب پر ہے۔ بڑے زود گو اور قادر الکلام شاعر ہیں! اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے بیسیوں شعر کہہ ڈالتے ہیں۔ ان سے استفادہ سخن کرنے والے بھی کئی ہیں اور جو بھی ان سے رجوع ہوتا ہے وہ اس کو مطمئن و مسرور کر کے واپس کرتے ہیں۔

شروع ہی سے حضرت مفتی اشرف علی اشرفؔ مرحوم سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ جب حضرت اشرفؔ چار چھ مہینوں کے لیے عازم مقامات مقدسہ ہوئے تو ان کو اپنے استاد بھائی حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے سپرد کر گئے۔ اس طرح جناب روحیؔ قادری حضرت صفیؔ کے دورِ آخر کے تلامذہ میں شامل ہوئے۔ حضرت صفیؔ نے خاص توجہ اور دلجوئی سے ان کے کلام کو دیکھا۔ دو چار پرچے دیکھنے کے بعد ارشاد ہوا کہ آئندہ غزل کا پرچہ دینے کی ضرورت نہیں، بالمشافہ غزل سنا لیا کرو۔ یہ سلسلہ حضرت اشرفؔ کی بغداد سے واپسی تک جاری رہا۔ بغداد سے واپسی کے بعد جناب روحیؔ پھر حضرت اشرفؔ کے پاس واپس چلے گئے۔ واضح ہو کہ حضرت اشرفؔ مقامات مقدسہ کی زیارت

کے لیے جاتے جاتے جناب روحی کے علاوہ جناب غفار احمد ماجد، جناب غلام قادر نسیم اور جناب خواجہ شوق کو حضرت صفی کے سپرد کر گئے تھے۔

ان کی غزلوں پر حضرت صفی نے جو اصلاحیں دیں وہ آج تک ان کے پاس محفوظ ہیں اور ان کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ حضرت اشرف کے پاس والیسی کے بعد بھی حضرت صفی کا سلسلۂ شفقت ان کے ساتھ برابر جاری رہا۔ اور وہ شاعری کے علاوہ زندگی کے مختلف مسائل کے تعلق سے بھی گراں قدر مشورے دیتے رہے۔

جناب روحی قادری مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے ہیں۔ کلام تحت اللفظ سناتے ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ زمانے کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کر کے شعر کہتے ہیں۔ عصری ادب پر بھی بہت گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں عصریت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔

(نمونۂ کلام)

بھول کر یاد نہ کرنا مجھ کو بھول جانا میں اگر یاد آیا

هم کہاں اور مصلحت کوشی کہاں تم کو یہ محفل مبارک ہم چلے

اک شخص میسّر ہے تو ملتے رہو روحی پھر تم کو کوئی ایسا قلندر نہ ملے گا

اور دنیا کے بکھیڑوں کے علاوہ روحی اک مراثن بھی مرے ساتھ ہے سوتن کی طرح

تمہیں تو ہو جو سورج کو رہ رفتار دیتے ہو مری دہلیز پر کب سے کھڑی ہے دوپہر دیکھو

نگاہوں کا جو انداز بیاں ہے زباں کو وہ شرف حاصل کہاں ہے

اگر طوفان کے لہجے میں سمندر بات کرتے ہیں تو ہم بھی موج کو ساحل سمجھ کر بات کرتے ہیں

ہو کے شفاف روشنی کی ہے پتھروں نے بھی کیا کمی کی ہے

کچھ نہ پوچھو یہ زخم کب کے ہیں ہم ابھی ہم نہیں تھے جب کے ہیں

خط محبت میں ہو کے ضم لکھا آپ لکھنے گئے تو ہم لکھا

ہم نے دے دی زکوٰۃ لکھنے کی حلیۂ شیخ محترم لکھا

سب سنا ہوں کیا کہتی ہے دنیا مرے پیچھے میں کہتا ہوں کیا چیز ہے دنیا مرے آگے

دم ہے تو توڑ لیجئے سانسوں کا تعلق بھی یہ بھی تو زندگی کی منت گزاریاں ہیں

جذب کر لیتے ہیں ہونٹوں میں تبسم اپنا
برق کو پھول کی پتی میں سمو دیتے ہیں

سب پہنچ نہیں سکتے شمعِ حسن کی لو تک
لوگ صرف جلنے کی آرزو میں جلتے ہیں

گم ہوں لطفِ سوال میں اب تک
اس نے پوچھا تھا مدعا کیا ہے

پوچھنا ہے یہ مجھے گردشِ دوراں تجھ سے
صبح کیوں شام کے پردے میں نہاں رہتی ہے

یہ شعارِ دوستی ہے کہ نباہ کر رہا ہوں
مری وسعتوں کے لائق نہ چمن نہ آشیانہ

ہم اہلِ عشق ہیں صرفِ سوال ہو جاتے
وہ ہم سے پوچھ تو لیتے کہ آرزو کیا ہے

لاکھ آفاقیت کا پیکر ہو
آدمی پھر بھی آدمی ہے میاں

ایسا کون کرسکے گا اس دل کی کارسازی
احساس بھی مجازی ادراک بھی مجازی

موت بھی آئے تو ہو اس کی تواضع روحی
زندگی اتنی تو شائستہ بنا دی جائے

اب جو تصویر بنے گی وہ قیامت ہوگی
اب مرا غم سرِ قرطاس و قلم ٹھہرا ہے

یہ خبر لوح و قلم کو بھی نہ تھی روزِ ازل
میری تقدیر میں وہ اپنا ہی غم لکھ دیں گے

ہونٹ کلیوں کے ہیں روداد ہے فصلِ گل کی
بات نازک ہے نزاکت سے بیاں ہوتی ہے

○

جناب روحی صاحب کے حسنِ سلوک کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے حالات و نمونۂ کلام اور تصویر مرحمت فرمائی۔ اور بیشتر تلامذہ صفی کے مواد کی حصول کے سلسلہ میں میرے ساتھ بھرپور تعاون پیش کیا۔

مانگنا جس کسی کو آیا ہے
اس کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے

اس نے شرما کے منہ جو پھیر لیا
ہم یہ سمجھے، اُدھر بلایا ہے

وقت کو لے صفی بُرا نہ کہو
وقت پیغمبروں پہ آیا ہے

صفی کے یہ منتخب اشعار

حکومت آندھرا پردیش کی درسی کتاب برائے انٹرمیڈیٹ میں شامل ہیں

رہبر ــــ محمد معین الدین

ولادت: ۱۲ مئی ۱۹۱۲ء ؛ وفات: ۱۷ مئی ۱۹۸۷ء

محمد معین الدین نام اور رہبر فاروقی قلمی نام۔ ۱۲ مئی ۱۹۱۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے والد کا نام محمد مظہر صاحب تھا جو یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد کے معالجوں میں تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ دارالعلوم ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ اور پھر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی فاضل کی ڈگری حاصل کی۔ حضرت صفی اورنگ آبادی' حضرت سید محمد مشہدی، مولانا ابوالوفا افغانی، افضل العلماء مولانا عبدالباقی شطاری اور حضرت صدقہ جائسی جیسے استاذان باکمال کی تعلیم و تربیت سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کتنے عالم ہوئے ہوں گے۔ آپ کے علمی و تحقیقی مضامین ملک کے نامور رسائل، نیرنگ خیال، معارف، سب رس وغیرہ میں شائع ہوا کرتے تھے ان مضامین کی تعداد چالیس سے اوپر ہے آپ کو تاریخ نکالنے پر بھی عبور حاصل رہا یہ بھی ایک باضابطہ علم ہے۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے آپ کا مطالعہ وسیع تھا خدا نے اکتسابی صلاحیت بھی خوب دی تھی۔ اپنے گنجینۂ علم سے علم کی دولت بانٹتے رہے آپ کی تحریر نہایت بلند پایہ ہوا کرتی تھی آپ کی تالیفات کی تعداد بھی بہت ہے۔

۱۔ اسلامی طب ۲۔ نامہ جنگ شہید ۳۔ کوہ نور کی سرگزشت ۴۔ قرآن پاک اور آسمانی پروازیں ۵۔ نئے مشاہدات اور معجزۂ شق القمر ۶۔ معرفت کعبہ ۷۔ حجۃ الوداع۔

جناب رہبر فاروقی کو تحقیق سے شغف رہا وہ ایک وضع دار شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے مذہب سے خاص لگاؤ رہا۔ اور اسلامی تاریخ کا آپ نے گہرا مطالعہ کیا تھا آپ کے فرزند جناب محمد عارف الدین صاحب جو محکمہ آبرسانی میں انجینئر ہیں تاریخ گوئی کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں جو شوق غالباً ورثہ میں ملا ہے جناب عارف

نے فارسی سے ایم اے کیا عربی میں پی ایچ ڈی کی اور اپنے والد مرحوم کے نام کو روشن رکھے ہوئے ہیں انھوں نے اپنے والد کی تاریخ وفات یوں نکالی ہے۔

"شد عرش آرام گاہ معین الدین"

جس سے سنہ وفات ۱۴۰۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ جناب محمد معین الدین رہبر فاروقی ۷ار مئی ۱۹۸۷ء م ۱۸ر رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ بروز یکشنبہ دارفانی سے دار البقا کی جانب روانہ ہوئے اور متصل مسجد سالار الملک قریب عید گاہ قدیم میں محوِ خواب ہیں۔

جناب عارف صاحب نے حالات و تصویر عنایت فرمائی۔ جس کے لیے میں مشکور ہوں۔

صفی کے منتخب اشعار

پرستش سے زیادہ ناز برداری گواہوں کی
گناہ گاروں کی یہ توہین توبہ ہے گناہوں کی

خدا کی شان ہے جس رات ان کا ذکر ہوتا ہے
ہمارے گھر میں آجاتی ہے رونق خانقاہوں کی

بچاؤ اپنے کو تم ہو جہاں جمگھٹ حسینوں کا
وہاں سنبھلو، جہاں تلوار چلتی ہے نگاہوں کی

صفی کی صاف گوئی نے کیا بے باک یاروں کو
انا الحق کہہ گئے منصور بن آئی جلاہوں کی

ساقی ـــــــ کشن لال آنجہانی جیسوال

تاریخ پیدائش: ۸ر فروری ۱۹۰۷ء تاریخ وفات ۷ر اگست ۱۹۷۳ء

جناب کشن لال ساقی آنجہانی ۸ر فروری ۱۹۰۷ء [۲۴ ذی الحجہ ۱۳۲۴ھ] کو موتی لعل کے گھر دیر لورہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حیدرآباد کی قدیم درسگاہ مفید الانام میں حاصل کی۔ موروثی تجارت پیشہ تھے اور محلہ زنگلی کھڑکی [کوٹلہ عالیجاہ کے قریب] حیدرآباد میں قبرستان کے قریب ان کی دیسی شراب کی دکان تھی۔ حضرت صفی کے کلام سے تو واقف ہی تھے لیکن شام کے اوقات میں ان کا گزر بھی ان کی دوکان کے سامنے سے ہوتا تھا۔ بس یہیں سے رشتۂ استادی وشاگردی کی ابتداء ہوئی۔ حضرت صفی رات میں واپسی پر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کی دوکان پر گزارا کرتے تھے۔ جہاں وہ اپنی دوکان سے استاد کی سربراہی کرتے تھے اور سلسلۂ شعروسخن چلتا رہتا۔

جناب ساقی نے بے حد رسیلا گلا پایا تھا اور بہت عمدہ گاتے تھے اسی بناء پر تجارت کے علاوہ نواب معین الدولہ بہادر کے دربار میں گانے کے لیے جز وقتی ملازم تھے۔ ہزماسٹرس وائیس گراموفون کمپنی اور ٹوئین کمپنی نے جناب ساقی کی آواز اور دھنوں میں نواب معین الدولہ بہادر کے کلام کو ریکارڈ کیا ہے۔ ریکارڈ پر کمپوزڈ بائی نواب معین الدولہ لکھا ہوا ہے۔ ان کے تمام گراموفون ریکارڈ حیدرآباد میں بہت مقبول ہوئے۔ ان کی گائی ہوئی غزلوں، ٹھمریوں، دادرا، بھجن وغیرہ کی تفصیل یہ ہے ؎

۱۔ پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے [غزل، داغ] ۲۔ راجہ کیسا جادو ڈالا [ٹھمری]
۳۔ نہ کسی سے دل لگاتے نہ یہ اپنا حال ہوتا۔ [غزل نواب معین الدولہ]

۴. لاگے مورے نین [ٹھمری] ۵. مایا کا پنجرہ ڈولے رے۔ [بھجن]
۶. کاہے مارے رے نینا بان۔ [دادرا] ۷. کبھی دشمنوں کی بھی غمخواریاں ہیں (صفی)
۸. دوست تو دوست ہے دشمن کو بھی اپنا سمجھا۔ [کیفی]

جناب ساقی کی چار پشتوں میں کوئی شاعر نہیں گزرا۔ ان کا ذوق شعری ان کے گانے کی بدولت تھا۔ یہ گاتے گاتے شعر بھی موزوں کرنے لگے اور حضرت صفی کو سنانے لگے۔ حضرت صفی اسی وقت ضروری اصلاح دیدیا کرتے تھے اس طرح یہ حضرت صفی کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

آخر عمر میں دمہ کے شدید مریض ہو گئے تھے اور اسی عارضہ سے ۱۷ر اگست ۱۹۷۳ء کو انتقال کر گئے۔ ان کے فرزند آنند کمار ورما، جو محکمہ ریلوے میں ملازم ہیں۔ اپنے والد کی تصویر دی اور ان کے گائے ہوئے ریکارڈ مجھے دکھلا کر حالاتِ زندگی وغیرہ سے واقف کیا۔ میں ان کا مشکور ہوں۔

ساقی کا ایک شعر: اور تو اور اب تو دِل میرا ؛ مجھ سے ہی بدگمان ہے پیارے

صفی کے منتخب اشعار

اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے
بندے ہزار نام کا یہ ایک نام ہے

اب دوست سے غرض ہے نہ دشمن سے کام ہے
دونوں کو، دونوں ہاتھوں سے لمبا سلام ہے

ہم کیا ہیں تہمتوں سے بیغمبر نہیں بچے
نادان! کیا زمانے کے منہ کو لگام ہے

سالک ـــــ حکیم غلام قادر صدیقی

تاریخ پیدائش ۷ ۱۳۲ھ
م ۲۵ ر اپریل ۱۹۰۹ء

تاریخ وفات ۸ رجون ۱۹۷۷ء
یوم سہ شنبہ

حضرت سالک صدیقی مرحوم حضرت صفیؔ کے دورِ اول کے تلامذہ میں سے ہیں۔ ۱۳۲۷ھ م ۱۹۰۹ء میں بمقام حیدرآباد ایک معزز گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے نانا حیدرآباد کے مشہور شاعر اور صدر شپہ خانہ سرکار عالی مہر حشمت علی حشمتؔ تھے جن سے سرمین السلطنت مہاراجہ کرشن پرشاد نے بھی استفادہ علمی کیا۔ والد حضرت الحاج غلام لیٰسین صدیقی مرحوم ابن حاجی غلام قادر صدیقی تھے جو جمعدار دکھنی اور جھنڈے والے جمعدار کے نام سے بھی موسوم تھے۔ ان کو نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کے عہد حکومت میں مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔ ابتداً ماہانہ دو سو روپے مشاہرے پر پندرہ راس اسپان سلحداری کا رسالہ عطا کیا گیا جس کا تعلق اولاً محکمہ نظم جمعیت سررشتہ راجہ اسیری پرشاد سے رہا۔ بعد ازاں بہ زمانہ ضلع بندی اسپان سلحداری محکمہ کوتوالی اضلاع سرکار عالی میں منتقل ہوئے جو تو رثیاً ورثائے مرحوم پر حسب قاعدہ اجرا ہوتی رہیں۔

حضرت سالک نے مدرسہ نظامیہ میں تعلیم پائی۔ اور الحاج حکیم محمود خاں مرحوم سے طب کی تعلیم پائی۔ بسنہ ۱۹۴۲ء میں کلکتہ سے زبدۃ الحکماء کی سند حاصل کی ۔۔ عمر بھر اسی پیشہ حکمت سے وابستہ رہے۔ ان کا ایجاد کردہ تیل "روغن گیسو سنگھار" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ دیگر طبی ایجادوں میں بھی شہرت حاصل کی۔ بسنہ ۱۳۵۶ف سے سنہ ۱۳۵۸ف تک عدالت العالیہ کی جیوری کے رکن بھی رہے۔ نیز نواب محمد نجیب الدین خان خلف چہارم نواب ظفر جنگ مرحوم کے ہاں معتمد پیشی کے

اس نے جب پوچھا کوئی اب قابل بخشش بھی ہے
میری جانب اس کی رحمت نے اشارہ کر دیا

موت ہے ایک سکون کا عالم
زندگی اضطراب کی دنیا!!

خاک میں مل کر ہوا اکسیر اس کی راہ میں
خاک کے پتلے کو رتبہ خاک چھنوا کر دیا

کب تک سہے گا کوئی ستم ہائے روزگار
جینے کو جی رہا ہوں مگر جی اتر گیا

روح انسانی ہے بیشک مادّہ سے پاک صاف
کیا نرالی بات ہے جلتا ہے بے روغن چراغ

سمجھ میں نہیں آئیں گے دل شکستہ
زباں سے جو نکلے گا فی الفور ہوگا

یہ مصلحت ہے جو نہیں کہتے زباں سے ہم
واقف مگر ہیں آپ کے رازِ نہاں سے ہم

بہاروں پر جو تیری شوخی گفتار ہو جائے
کلی چٹکے، فضا مہکے، چمن بیدار ہو جائے

انھیں آتی نہیں آواز میرے دل کی دھڑکن کی
یہ وہ آواز ہے جو آسماں کے پار ہو جائے

شاید ہماری قیدی پیشِ نگاہ تھی
صیاد نے قفس کو تو گلشن بنا دیا!

وہ مشورہ دیتے ہیں بیمار محبّت کو
غم ہے تو دعا کرنا، دکھ ہے تو دوا کرنا

ہم کیا بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے!
کس کو سنبھلنے دیتا ہے عالم شباب کا

کسی کے عارض رنگیں کی یاد آ ہی گئی!
چمن میں جب کوئی تازہ گلاب دیکھ لیا

جسے آتا ہے تم کو یاد کرنا!
اِسے آتا نہیں فریاد کرنا

ذکر کیا کیجئے پری کا نام کیا لیں حور کا
آپ سے ان کو تعلق بھی نہیں ہے دور کا

نہ ہو جب قبر میں صبر و سکوں تو اس سے کیا حاصل
اگر تعویذ مرقد میں بھی جائے سنگِ مرمر کا

جس کی تقدیر میں ہو گمراہی
وہ کبھی راہ پر نہیں آتا

سامنے تیرے تری تصویر کیا
شخص ہے تو عکس کی توقیر کیا

تیور بدل گئے ترے اظہارِ حال پر
یہ تو نہ تھا جواب ہمارے سوال کا

بُرا ہو یا الٰہی اس دلِ بے تاب کا میرے
فدا اس دشمنِ جاں پر ہے یہ دشمن مری جاں کا

ایک دو روز کا مہمان نظر آتا ہے
اور کیا حال کہیں آپ کے شیدائی کا

سالک ہمارے پاس کوئی آئے کس لیے
اگلا سا دَور اور وہ دولت کہاں ہے اب

اس کے آنے کی خبر میں نے سنی ہے اے دل
میری نظروں میں فلک پر ہے زمیں آج کی رات

آیا ہے کہاں کا مری آہوں میں اثر آج
وہ پوچھنے آئے ہیں مرا دردِ جگر آج

فرائض بھی انجام دیئے۔

حضرت سالک صدیقی نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ حمد، مناجات، نعت، اور منقبت کی طرف میلان طبع زیادہ تھا۔ اور اس کلام کے دو مجموعے "سامانِ آخرت" اور "توشۂ عقبیٰ" کے نام سے علی الترتیب ۱۳۵۴ھ اور سنہ ۱۳۶۱ھ میں طبع ہوچکے ہیں۔ غزلیات وغیرہ کا ایک مجموعہ "جذبات قادر" کے نام سے سنہ ۱۳۶۰ھ میں طبع ہوچکا ہے۔ اس کے بعد "قادر الکلام" اور "گلستان عظمت" کے نام سے دو اور مجموعے علی الترتیب سنہ ۱۳۸۰ھ اور سنہ ۱۳۹۱ھ م ۱۹۷۱ء میں طبع ہوچکے ہیں! اس طرح یہ تلامذہ صفی میں پہلے تلمیذ ہیں جن کے پانچ مجموعہ ہائے کلام طبع ہوچکے ہیں۔

حضرت سالک نے ابتداً اپنے کلام پر میر غضنفر علی بے تاب سے اصلاح لی۔ پھر حضرت صفی کے تلمیذ رشید حضرت ابوالخلیل سید غوث یقین سے مشورہ سخن کیا۔ پھر انہی کے مشورے پر حضرت صفی سے رجوع ہوگئے اور ان کے انتقال تک وابستہ رہے۔ تلامذہ صفی میں ان کو ایک اور خصوصیت یہ حاصل ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ۵ رجون ۱۹۷۲ء کو بمقام ہال والا پیلیس کوٹلہ عالیجاہ "جشن سالک" منایا گیا۔ جس میں ان کی علمی وادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں کیسۂ زر پیش کیا گیا جس کو اس وقت کے ڈپٹی منسٹر ہوم افیئرس نئی دہلی جناب لیف، پچ، محسن، جناب جگن ناتھ آزاد ڈائرکٹر محکمہ تعلقات عامہ سری نگر کشمیر، جناب حبیب الرحمٰن معتمد عمومی انجمن ترقی اردو حیدرآباد اور آنریبل ڈاکٹر یم چنا ریڈی گورنر اترپردیش نے تحریری طور پر سراہا۔ اور پیغاماتِ تہنیت ارسال کیئے جو ان کے فرزند اکبر محمد غلام یٰسین سلطان صدیقی کے پاس محفوظ ہیں۔

حضرت سالک صدیقی اپنی ان خصوصیات کے علاوہ کلام کے اعتبار سے بھی اپنے استاد بھائیوں (تلامذہ صفی) میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔

(نمونہ کلام)

ذرے کو خورشید اور قطرے کو دریا کردیا　　جس کا جیسا اقتضا تھا اسکو ویسا کردیا

سرتیر ـــــ ابو محمد سید علی

تاریخ پیدائش ۲؍ اکتوبر ۱۹۱۲ء تاریخ وفات ۲۵؍ جون ۱۹۸۸ء

جناب ابو محمد سید علی سرتیر ولد علامہ سید محمد ابراہیم مغفور ۲؍ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو محلہ گھانسی بازار حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسۂ دارالعلوم اور سٹی کالج میں درسی و نصابی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں جامعہ نظامیہ سے منشی کا بھی امتحان کامیاب کیا۔ حصول تعلیم کے بعد محکمہ صدر محاسبی (اکونٹنٹ جنرل) میں خدمت اہلکاری پر مامور ہوئے اور وہیں سے وظیفہ حاصل کیا۔

جناب سرتیر کے والد علامہ سید ابراہیم مغفور ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ عبادت و ریاضت کے بعد جو وقت ملتا اس کو تعلیم و تلقین اور اشاعت علم دین میں صرف کرتے تھے۔ جامعہ نظامیہ حیدرآباد اور مدرسہ منصبداران کے لیے ہمہ تن مصروف رہ کر نمایاں خدمات انجام دیں۔ آپ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے آصف سادس اعلیحضرت نواب میر محبوب علیخان بہادر نے اپنے شہزادگان نواب صلابت جاہ بہادر و نواب بسالت جاہ بہادر کا اتالیق مقرر کیا۔ حضرت علامہ ابراہیم مغفور کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ رفیع الدین قندھاریؒ سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ الاسلام نواب فضیلت جنگ (محمد انوار اللہ خان) کے رشتے میں برادر اور شاگرد رشید تھے۔ نیز ان کے اجداد کا سلسلہ نواب ناصر جنگ شہید کے اساتذہ سے ملتا ہے جن کو اسی صلے میں موضع سرن پلی (تعلقہ لوی پیٹھ ضلع نظام آباد) میں جاگیر عطا ہوئی تھی اور انعام دار و لومیہ دار بھی تھے۔

جناب سرتیر حضرت صفی کے دور اول کے حلقۂ تلامذہ میں سے ہیں۔ غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نثر نگاری بھی کرتے تھے۔ بعض تاریخی مضامین "یادِ رفتگاں"

اس انقلاب میں کچھ ان کا ہاتھ بھی تو نہیں
کیا ارادہ ہے چاہتے کیا ہیں !

رقیب اور ملے وہ بھی رازداں کی طرح
قابل غور ہو گئی بے داد

سالک جو ہیں تلامذۂ حضرتِ صفی
قادر کلام پر بھی ہیں حاوی زبان پر

اگر آنکھیں سلامت ہیں تو اچھا ہم بھی دیکھیں گے
تمہارے چاہنے والوں کی چلتی ہے ہوا کب تک

آپ اگر تیغ ادا تیرِ نظر رکھتے ہیں
ہم بھی دل لوہے کا پتھر کا جگر رکھتے ہیں

ہمارے نام سے دشمن کے دل کو آگ لگتی ہے
ہمارا ذکر آتا ہے تو جل کر خاک ہوتے ہیں

سبزہ و گل تو ہیں پامالی کے قابل لیکن
آپ کے پاؤں میں چبھ جائے نہ کانٹا کوئی

پس پردہ چھپا کے اپنے کو !
کر دیا تو نے آشکار مجھے !

کر دل کھیا عرض نعتِ سرورِ کونین میں سالک
نہ کوئی آپ سا دیکھا نہ کوئی آپ سا پایا

حضرت سالک کا انتقال ۸ جنوری ۱۹۷۷ء کو اپنے رہائشی مکان موقوعہ دودھ خانہ اللہ رکھی بیگم کوٹلہ عالیجاہ میں ہوا۔ اور تدفین احاطہ درگاہ حضرت موسیٰ قادری اندرون پل قدیم میں عمل میں آئی۔ آپ کے صاحب زادے سلطان صدیقی نے تصویر کے علاوہ حالات و نمونہ کلام مرحمت کیا۔ میں اس ہمدردی کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

صفی کے منتخب اشعار

اگر قائم محبت کی کوئی معیار ہو جائے
محبت کرنے والو! زندگی دشوار ہو جائے

ستانا اور ایسی بے لحاظی کا ستانا کیا
کہ ہر مجبور تجھ سے لوٹ کر مختار ہو جائے

نظر کیا وہ نظر حد جس نظر کی آسماں ٹھہرے
نظر تو وہ نظر جو آسماں سے پار ہو جائے

اور "حیدرآباد کی قدیم درس گاہیں" حیدرآباد کے ماہنامہ "مہتاب" ۱۹۳۹ء اور الموسی [اردی بہشت ۱۳۴۸ ف] میں شائع ہو چکے ہیں۔ مضامین کے علاوہ غزلیات رسالہ فروغ اُردو لکھنؤ اور ماہنامہ سب رس حیدرآباد وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ مرحوم اپنی زندگی میں چند مضامین "علمی اداروں کی اردو خدمات" محاورہ روزمرہ" بیان صفیؔ" "پیامِ داغ" اور "تذکرۂ فرزندان داغ" مکمل کر چکے تھے لیکن شائع نہ ہو سکے۔ البتہ ایک کتاب "رہنمائے انتخابات" شائع ہو چکی ہے۔

جناب سرتیہ کو تاریخ گوئی کا بھی ملکہ تھا۔ حضرت صفیؔ کے انتقال پر دو تاریخیں نکالیں جو حسبِ ذیل ہیں ؎ [۱]

حق تعالیٰ نے بزمِ شعراء کا اب چراغِ سخن بجھایا ہے
۱۹۵۴ء

دوسری تاریخ میں حضرت صفیؔ کا سنہ پیدائش بمنا دتا فرماتے اور اُن کی عمر [۶۳ سال] برآمد ہوتی ہے۔

(سنہ ولادت) ذی قسمت ۱۳۱۰ھ جاں داد ۶۳ (عمر)

سنہ وفات ۱۳۷۳ھ (جملہ)

جناب سرتیہ بعارضۂ ڈبل نمونیا ۲۵ جون ۱۹۸۸ء دواخانہ عثمانیہ میں انتقال کر گئے۔ محلہ جہاں نما سے جنازہ اُٹھا۔ اور بارکس کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ قبر کے کتبے پر صرف "جاگیردار سرن پلی" کندہ ہے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

جناب سرتیہ کے فرزند اکبر سید احمد قدیر و بھانجے ماجد صاحب نے فراہمی نمونہ کلام و حالات و تصویر سے متعلق میری کافی مدد کی۔ میں اس سلسلہ میں ان کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔

(نمونہ کلام)

جلوؤں کی کیا کمی تھی تری جلوہ گاہ میں ۔۔۔ جس نے نہ دیکھا اس کی نظر کا قصور تھا

ساقی کوئی جو دیکھ کے مخمور ہو گیا ۔۔۔ آنکھوں کی یہ شراب بھی کیا چیز ہے سرتیہ

ذرا ہشیار رہنا تم عدو سے
بڑا چلتا ہوا ہے کائیاں ہے

سترپر اچھا ہوا جو ان سے ترکِ دوستی کر لی
خدا کا شکر ہے آئی ہوئی اب تو ٹلی سر سے

کیوں اُٹھاتا ہے دل غمِ دنیا
کس لیے زیرِ بار ہوتا ہے

تری تدبیر سے کیا فائدہ اے چارہ گر ہوگا
نہ کچھ تسکینِ دل ہوگی نہ کم سوزِ جگر ہوگا

ہے ایسا کون جو سینہ سپر ہو میرے قاتل سے
یہ کس کا حوصلہ ہوگا یہ کس کا دل جگر ہوگا

سکوں جس میں کبھی ہمدم نہیں ہے
وہ جینا موت سے کچھ کم نہیں ہے

وہ جب تک تھا تو دل بھی مطمئن تھا
نہیں ہے وہ تو دم میں دم نہیں ہے

یہ دنیا واقعی ہے رنج کا گھر
یہاں کوئی خوش و خرم نہیں ہے

اُٹھاتا ہوں میں بارِ غم کو تنہا
کوئی میرا شریکِ غم نہیں ہے

ہے روشن اس سے اب بھی دل کی دنیا
چراغِ آرزو مدھم نہیں ہے

انھیں اندیشۂ نفع و ضرر کیا
جنھیں کچھ فکرِ بیش و کم نہیں ہے

سترپر اپنا ہر اک داغِ محبت
مہ و خورشید سے کچھ کم نہیں ہے

آپ کی اس میں گر مسرت ہے
شوق سے کیجیے بے قرار مجھے

بندگی کا خیال بھی اے دوست
بندگی میں شمار ہوتا ہے

الزام بے وفائی کا مجھ پر لگا دیا
میری وفا کا آپ نے اچھا صلہ دیا

صفیؔ کے منتخب اشعار

نہ دیکھو دوست بن کر تم تو دشمن کی نظر دیکھو
خفا ہو کر، بگڑ کر، روٹھ کر دیکھو، مگر دیکھو

نہیں بھرتی طبیعت، لاکھ دیکھو عمر بھر دیکھو
خدا کی شان ہے، ایسے بھی ہوتے ہیں بشر دیکھو

صفیؔ کو شاعری سے مل گئی ہر دل عزیزی بھی
دروغِ مصلحت آمیز بھی ہے کیا ہنر دیکھو

شاداںؔ ــــ رئیس جہاں آرا بیگم

تاریخ پیدائش : ۹ مئی ۱۹۳۸ء

لکھنؤ کے ایک ضلع رائے بریلی کی متوطن خاتون محترمہ بلقیس جہاں آرا بیگم جب اورنگ آباد کے ایک قاضی مرزا عباس علی بیگ سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں تو رائے بریلی کی مٹی کا سوندھا پن اورنگ آباد کی نہرِ عنبری کے پانی میں گھل کر یہیں گل افشاں ہوگیا۔ ان ہی کی اولادیں آخری اولاد کے طور پر رئیس جہاں آرا بیگم نے ۹ مئی ۱۹۳۸ء کے جمپئی اُجالوں میں آنکھ کھولی۔ گھرانہ چونکہ قاضی تھا دینی تعلیم لازمی تھی اس لیے تحتانوی جماعت تک صرف دینی تعلیم پائی اس کے بعد نصابی تعلیم کا رُخ کیا اور آٹھویں جماعت تک تعلیم پاکر تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عدیلؔ بہ سلسلہ ملازمت اورنگ آباد میں تھے، اور انہی کے مکان سے متصل مکان میں ان کا قیام تھا۔ کھانے پینے کا بندوبست بھی انہی کے گھر سے ہوتا تھا۔ دو سال کے بعد جب ان کا تبادلہ حیدرآباد ہوا اور اس کے چند دنوں کے بعد ان کے بڑے بھائی مرزا لیاقت علی بیگ کا تبادلہ بھی جو عدیلؔ کے ہم محکمہ تھے، حیدرآباد ہوگیا تو ان کا پورا خاندان حیدرآباد میں منتقل ہوگیا اس منتقلی سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عدیلؔ نے ان کے خاندان میں شامل ہونے کے لیے ان کے بڑے بھائی سے درخواست کی جس کو انھوں نے اپنی والدہ معظمہ کا عندیہ پاکر منظور کرلیا اور اس طرح یہ ایک جان دو قالب ہوگئے۔ حیدرآباد آنے کے بعد رئیس جہاں کا ایک اور جوہر سامنے آیا۔ کہ وہ شعر موزوں کرنے کی بھرپور صلاحیت کی حامل تھیں۔ اس انکشاف کے بعد عدیلؔ نے بھی خاطر خواہ ہمت افزائی کی اور انھوں نے حسبِ فرصت باقاعدہ مشقِ سخن شروع کردی۔ عدیلؔ نے

جب اس کا اظہار اپنے استاد حضرت صفی سے کیا تو وہ بہت محظوظ ہوئے اور کہا کہ میں ان کا کلام دیکھ لیا کروں گا۔ عدیل صاحب نے ان کے ہوتے ہوئے اس کو مناسب نہ سمجھا کہ خود کلام میں اصلاح دیں اس لیئے انکے کلام کو بغرض اصلاح حضرت صفی کی خدمت میں پیش کرنا شروع کیا۔ اس طرح وہ حلقۂ تلامذہ صفی میں داخل ہونے والی بشیرالنساء بیگم بشیر کے بعد دوسری شاعرہ ہیں۔

شاداں عدیل کی شاعری کا سلسلہ آگے چل کر دیگر دنیاوی ذمہ داریوں کے باعث جاری نہ رہ سکا۔ اور اب گاہے گاہے "بازخواں" کی تعریف میں آتا ہے۔ لیکن جتنا کچھ بھی ان کا شعری سرمایہ ہے وہ شعری دنیا میں انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ اور جناب عدیل صاحب فراہمی مواد کے سلسلہ میں شکریہ کے مستحق ہیں۔

(نمونہ کلام)

ایک نظم کا ایک بند ؎

نئی ہیں اب اپنے وطن کی ہوائیں — نئے ہیں مناظر نئی ہیں فضائیں
چمن میں نہ کیوں قمریاں چہچہائیں — ترانے خوشی کے نہ کیوں مل کے گائیں
ہوا ہے وطن آج آزاد شاداں

یہ نظم اس وقت کے روزنامہ شعیب، روزنامہ نظام گزٹ اور روزنامہ جوہر میں شائع ہو چکی ہے۔ غزلوں کے چند شعر ؎

یوں ہی مانوس غم نہیں انساں — کچھ تو دیرینہ آشنائی ہے

کچھ ایسی ہوتی ہے ہر بات واعظ کے بیانوں میں — نہ جس کی جڑ زمینوں میں نہ ٹہنی آسمانوں میں
کھلی رہتی ہے کس کے واسطے یوں آنکھ نرگس کی — دکھا کے چھپ گیا یہ کون جلوہ آسمانوں میں
فرشتے حسن رکھتے ہیں اگر ہوتا انھیں دل بھی — تو اک ہنگامہ برپا کر کے رہتے آسمانوں میں
شکستِ دل بلاؤں کو بہت مرغوب ہے شاید — اترتی ہے جبھی یہ دل شکستوں کے مکانوں میں

کہیں اس کا کوئی سہارا نہیں ہے — نہیں دل سے جس نے پکارا نہیں ہے
ترا غم مری زندگی کا ہے مقصد — نہ ہو یہ تو جینا گوارا نہیں ہے

شاکرؔ — صابر علی

تاریخ پیدائش : ۱۳۳۲ھ
تاریخ وفات ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ
۳۱ مئی ۱۹۷۳ء پنجشنبہ

جناب صابر علی شاکر مرحوم حضرت محمد عباس علی مرحوم کے فرزند اور حضرت غلام علی ھادی مرحوم کے برادرِ خورد ہیں۔ سنہ ۱۳۳۲ھ میں محلہ چھاونی غلام مرتضیٰ کمندان بیرون لال دروازہ حیدرآباد پیدا ہوئے۔ جامعہ نظامیہ سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد محکمہ اوقاف میں صیغدار کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور وہیں سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ دوران ملازمت میں وہ چھاونی نادر علی بیگ بیرون یاقوت پورہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اور وہیں ۳۱ مئی ۱۹۷۳ء اپنے فرزند کے عقد کے فوری بعد سب کو گلے بلتا چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ تدفین قادری چمن کے قبرستان میں عمل میں آئی۔

جناب شاکر مرحوم حضرت صفیؔ کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ اپنے برادر کلاں حضرت ھادیؔ کی طرح زود گو اور قادر الکلام تھے۔ کوئی غزل چالیس پچاس شعر سے کم نہیں کہتے تھے۔ ذخیرہ کلام اتنا ہے کہ دو ضخیم مجموعے مرتب ہو سکتے ہیں لیکن خود انکی اور ان کے متعلقین کی بدنصیبی ہے کہ مجموعہ تو مجموعہ ایک مختصر سا گلدستہ بھی طبع نہ ہو سکا۔ حضرت صفیؔ کے انتقال کے بعد اپنے بھائی حضرت غلام علی ھادیؔ سے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ شاکر کے بڑے فرزند محمد عباس حافظ قرآن اور ملاکنٹہ کی مسجد کے پیش امام ہیں۔ تصویر کی فراہمی کے سلسلہ میں ان کا شکر گزار ہوں۔ اور کلام جو میرے پاس محفوظ تھا۔ وہ بطور نمونہ پیش ہے۔

(نمونہ کلام)

دوست کا جلوہ اگر پیہم رہے
میرا عالم اور ہی عالم رہے!!

کون اپنا مونس و ہمدم رہے
آنکھ میں آنسو بھی آکر کم رہے

جب گلِ خنداں گریباں چاک ہے
ہو گیا ثابت خوشی میں غم رہے

ہو گئے ایسے رضائے دوست میں
اس نے جس حالت میں رکھا ہم رہے

لوگ رہتے ہیں اگر میرے قریب
کیوں امید و یاس کا عالم رہے

منکشف ہوں دل میں اسرارِ حیات
یہ جو میرے حق میں جامِ جم رہے

کیا کروں شاکر میں عرضِ مدعا
جب وہ اک اک بات پر برہم رہے

لاؤں زباں پہ شکوۂ بیداد کس طرح
کردوں وقارِ خامشی برباد کس طرح

دل مانتا نہیں ہے کوئی بات عقل کی
آخر میں چھوڑ دوں اسے آزاد کس طرح

رنج و ملال درد و الم جی کے ساتھ ہیں
انسان سے جدا ہوں یہ ہمزاد کس طرح

کھلتا ہے خامشی سے تری غیر کا بھرم
شاکر ملی ہے چپ کی تجھے داد کس طرح

عطا ہوئے ہیں محبت میں داغ ہائے جگر
ملی ہے مجھ کو وہ دولت جسے زوال نہیں

کسی کے عارض و ابرو کی ہے یہ تابانی
فروغِ بدر نہیں، تابشِ ہلال نہیں!

تمہاری زلفِ پریشاں کا ہوں میں سودائی
گناہ گارِ محبت میں بال بال نہیں!

نکل چلو کہیں دنیا کو چھوڑ کر شاکر
جب اس فساد کے عالم میں اعتدال نہیں

اس دور میں ہیں دوست بھی دشمن بنے ہوئے
یعنی چمن میں گل سے زیادہ ہیں خار آج

عاشق سے اپنے چھین لے دنیا سکون کی
وہ دیکھتے ہیں طاقتِ صبر و قرار آج

اس نے جو حال پوچھ لیا جی بھر آگیا!
آنسو نکل پڑے مرے بے اختیار آج

تسکین کے دو حرف کہیں لکھ دیا نہ ہو
پڑھتا ہوں اس امید پہ خط بار بار آج

شاکر وصالِ دوست کی لائے اگر خبر
دشمن کے قول پر بھی کروں اعتبار آج

طالبِ قدر کیوں ہوئے ہو صفی
اس سے نیچا کوئی مقام نہیں
(صفی)

شوق ـــــــ خواجہ حسین شریف

تاریخ پیدائش: ۲۶ رذی الحجہ ۴۲ھ م ۲۹ رجولائی ۱۹۲۴ء

پیدائشی نام خواجہ حسین شریف ہے۔ پہلے شوکت تخلص تھا جب وہ مولانا مفتی اشرف علی اشرف کے تلامذہ میں شامل تھے۔ مولانا اشرف جب ایک طویل مدت کے لیے زیارت مقاماتِ مقدسہ کی غرض سے جانے لگے تو ان کو مع دیگر تلامذہ غلام نادر نعیم، ردی قادری، عبدالغفار ماجد کو اپنے استاد بھائی حضرت صفی اورنگ آبادی کے سپرد کردیا۔ حضرت صفی کے پاس آنے کے بعد انھوں نے ان کا تخلص شوکت سے بدل کر شوق رکھا۔ جس کو بعد میں اصل نام کے ایک لفظ خواجہ کے ساتھ جوڑ کر قلمی نام خواجہ شوق اختیار کیا۔

جناب خواجہ شوق حیدرآباد میں ۲۶ رذی الحجہ ۱۳۴۲ھ م ۲۹ رجولائی ۱۹۲۴ء کو ایک سپاہی گھرانے میں پیدا ہوئے جو عالمگیری فوج کے ساتھ یہاں آکر فروکش ہوا اور یہیں کا ہورہا۔ (۱۳) سال کی عمر میں داغ یتیمی اٹھانے کے بعد سلسلہ تعلیم میٹرک سے آگے نہ بڑھ سکا۔ تعلیم مستعید پورہ ہائی اسکول، سٹی کالج اور آصفیہ ہائی اسکول میں پائی۔ میٹرک کی سند نہ ہونے کی بناء پر جب ملازمت میں ترقی کا موقع نہ رہا تو حضرت صفی کے مشورے پر مولانا قمر سنبھلی کے اِدارہ علوم شرقیہ اور ادارہ فخریہ سے منشی فاضل کی ۱۳۵۶ف میں تکمیل کی۔ اور محکمہ صرفخاص میں وراثتی حقوق کی بناء پر ملازم ہوگئے اور صرفخاص کی برخاستگی یعنی (۲۷) سال تک اس میں کام کرتے رہے۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد روزنامہ رہنمائے دکن میں ادبی وشعری صفحہ کی ترتیب وادارت کی خدمت پر قریباً (۲۰) سال تک فائز رہے۔ نیز (۱۴) سال تک والا شان نواب معظم جاہ کے متوسلات میں بھی رہے۔

خواجہ شوق ۱۳۵۰ف سے شعر کہتے ہیں۔ ابتدائی دور میں ترنم سے پڑھتے تھے

لیکن بعد میں تحت اللفظ پڑھنے لگے اور آج بھی تحت اللفظ ہی پڑھتے ہیں۔ شعری اثاثہ جمع رکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ احباب کے اصرار پر زمانے کی دست برد سے باقی ماندہ کلام کو مرتب کیا۔ اور وہ "چشم نگراں" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

خواجہ شوق کے کلام میں مولانا حسرت موہانی اور حضرت جگر مرادآبادی کی طرح خالص تغزل بھی ملتا ہے اور حضرت اصغر گونڈوی کی طرح عارفانہ رنگ میں پایا جاتا ہے۔ مخدوم محی الدین اور شاہد صدیقی مرحوم نے انھیں غزل کا نکھرا ستھرا شاعر قرار دیا تو خورشید احمد جامی مرحوم نے دکن کی اردو غزل کا روشن ستارہ قرار دیا۔ نامور نقاد محقق ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر حفیظ قتیل، پروفیسر عبدالقادر سروری نے ان کو کلاسیکی شاعری کا کوہ نور کہا اور خواجہ حمید الدین شاہد نے آبروئے غزل قرار دیا۔ سلیمان اریب نے (حیدرآباد کے شاعر) جلد دوم میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ خواجہ شوق حضرت صفی کے ممتاز شاگردوں میں ہیں۔ اور وہ غزل کو اس کی پوری روایات دلوازمات کے ساتھ برتتے ہیں۔

خواجہ شوق مشاعروں کے علاوہ گزشتہ (۴۵) سال سے آل انڈیا ریڈیو سے اپنا کلام نشر کرتے رہتے ہیں۔ ٹیلی ویژن سے کلام ٹیلی کاسٹ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مقامی اخبارات میں بھی ان کا کلام چھپ چکا ہے اور چھپتا رہتا ہے۔ اپریل ۱۹۸۲ء میں ان کی دیرینہ ادبی و شعری خدمات کے اعتراف کے لیے بڑے پیمانہ پر "جشن خواجہ شوق" بھی منایا جا چکا ہے۔

(نمونہ کلام)

کسی کی بھی نہ کی پروا بوقت واپسیں میں نے
جب آنکھوں میں نم آئے سب نے آنکھیں پھیر لیں میں نے

کھل کے آئے سامنے دشمن بہت ناداں تھے
دوست دانا تھے جو آخر تک نہ پہچانے گئے

پہلے آغاز شب تم تو سمجھ میں آئے
بعد کی بات ہے ہنگام سحر کیا ہوگا

لحد میں بھی کیسے امید خواب راحت کی
نئے مقام پہ آتی نہیں سکوں سے نیند

صبحدم کون گیا سوئے گلستاں ہو کر
بوئے گل ڈھونڈنے نکلی ہے پریشاں ہو کر

بڑی ٹھنڈی سزا دی وقت نے راحت پسندی کی
جو گھبراتے تھے مرنے سے وہ اب جینے سے ڈرتے ہیں

بہار لالہ و گل کون دیکھے دیکھ کر تم کو
گلستاں ساز نظریں لے کے کیا جاؤں گلستاں میں

تمہارا حسن تم پر کب کھلا تھا
دعائیں دو مرے ذوقِ نظر کو

بے شعوروں نے اٹھا رکھی ہے سر پہ
ہوشمندوں کی زباں کیا ہے نظر تک چپ ہے

آنکھ جب آشنا ہوئی دید کی رسم و راہ سے
ہوش اڑا دیئے گئے جلوۂ بے پناہ سے

نازک ہے غم سے دفعۃً غم کا معاملہ
جنگل کی آگ ہے کہ لگی پھیلتی چلی

تم اپنے واسطے آسانیاں تلاش کرو
مجھے تو ہر نئی مشکل تلاش کرتی ہے

ہم تو بیگانۂ منزل ہیں ہمارا کیا ہے
جن کی نظروں میں تھی منزل وہ کہاں تک پہنچے

مصیبتوں کا اثر کیا ہو حق پرستوں پر
چراغِ اہلِ نظر آندھیوں میں جلتا ہے

کسی آئین کی پابند نہیں دین ان کی
چاہتے ہیں تو خطاؤں پہ عطا کرتے ہیں

شوق آنسو ہی زبانِ غم و آلام نہیں
کچھ تبسم بھی یہ مفہوم ادا کرتے ہیں

تھی نظر جلوہ ہی جلوہ ترے نظارے تک
اب نظر کیا ہے فقط تہمتِ بینائی ہے

بسا اوقات یادِ دوست میں ایسا بھی ہوتا ہے
نظر تاروں پہ رہتی ہے گزر جاتا ہوں تاروں سے

شعورِ دید ہو تو تیرگی بھی کام کی شے ہے
کہ ملاحوں کو منزل کا پتہ ملتا ہے تاروں سے

کئی ذہن اب پردے کے پیچھے کام کرتے ہیں
وہی قاتل ہیں جو لے کے خنجر سامنے آئے

مری خاموشیاں اکثر بہت مہنگی پڑیں مجھ کو
مگر کیا کہیے کیا کیا لوگ کھل کر سامنے آئے

کیوں نہ ہو زورِ ہوس دورِ کم آگاہی میں
دھوپ ڈھلتی ہے تو سائے بھی بڑے ہوتے ہیں

اپنی کوتاہیِ قامت کو بلندی دینے
لوگ مُردوں کے بھی کاندھوں پہ کھڑے ہوتے ہیں

آپ دیکھا کریں نہ آئینہ
ایک کے دو دکھائی دیتے ہیں

قدموں سے لپٹ جاتے تا عرش پہنچ جاتے
جبرئیلؑ نے کیا موقع ہاتھوں سے گنوایا ہے

آج تک کر نہ سکی فیصلہ دنیا کوئی
آپ ہی آپ ہیں یا ہے پسِ پردہ کوئی

جان کر بھی اسے نہیں جانا
علم کی انتہا جہالت ہے

صافی ــــ ابوالفیض شاہ سید سجاد علی صوفی قادری

تاریخ وفات ۲۰ ستمبر ۱۹۵۷ء

حضرت ابوالفیض سید شاہ سجاد علی صوفی صافی قادری سلسلۂ قطب الاقطاب سیدنا غوث اعظمؒ کے بزرگ حضرت الحاج ابوالعابد سید شاہ اعظم علی صوفی کے چشم و چراغ ہیں صوفی اعظم منزل تصوف کدہ کبوتر خانہ قدیم حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ جامعہ نظامیہ سے مولوی فاضل ہونے کے علاوہ علم جفر، ریاضی و فلکیات میں دستگاہ رکھتے تھے۔ علم تصوف کے بے مثل عالم اور علم منطق میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فن شاعری و عروض سے تو فطری لگاؤ تھا۔ ابتدا میں استاد سخن حضرت سید رضی الدین حسن کیفی سے استفادہ سخن کیا۔ بعد میں حضرت صفی اورنگ آبادی سے تلمذ اختیار کیا۔ حضرت صفی سے بہت زیادہ مانوس تھے۔

حضرت صافی نے رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ فن شاعری کو بھی عالم آشنا کیا۔ اس وقت بھی ان کے متبعین کی کثیر تعداد دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہے۔

طویل عمر پاکر ۱۹۵۷ء میں انتقال کیا۔ اور درگاہ شریف حضرت صوفی اعظم واقع بیرون دریچہ بوا ہیر حیدرآباد میں تدفین عمل میں آئی۔ ہر سال ۹ ذی الحجہ کو حضرت صافی کا عرس بڑے پیمانے پر منایا جاتا ہے۔

آپ مولوی شجاع الدین علی صاحب صوفی کے بڑے بھائی ہوتے ہیں۔ میں صوفی صاحب مدظلہٗ کا مشکور ہوں کہ اُنھوں نے حالات و نمونہ کلام مرحمت فرمایا۔

نمونہ کلام

جفائیں ایسی مجھ پر اور جفا گر میں نہ سمجھا تھا!
بت خود بین بنے گا ایسا پتھر میں نہ سمجھا تھا!

رہے گا عمر بھر قسمت کا حب کر میں نہ سمجھا تھا
چلے گا حلق پہ رک رک کے خنجر میں نہ سمجھا تھا

ہو گئے قتل حسینؓ ابن علیؓ اے صافی
شمع خاموش ہوتی رہ گئی محفل باقی

حیران ہوں میں تیری جوانی کو دیکھ کر
شاید اسی کو کہتے ہیں موسم بہار کا

جفا سہتے تو منہ ہوتا جو منہ ہوتا زباں ہوتی
زباں ہوتی دعا کرتے، دعا کرتے اثر ہوتا

عرشِ آعلیٰ پہ نام ہے اُن کا
اُس سے اونچا مقام ہے اُن کا

جامِ جمشید کی حقیقت کیا!
ایسا پُر کیف جام ہے اُن کا

عرش پہ اُن کو ڈھونڈنے والے
ٹوٹا دل ہی مقام ہے اُن کا

سب کے سب کہتے ہیں جنھیں صافی
ایک ادنیٰ غلام ہے اُن کا

سامنے ہے رخِ زیبائے رسول الثقلین
جس قدر آج تڑپ سکتا ہے بسمل تڑپے

روئے زیبائے پیمبر کو جو دیکھے صافی
آج دنیا کا ہر ایک حور شمائل تڑپے

اِس کے سوا اور کلام دستیاب نہیں ہوسکا کیونکہ ان کے متعلقین نے اس کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ حضرت صافی، حضرت صفی کے دورِ اول کے تلامذہ میں سے ہیں۔! مجھے افسوس ہے کہ تصویر نہ مل سکی۔

صفی کے منتخب اشعار

تمنا ہے انھیں دیکھوں تو ایسے روپ میں دیکھوں
کہ پھر میری نظر نا قابلِ دیدار ہو جائے

صفی عاصی ہوں لیکن دور کیا ہے اُسکی رحمت سے
وہ مجھ کو بخش دے دوزخ فنا فی النار ہو جائے

صوفی ــــ سید شاہ شجاع الدین علی اصفیٰ

ولادت ۱۳۲۷ف

شعر و ادب میں صوفیا کا اہم رول رہا ہے۔ شاعری کی بنیاد ہی صوفی ازم سے ہے۔ حضرت اعظم علی صاحب صوفیؔ اعظم کا خاندان صوفی ازم کا مرکز رہا ہے ان کے دو فرزند جناب سجاد علی صوفی صافی اور ابو الحسنات سید شاہ شجاع الدین علی صوفی قادری بہترین شاعر رہے ہیں۔ حضرت صوفی اصفیٰ کی کنیت ابو الحسنات لقب مدنی پاشاہ تخلص صوفی اصفیٰ ہے۔ وہ منزل تصوف کدہ کبوتر خانہ قدیم حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ جامعہ نظامیہ، سٹی کالج، دار العلوم ہائی اسکول فاضل پنجاب یونیورسٹی سب سے بڑھ کر خود اُن کے دولت کدہ کی تعلیم و تربیت نے آپ کی شخصیت کو نکھارا۔ ابتداء ہی سے قدرت نے علم و عمل صفت مقدر کی تھی عشق و محبت کا وجود فطرتاً اور شاعری سے لگاؤ خاندانی تھا۔ حضرت سجاد علی صوفی صافی کو برسوں اپنا کلام دکھایا اور حضرت صافی نے عدیم الفرصتی کے باعث جناب صوفی اصفیٰ اور حضرت شمس الدین شمیم [جو بعد میں تاباں ہوئے] کو حضرت صفی اورنگ آبادی کے سپرد فرمایا۔ آپ کا کلام بطور نمونہ پیش خدمت ہے۔

مرا تو سینہ ہے گنج مخفی کتاب لے کر میں کیا کروں گا
میں پی چکا ہوں مئے محبت شراب لے کر میں کیا کروں گا
قیاس میں جو نہ آسکے وہ وجودِ ذاتِ خدا ہے صوفی
اب اس سے بڑھ کر کوئی وضاحت جناب لے کر میں کیا کرونگا

پامال حسرتوں کو شباب بہار دے — جوشِ بہارِ حسنِ چمن کو نکھار دے
دیکھوں میں جس طرف بھی نظر آئے تو ہی تو — مستی لوازِ ایسی شرابِ خمار دے
مجھکو قرار دے کہ نہ دے تیرا اختیار — لیکن کسی کو تو نہ دلِ بے قرار دے

بڑھتے ہیں حوصلے دلِ خانہ خراب کے
مجھ کو خوشی سے بدلے کوئی غم اُدھار دے

صوفی تیری زبان تو حضرت صفی کی ہے
خالق ترے سخن کو مقام و وقار دے

صوفی تری غزل سے تو تسکینِ دل ہوئی
اللہ تیری قبر میں رحمت اُتار دے

وہ آگئے ہیں آج کہ مئے خانہ آگیا
جی بھر کے پی لو دور میں پیمانہ آگیا

محبت بھی نصیب دشمناں معلوم ہوتی ہے
زمینِ کوئے جاناں آسماں معلوم ہوتی ہے

پھر بجلیوں کی زد میں مرا آشیاں بھی ہے
صیاد تاک ہی میں نہیں باغباں بھی ہے

یہ جانتے ہوئے کہ محبت گناہ ہے!!
کتنا بڑا گناہ کیئے جا رہا ہوں میں!!

اب ان کے دیکھنے کو ترستے ہیں خواب میں
جو مدتوں رہے ہیں دلِ خانہ خراب میں!!

مسیح ہے امید پہ قائم ہے زندگی لیکن
پھر بھی کب تک دلِ مضطر شبِ ہجراں کاٹے

اب ان کے دیکھنے کو ترستے ہیں خواب میں
جو مدتوں رہے دلِ خانہ خراب میں

یہ اپنی شومیِ قسمت کا افسانہ ہے اے صوفی
جہاں بھی قبر کھودی ہے وہاں سنگِ گراں نکلا

ماتھے پہ شکن اُن کے اِنکارِ جواب انکا
بھولا ہے نہ بھولے گا دل رنگِ عتاب اُنکا

بیمار محبت کا یہ حال نہیں ہوتا
اے کاش وہ آجاتے یا کوئی جواب اُنکا

لکھا ہے مجھے تیرا غم ناک ہے افسانہ
صد شکر کہ آیا ہے صوفی یہ جواب اُن کا

صفی کے منتخب اشعار

پاؤں پھیلا کر یہاں کیا سو رہے ہو اے صفی
بھائی! یہ دنیا ہے، کوئی قبر کا کونا نہیں

صفی کب جائے گا دیوانہ پن تیرا، خدا جانے
ارے ہم تجھ کو چاہیں اور تو جنگل کے جھاڑوں کو

خالی خولی مجھ سے لڑتا ہے ستم گر کیا کہوں
اے صفی منہ سے نکالی میں نے اِلا اللہ بھی

ضابطؔ ـــــ میر دلاور علی

تاریخ وفات: جولائی ۱۹۶۹ء

حضرت میر دلاور علی ضابطؔ مرحوم مولوی میر داور علی مرحوم کے فرزند تھے۔ محلہ شکر گنج حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے فرزند میر یوسف علی کے مطابق بوقتِ انتقال ان کی عمر (۶۴) سال تھی اس اعتبار سے ان کا سال پیدائش ۱۹۰۵ء ہونا چاہیئے۔ منشی فاضل کامیاب کرنے کے بعد محکمہ اُمور مذہبی میں ملازم ہوئے اور مہتمم اوقاف کے عہدے سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

ذوقِ شاعری بچپن ہی سے تھا۔ ملازمت کے دوران حضرت صفیؔ اورنگ آبادی سے برائے اصلاح کلام رجوع ہوئے اور ان کے دورِ اول کے تلامذہ میں داخل ہوئے۔ مزاج میں تصوف و آگہی کا رچاؤ تھا۔ اکثر کلام میں اس کی واضح پرچھائیں ملتی ہیں۔

مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے اور مختلف رسائل میں بھی ان کا کلام چھپتا تھا۔ کلام کے علاوہ مذہبی اور دینی موضوعات پر ان کے مضامین بھی کافی مقبول ہوئے ہیں۔ مضامین رسالہ ترجمان الحق، اور رسالہ "واعظ" میں پابندی سے شائع ہوا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر احباب "مولوی" پکارا کرتے تھے۔ جولائی ۱۹۶۹ء میں حیدرآباد میں ہی انتقال ہوا۔ افسوس ہے کہ ان کے فرزند میر یوسف علی صاحب جو تعلیمیافتہ ہونے کے علاوہ انفورسمنٹ آفیسر ہیں اپنے والد کے کلام کو محفوظ رکھ نہ سکے اور نہ ایک شعر ہی حوالہ کیا اور نہ تصویر دے سکے۔ جس حد تک اشعار یاد تھے پیش کیے جارہے ہیں۔

سمجھے تھے محبت میں دعاؤں کا صلہ اور ۔۔۔ لیکن تھا تمناؤں کی قسمت کا لکھا اور

آزاد بھی آزاد ہے بے پر ہو کہ بے بس ۔۔۔ زنداں کی ہوا اور ہے گلشن کی ہوا اور

ترے حسن کا تلون نہ سمجھ سکا زمانہ　　نہ ستم ہی مستقل ہے نہ کرم ہی دائمی ہے
جلوے وہی ہیں اور وہی کوہ طور ہے　　موسیٰ کی طرح دیکھنے والا کہاں ہے اب
تشبیہہ آب خضر سے کیا دوں شراب کو　　ظلمات سے ہے ربط ہی کیا آفتاب کو
زلف میں بھی دل پُر خوں کا خلق باقی ہے　　شب تاریک میں بھی جوش شفق باقی ہے

اگر چمن میں لب جو وہ شعلہ رو بیٹھے
تو ہوں گے عکس سے روشن چراغ پانی میں

ایک رُباعی پیش ہے ؎

وہ علم ہو جس سے دل پُر نور ملے　　عرفاں وہ ہو جس سے سر مخمور ملے
بے فائدہ ہو حق سے خدا ہم کو بچائے　　ہو ذکر تو ایسا ہو کہ مذکور ملے

صفی کے منتخب اشعار

رات، بے تیرے گزاروں مجھے منظور نہیں
ورنہ جلووں کے لیئے چاند بھی کچھ دور نہیں

اب بھی کیا، میری تسلی تجھے منظور نہیں؟
دیکھ نزدیک ہوں، پہلو میں ہوں، کچھ دور نہیں

کیا بڑی بات ہے، اک رحم کے طالب کا جواب
کہہ دے، سو بات کی اک بات، کہ دستور نہیں

دل نہ دکھے بھی تو روتا ہوں، کہ وہ کچھ تو سنے
چیخنے کے لیئے مامور ہوں، مجبور نہیں

اے صفی! میری غزل سن کے یہ ارشاد ہوا
جھوٹ کہنے سے ترے منہ پہ ذرا نور نہیں

ظریفؔ ــــــ حاجی محمدؐ عبدالقادر

تاریخ پیدائش : ۱۹؍ اپریل ۱۹۱۹ء

جناب حاجی محمدؐ عبدالقادر ظریفؔ ولد جناب محمدؐ سبحانی مرحوم کے فرزند ہیں جو ۱۹؍اپریل ۱۹۱۹ء کو بمقام یاقوت پورہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ آج کل ضلع رنگا ریڈی کے مضافاتی علاقہ راجندر نگر میں بمقام شاستری پورم مقیم ہیں۔
۱۹۳۶ء میں لاہور (پاکستان) سے منشی کامیاب کیا اور ۱۹۳۷ء میں منشی فاضل کی تکمیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سٹی کالج میں کیریٹیکر کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔

شعری ذوق اوائل عمر کا ہے۔ میلان طبع طنز و مزاح کی طرف ہونے کے باعث مزاحیہ کلام ہی کہتے رہے ہیں۔ پولیس ایکشن سے پہلے تک شعر گوئی کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا اس کے بعد حالات سے دل برداشتہ ہو کر اس سلسلے کو باقاعدگی سے جاری نہ رکھ سکے۔ تاہم کبھی کبھی شعر کہہ لیتے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرچکے ہیں اور اب تقریباً گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

شاعری میں ابتداً حضرت شرف الدین عیشؔ مرحوم سے تلمذ اختیار کیا۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت صفیؔ سے تلمذ اختیار کیا اور ان کے دورِ وسطیٰ کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ حضرت صفیؔ نے ان کی بیاض سخن کا نام "ستم ظریف" تجویز کیا تھا لیکن دہ گوناگوں وجوہ کی بناء پر شائع نہ ہوسکا۔

میں ظریفؔ صاحب کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ آپ نے اپنے حالات نمونہ کلام اور تصویر مرحمت فرمائی۔

نمونہ کلام

ہے یہ فیشن ماں نا بیوی کو بڑھ کر پیر سے ؛ یا خدا تو ہی بچا اس خبط عالمگیر سے

دال روٹی ہی ملے گر عزت و توقیر سے / میں یہ سمجھوں گا کہ بریانی ملی تقدیر سے

مار کر چھڑیوں سے چوکھٹی میں یہ سالی نے کہا / تم نے بے رحمی جو کل کی تھی مری ہمشیر سے

عید کا دن ہے گلے ملنے مرے آئے ہیں وہ / چار سجدے میں کروں گا آج چھ تکبیر سے

مرد کہتے ہیں مرد عاشق کیا غضب کی بات ہے / کام اب تانیث کا لینے لگے تذکیر سے

اے ظریف الطبع گو رکھتا ہے اک مقطع ظریف / کم نہیں ہے یہ کسی کے باپ کی جاگیر سے

دبلے پتلے سے نہ کیوں بہتر ہو معشوقِ جسیم / اچھا ہوتا ہے ڈبل روٹی کا میٹھا کھیر سے

گو یا تلوں میں تیل نہیں سنتے آئے تھے / اب بولتے ہیں تیل میں اب تل نہیں رہا

موٹر نشین ہیں ورثہ لے کے خون بہا / قابل ہمارے واسطے قاتل نہیں رہا

خدا جانے یہ خمیازہ ہے کس حسنِ عقیدت کا / چرا کر لے گیا مسجد سے کوئی جوتیاں مری

خیالِ خاکساری کچھ ادھورا رہ گیا ورنہ / ہمارے حق میں نقشِ بوریا بھی بوریا ہوتا

ظریف اچھا ہوا بیوی ملی ہے نیک قسمت سے / نہیں تو آپ ہونے دفترِ دارالقضا ہوتا

خوشامد میں نے کی دشمن کی کیا کی / گدھے کو وقت پر کہتے ہیں کاکا

سرا پر اپنی یوں بیٹھا ہے صوفی / کوئی سمجھے ہے مالک دوسرا کا

مرے نخالو بلا کے مولوی ہیں / سنو ان سے بیاں قالو بلیٰ کا

تماشا پھرتا ہے حافظ جی کا لڑکا / کہ پارہ پی چکا ہے لن تنا کا

بڑا فند اور چھوٹا ہے خیال اس شعبدہ گر کا / مرا دل لے کے کہتا ہے یہ انڈا ہے کبوتر کا

جو تم شیر شکر کی طرح میرے ساتھ مل جاؤ / کوڑی خشکے میں آ جائے مزہ کھیر و مزعفر کا

یہ مانا بیویاں بھی ایک سے ہیں چار تک جائز / مگر اے شیخ بیٹا ہو گیا بازو برابر کا

میسر وصل جاناں ہے خوشی سے پھول جاتا تھا / ظریفِ ناتوان پھر بھی مچھندر ہے مچھندر کا

ہے پانی سے بھی حال پتلا ہمارا / کرے گا غم عشق اب کیا ہمارا

یہ کہتا ہے کھجلی کا پھوڑا ہمارا / ابھی آگے دیکھو تماشہ ہمارا

محبت ہے آدم سے پہلے کی ان سے / ہے جوڑا نہایت پرانا ہمارا

محبت ہو بیوی کی دل میں نہ کیوں کر / یہ جنت سے لایا تھا دادا ہمارا

یہ غزل محبوب کالج سکندر آباد کے مشاعرے میں جو زوقہ صاحب کی صدارت میں ہوا تھا سنائی گئی۔

غرض مطلب سے اچھا کیا بُرا کیا — سواری کو ہے گھوڑا کیا گدھا کیا
گر عزت سے ملے روٹی تو اے دل — جواری کیا۔ گیہوں کیا۔ باجرہ کیا
گزر ہی جائیں گے دن طائرِ دل — محل کیا۔ جھونپڑی کیا۔ گھونسلا کیا
اگر سایہ کی محتاجی ہی ٹھہری — تو ظلِ بُوم کیا ظلِ ہُما کیا

کنڈا کے چھوڑے فرطِ نزاکت سے سر کے بال — جُوڑا ابھی اپنے یار کی گردن پہ بار تھا
رکھتا پُرانی بیوی کو کیوں اپنے گھر میں میں — پارینہ جنتری میں تو اس کا شمار تھا
سنتے ہیں کل جو عقد ہوا تھا ظریف کا — وہ بھیڑ تھی کہ جوتے پہ جوتا سوار تھا
وہ جوانی تھی کہ لوہے کو سمجھ رکھا تھا موم — ہو بُرا پیری کا چمچہ مجھ کو مگدر ہو گیا

آپ نے دیکھا عدو جو بزم میں شامل نہیں — آج وہ زاغ زغ نہیں ہے آج وہ بُلبل نہیں
پی کے رندوں میں نہ ہو غٹ پٹ تو کچھ حاصل نہیں — جس جگہ جوتا نہ چھلکے وہ کوئی محفل نہیں
سر بال جب سے ہوئے ہیں ہم پہ عمال بلیک — گھر میں اب چوہا تو چوہا نام کو اک بِل نہیں
نقاب میں چینی کی ہیں کچھ مکھیاں بیشک ظریف — یہ رُخِ روشن پہ اُن کے کالے کالے تِل نہیں

ضعیفی میں ارمان شادی کا زاہد — نیا راگ سوجھا ہے سازِ کہن کو
نہ کیوں پھوٹ کر روئے قسمت کو اپنی — ہتیلی کا چھالا بنائے جو زن کو

اگر بیوی ہے ناہنجار اس کو چھوڑیئے حضرت — ہزاروں بگڑیاں ہیں گر سلامت آپ کا سر ہے
وہ موذی ہی سہی آواز دیکر ہم تک آتا ہے — منافق تو نہیں ہے جانتا ہوں میں کہ مچھر ہے
کدورت لاکھ ہو دل میں ہے بیوی پھر بھی بیوی ہی — اگر ہو لاکھ گرد آلود گوہر پھر بھی گوہر ہے

چلتے ہمارے ساتھ بھی کچھ بھاڑے کی چال — کرتے وہ دوستی جو کسی خاکسار سے
پیرِ مغان نے آج منادی یہ پھیر دی — پی کر جو گر پڑا وہ گرا اعتبار سے
بچوں کی پرورش مجھے دوبھر نہ کیوں رہے — لینے کو ہیں وہ اب نفقہ ماہوار سے

ہوتے ہیں حسینوں کے فسانے بھی غضب کے — سفاک یہ ہوتے ہیں بڑی چال کے ڈھب کے
دِل لینے کو ظالم نے بلایا تھا یہ لکھ کر — بائیسویں کو آئیے کونڈے میں رجب کے

عاقلؔ ــــ صاحبزادہ میر احمد علیخاں رفاعی

تاریخ پیدائش: ۱۳ ستمبر ۱۹۲۸ء

صاحبزادہ میر احمد علیخان عاقلؔ رفاعی صاحبزادہ میر منور علیخان عالیؔ رفاعی نبیرۂ نواب مظفر جنگ مرحوم کے فرزند ہیں جو ۱۳ ستمبر ۱۹۲۸ء کو بمقام سرور نگر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد بزرگوار کی نگرانی میں گھر پر ابتدائی دینی و دنیوی تعلیم کے بعد گرامر اسکول میں ابتدائی نصابی تعلیم حاصل کی۔ اپنے چچا بہادر نواز جنگ اور وصی محترم قدرت نواز جنگ کی نگرانی میں مدرسہ اعزہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔

جناب عاقلؔ رفاعی کے والد صاحبزادہ میر منور علی خان عالیؔ چونکہ شاعر تھے اس لیے شاعری وراثت میں ملی۔ ذوقِ شعر تو کم عمری ہی سے تھا۔ لیکن ۱۸ سال کی عمر سے باقاعدہ شعرگوئی شروع کی۔ اساتذہ سخن کی صحبت نے ذوقِ سخن کو اور نکھارا۔ پولیس ایکشن کے بعد سرور نگر سے مغل پورہ میں منتقل ہو کر فروکش ہوئے جہاں حضرت صفیؔ کا طوطی بول رہا تھا لہٰذا ان کے ہی آگے زانوئے ادب تہہ کئے۔ سرور نگر میں "بزمِ سخن" کے بانی رہ چکے ہیں جس کے زیر اہتمام ہر ماہ مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے اور شعراء کا طرحی کلام گلدستہ کی شکل میں شائع ہوا کرتا تھا۔

جناب عاقلؔ رفاعی نے پہلے روزنامہ قرآنی دنیا میں کام کیا جس کے مدیر حضرت ابو محمد مصلح تھے۔ پھر عدالت خفیفہ میں کچھ دن سرگرم کارگزار رہے۔ قیام آندھرا پردیش کے بعد سے صاحبزادہ نظامس ٹرسٹ سے منسلک ہیں۔

جناب عاقلؔ کے کلام میں کلاسیکی نغمگی اور غزل کا بھرپور آہنگ ملتا ہے۔ حضرت صفیؔ سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے ؎

عاقلؔ صفیؔ کے ذکر پہ کہتے ہیں اہلِ ذوق ؛ دنیائے شاعری سے امام غزل گئے

یہ حضرت صفی کے دورِ وسطیٰ کے حلقۂ تلامذہ میں سے ہیں۔

(نمونۂ کلام)

غیر کا شکوہ اور پھر ہم سے
کیا طریقے ہیں آزمانے کے
ایک حالت پہ کون ہے عاقل
انقلابات ہیں زمانے کے

خواب میں بھی ہمارے آ نہ سکے
اتنی زحمت بھی تم اُٹھا نہ سکے
کل کے وعدہ نے کر دیا بیکل
ہم کسی کل بھی چین پا نہ سکے

جب میں نہ تھا تو تذکرہ محفل میں تھا مرا
دیکھا جو مجھ کو بات کا پہلو بدل گئے

خطا معاف جو سچ ہے وہ عرض کرتا ہوں
حضور آپ کے وعدے کا اعتبار نہیں

بے بس نہیں ہیں آپ تو کیا قدر آپ کو
ہوتی ہے کس کی کیسی گزر بے بسی کے ساتھ

ضرب المثل ہیں آپ کی وعدہ خلافیاں
کیا اعتبار آپ کے قول و قرار کا

وہ بھی کیا دن تھے کیا زمانہ تھا
برق تھی میں تھا آشیانہ تھا
باتوں باتوں میں دل کی بات ہوئی
انکھوں انکھوں میں دل نشانہ تھا

جہاں وہ ہیں جبیں رکھ دی وہیں پر
یہ سجدہ پھر ادھر کیا اور اُدھر کیا
اُسے تو بچہ بچہ جانتا ہے
تمہیں ملتا نہیں عاقل کا گھر کیا

کمسنی ہی میں قیامت ہے بپا
دیکھنا دل ابھی تو دور ہے
پائیں گے کیسے مصیبت سے نجات
دیکھئے قدرت کو کیا منظور ہے

صفی کے منتخب اشعار

اجی حضرتِ دل! وہ ظالم سہی
مگر دیکھئے تو ذرا، چیز ہے

غمِ عشق سے ہے مری آبرو
صفی اس کا کھایا پیا چیز ہے

عالیؔ ___ فخر الدین

تاریخ وفات ۱۹۶۵ء

جناب فخر الدین عالیؔ مرحوم حیدرآباد کے متوطن تھے۔ منشی کامیاب کرنے کے بعد خانگی ملازمتیں کرتے رہے۔ آخری ملازمت ایک راشن شاپ واقع مغل پورہ میں بہ حیثیت محرر مقرر تھی۔ سائیکل سے گرنے کی وجہ سے ایک پاؤں سے معذور ہو گئے تھے۔ آخری عمر میں دوسرا پاؤں بھی بیکار ہو گیا اور ۱۹۶۵ء میں اپنے مکان واقع بیرون یاقوت پورہ روبرو یاقوت محل ٹاکیز میں انتقال کیا اور تدفین احاطہ کملی والے شاہؒ میں عمل میں آئی۔

جناب عالیؔ مرحوم حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں پُرگو اور زبان کے شعر کہنے والوں میں امتیاز رکھتے تھے۔ پہلے فخرؔ تخلص کرتے تھے لیکن حضرت صفیؔ نے ان کا تخلص بدل کر عالیؔ رکھا۔ ان کے متعلقین نے تاریخ پیدائش اور تاریخِ انتقال فراہم کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ تصویر بھی نہیں مل سکی۔ [illegible]۔

(نمونہ کلام)

بجلیاں گرتی ہیں چل جاتے ہیں خنجر دل پر
یاد جب آتا ہے عالم تری انگڑائی کا

جادو ہے یا طلسم تمہاری زبان میں
تم جھوٹ کہہ رہے ہو مجھے اعتبار ہے

وہ اک عالم تیار ہوتا ہے وہ اک جوش ہوتا ہے
جوانی میں کسے نیکی بدی کا ہوش ہوتا ہے

ستم کے عذر پہ وہ یہ بھی کہتے جاتے ہیں
مٹے گا آپ کے دل کا غبار مشکل ہے

آپ کو قدر نہیں اپنے پریشانیوں کی
آپ کی باتوں سے بو آتی ہے بیگانوں کی

عدیلؔ ـــــ سیّد نظیر علی

تاریخ پیدائش ۲۸ مئی ۱۹۲۹ء

سید نظیر علی عدیلؔ ولد الحاج سید خیرات علی مرحوم [نائب شریعت پناہ بلدہ] ۲۸ مئی ۱۹۲۹ء کو مغل پورہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے انٹرمیڈیٹ اور جامعہ نظامیہ سے منشی فاضل کامیاب کر کے ابتداً محکمہ سیول سپلائز میں ملازم ہوئے پھر محکمہ امداد باہمی میں بہ حیثیت جونیر انسپکٹر انجذاب عمل میں آیا پھر ترقی کر کے سینئر انسپکٹر اور کوآپریٹیو سب رجسٹرار ہوئے اور اسی عہدہ سے ۱۹۸۶ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

شاعری کا چسکا تو بچپن ہی سے تھا۔ لیکن ان کے اندر چھپا ہوا چپکے چپکے شعر کہنے والا آدمی اس وقت کھل کر باہر آگیا جب ۱۹۴۱ء میں اسکول کے ایک سالانہ جلسے کے سلسلے میں منعقدہ مشاعرے میں انھیں کلام سنانے کا موقع دیا گیا۔ اس جلسے میں ان کے والد محترم بھی موجود تھے۔ انھیں بے حد تعجب ہوا۔ انھوں نے روکا نہیں بلکہ حوصلہ افزائی کی۔ اور خود انھیں لے جا کر اپنے دوست حضرت احمد حسین امجدؔ سے رجوع کر دیا۔ حضرت امجدؔ نے غزل کا پرچہ دیکھا پھر اس میں کچھ اصلاح کرنے کی بجائے اس کی پشت پر چند کتابوں کے نام لکھ دیئے اور ان کے والد سے کہا کہ چوک میں تراب علی خان بازؔ کی دکان سے یہ کتابیں دلوا دو اور برخوردار کو ہر جمعہ بعد نماز میرے پاس بھیج دیا کرو۔ چنانچہ یہ پابندی سے حاضری دینے لگے۔ اور ان سے کتابیں پڑھتے رہے۔ دو سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد جامعہ نظامیہ سے منشی فاضل کا امتحان دینے کے لیے فرمایا۔ تعمیل حکم میں اعلیٰ ثانوی کے ساتھ ساتھ منشی فاضل کا امتحان بھی دیا گیا۔ اور ۱۹۴۴ء میں دونوں

امتحانات مدارج دوم کامیاب کرلیئے۔ اس کے بعد حضرت امجد انھیں حضرت صفی اورنگ آبادی کے پاس لے آئے اور یہ کہہ کر ان کے سپرد کردیا ؎

"سپردم بہ تو مایۂ خویش را"

حضرت صفی نے بڑی دلجوئی کی اور اپنے مربیانہ طریقۂ اصلاح کلام سے اپنی زندگی (۱۹۵۴ء) تک رہنمائی کی۔ ان کے انتقال کے بعد یہ پھر حضرت امجد سے رجوع ہوگئے اور ان کی زندگی تک استفادہ سخن کرتے رہے۔ بقول عدیل صاحب "کاش میرے یہ دونوں اساتذہ زندہ ہوتے اور آج مجھے فنون لطیفہ کے شعبہ شاعری میں "باپ" ہونے کی خوشی سے زیادہ "یتیم" ہونے کا غم نہ ہوتا۔

اپنے لیے حضرت جگر مرادآبادی کی طرح ایک الگ راستہ بنانے کی کوشش کی۔ جو شعرا اس طرف توجہ دے کر اپنی شاعری میں اضطراب و تجسس کی نئی راہیں نکالتے ہیں وہ اپنے دور کے ذہنی رویوں سے بہت قریب ہوجاتے ہیں اور اپنا ایک الگ مقام بنا لیتے ہیں ؎

شعر کی فکر نہیں ہے کوئی آسان عدیل
بند شیشے میں یہ مشکل یہ پری ہوتی ہے

حیدرآباد و بیرون حیدرآباد طرحی و غیر طرحی مشاعرے پڑھ چکے ہیں۔ اخبار و رسائل میں ممتاز مقامی روزناموں، ہفت روزہ جرائد اور ماہناموں کے علاوہ ہندستان کے تمام معروف و ممتاز رسائل جیسے بیسویں صدی، شمع، روبی، آجکل، نیا دور فلمی ستارے، وغیرہ اور روزناموں میں خدمت کشمیر، ہمدرد کشمیر، ملاپ دہلی، جالندھر حیدرآباد اور ہفت روزہ ملاپ لندن میں بارہا ان کا کلام شائع ہوچکا ہے۔

حیدرآباد کے نیرنگ پروگرام میں حصہ لینے کے علاوہ ریڈیو کشمیر سری نگر، اور نئی دہلی کی لوکل اور اکسٹرنل سروس سے بھی کلام نشر ہوچکا ہے۔ نیز سری نگر کشمیر نئی دہلی، امرتسر اور حیدرآباد کے ٹیلی ویژن اسٹیشنوں سے اپنا کلام ٹیلی کاسٹ کرچکے ہیں۔ ایک حمد، ایک نعت، ایک منقبت اور دو مناجاتوں کا سلسلۂ مقبولیت پورے ہندوستان میں گھومتے ہوئے بمبئی میں مرکوز ہوگیا بعد ازاں ماسٹر وائس گراموفون کمپنی

نے بین الاقوامی شہرت یافتہ موسیقار پدم شری عزیز احمد خاں وارثی کی آواز میں انھیں ریکارڈ کرلیا۔ اب اس وقت بازار میں حمد، نعت، مناجات و منقبت پر مشتمل (۳) گراما فون ریکارڈز ہیں۔

۱۹۵۵ء میں مکتب صفی سے میری وابستگی کے باوجود میں عدیل صاحب سے پہلی بار اس کام کے سلسلے میں اوائل جون ۱۹۹۰ء میں ملا۔ اور انھوں نے اس کام میں میری حوصلہ افزائی کی اور بھرپور تعاون سے نوازا جس کا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہے۔ حالات، نمونۂ کلام و تصویر عنایت فرمائی۔

نمونۂ کلام

کرتے ہیں جہاں شمس و قمر ڈوب کے سجدے
تیرا ہی وہاں نقشِ کفِ پا تو نہیں ہے

کون دیتا ہے جاں کسی کے لیے
زندگی ہر کسی کو پیاری ہے

بہت سنبھل کر گزرنا عدیلؔ دنیا سے
قدم قدم پہ یہ ٹوٹی ہوئی سڑک ہے میاں

یہ نہ کہیے کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے
آج کے دور میں یہ لفظ بڑی گالی ہے

میرے احباب نہیں آئے عدالت تک بھی
اور دشمن نے مرے حق میں گواہی دی ہے

حسن ہے اصل میں فروغ نظر
لوگ اپنی نظر سے مرتے ہیں

روشنی دیکھنے والوں نے یہ کب سوچا ہے
صبح نے کتنے ستاروں کا گلا گھونٹا ہے

کتنی آباد سے آباد تری دنیا ہے
اب تو قائل ہو کہ آدم کا قدم اچھا ہے

دل بھی بیگانہ نم بھی بیگانے
کوئی اپنا نہیں قسم کھانے

موت کس بات پر اکڑتی ہے
ہم تو پیدا ہوئے ہیں مر جانے

شمع کی آنچ میں کمی تو نہیں
جل کے ٹھنڈے پڑے ہیں پروانے

شب کی قسمت بدل نہیں سکتی
لاکھ گھر گھر جلیں چراغ میاں

ایک ہے میرا ظاہر و باطن
جس طرح معنئ عدیلؔ و نظیر

یاد محبوب اگر شکل میں ڈھل جاتی ہے
دیکھنے والے اسے تاج محل کہتے ہیں

روح قابیل نے شاید نہیں پائی تسکین
آج تک سلسلۂ جنگ نظر آتا ہے

کتنی تڑپ ہے پروانوں میں
شمع ہوئی یہ دیکھنے روشن

دار پر چڑھ گیا کوئی لغزشِ نا تمام پر
بات غلط نہ تھی مگر کہہ دی غلط مقام پر

کیوں گناہوں سے کریں ہم اجتناب
زندگی اول خراب آخر خراب

بے ثباتی پائی ہے انساں نے
سطح پر مٹی کی ابھرا ہے حباب

دیکھنے کو شام تیرہ بخت ہے
توڑ دیتی ہے غرورِ آفتاب

جلوہ فرما ہے کوئی دل میں عدیل
کون ہے واللہ اعلم بالصواب

نکالیے نئے ظلم و ستم کی گنجائش
ابھی ہے اور مرے دل میں غم کی گنجائش

عدم کی راہ الگ ہے تمام راہوں سے
نہیں ہے اس میں نشانِ قدم کی گنجائش

صدیوں کے غم سے چور ہیں میری صدی کے لوگ
ٹوٹی ہوئی قبور ہیں میری صدی کے لوگ

گئے وہ دار سے کیوں اشکبار کیا جانے
جو لوگ ہنستے ہوئے لائے سوئے دار مجھے

ایک ہم پر ہی انحصار نہیں
کون دنیا میں بے قرار نہیں

زلزلے کیوں زمیں میں آتے ہیں
کس کو زیرِ زمیں قرار نہیں

پھر یہ اعلانِ حق تو کیسے ہو
دار تو ہے مذاقِ دار نہیں

جو غنچے کھلائے نہ گئے بادِ صبا سے
واقف تھے یقیناً وہ تبسم کی سزا سے

اب دوست کے برتاؤ کا اندازہ لگا لو
دشمن مجھے دیتے ہیں دلاسوں پہ دلاسے

قدرِ علم و ہنر نہیں نہ سہی
آپ بھی دیدہ ور نہیں نہ سہی

صبحِ محشر تو ہونے والی ہے
شبِ غم کی سحر نہیں نہ سہی

اِک نیا ہے باب یہ تاریخ کے ابواب میں
بچ گئے ہم دشمنوں سے لٹ گئے احباب میں

اس خوشی کے خواب دیکھے جو مقدر میں نہ تھی
چار دن کی زندگی تھی وہ بھی گزری خواب میں

ڈوبنے تک لڑنے والوں نے یہ سوچا ہی نہیں
ناؤ میں گرداب تھا یا ناؤ تھی گرداب میں

تاج داروں کے خواب کی تعبیر
سنگِ مرمر کی بن گئی تقدیر

دمِ آخر وہ دیکھنے آئے
سو گئے ہم تو جاگ اٹھی تقدیر

بے ضمیری کی تیرگی میں کیسے
ڈھونڈتا ہے چراغ لے کے ضمیر

موت کو سوچنا پڑتا ہے نیا داؤ عدیل
جب کوئی موت کے نرغے سے نکل جاتا ہے

عروضی ـــــ خواجہ معین الدین

تاریخ وفات ۱۹۵۹ء

حضرت خواجہ معین الدین عروضی مرحوم حیدرآباد کے متوطن اور ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ سن شعور کو پہنچتے پہنچتے ہی شعرگوئی شروع کر دی تھی۔ دینی و درسی تعلیم مکمل کرنے کے بعد محکمہ تعلیمات میں ملازمت اختیار کی مدرسہ وسطانیہ سکندرآباد کے صدر مدرس تھے۔ مشاعروں میں کلام تحت اللفظ سُناتے تھے۔ کوئی مجموعہ کلام نہیں ہے اور نہ پورا کلام ان کے متعلقین کے پاس محفوظ ہے۔ حضرت صفی کے دورِ وسطیٰ کے حلقہ تلامذہ میں سے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں انتقال کیا۔ تصویر نہ ملنے کا افسوس ہے۔

(نمونہ کلام)

مرے اعمال نیک و بد قیامت تک نہ لکھیں گے
اگر قیمت کے لکھے کو کراماً کاتبین سمجھے

ڈر کے بجلی سے جو سینے سے چپک جاتے ہیں
برق کے ساتھ نصیبے بھی چمک جاتے ہیں

خواہش کو اپنی ہم نے دیا مدعا قرار
دل جیسی پاک چیز کو ناپاک کر دیا!

زمین و آسماں فرہاد و مجنوں ایک کر بیٹھے
مگر ہم عاشقوں میں ہو گئے مشہور گھر بیٹھے

عشرتی — غلام خواجہ خان

جناب غلام خواجہ خاں عشرتی حیدرآباد کے متوطن تھے۔ تاریخ پیدائش و انتقال نیز کوئی تصویر دستیاب نہ ہوسکی۔ حضرت صفی کے تلامذہ میں تھے۔ اچھے شاعر اور مشاعروں میں شرکت کر کے تحت اللفظ کلام سناتے تھے۔ صرف دو شعر دستیاب ہوسکے۔ جو نمونہ کلام کے طور پر پیش ہیں۔

یاد نے اُس کی بپا کی ہے قیامت دل میں
پیار آنکھوں میں ہے جبکی نہ محبت دل میں
آپ سے کیا میں کسی سے بھی نہیں کہہ سکتا
آپ دل میں ہیں کہ ہے کوئی مصیبت دل میں

(سخن ورانِ دکن)

صفی کے منتخب اشعار

میرے حق میں شراب پانی ہے
اور پانی سے زندگانی ہے
عاشقی کا مزا ہے جنت میں
آپ ہیں، میں ہوں، نوجوانی ہے
جس نے دیکھا تجھے، وہ چیخ اُٹھا
ہائے کیا حسن، کیا جوانی ہے
خون روتا ہے، اور خوش ہے صفی
یہ بھی اک رنگِ زندگانی ہے

علیمؔ — غلام محمد غوث مدنی (عرف غوثو پاشا)

تاریخ پیدائش : ۱۹۰۱ء ؛ تاریخ وفات ۱۳ ؍ مارچ ۱۹۷۱ء

حضرت غلام محمد غوث علیمؔ مدنی ۱۹۰۱ء میں بمقام قاسم باؤلی یاقوت پورہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے پیر حضرت یحییٰ مدنی قطب المدینہ کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے والد حضرت محمد مدنی فقیر مرحوم کی ولادت مدینہ منورہ میں ہوئی۔ اسی نسبت سے ان کے نام کے ساتھ مدنی لکھا جاتا ہے۔

حضرت علیمؔ مدنی نے بیعت تو حضرت سید عمر قادری سے حاصل کی تھی لیکن خلافت اپنے والد سے حاصل کی۔

سنِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد جامعہ نظامیہ حیدرآباد سے مولوی فاضل کا امتحان کامیاب کیا اور پیروکار عدالت دیوانی کا پیشہ اختیار کیا۔ ویسے خاندانی منصبدار تھے۔ اسی اعتبار سے پوری زندگی معاشی فراغت اور خوشحالی میں گزاری۔ ان کے دادا حضرت سید احمد یوسف مدنی حضور نظام علیخان آصف جاہ دوم کے عہد سے حضور محبوب علیخان آصف جاہ ششم کے عہد تک قافلۂ سالار حجاج تھے اس طرح (۶۲) حج کئے اور (۱۰۴) سال کی عمر میں وفات پائی۔ رحلت کے بعد اپنے پیر ومرشد مولانا حافظ میر شجاع الدینؒ کے احاطے میں اپنی وصیت کے مطابق دفن ہیں۔ علیمؔ مدنی کے دو فرزند حافظ سید ابو محمد سید حسین محی الدین مدنی قادری چشتی اور حافظ سید ابوالحسن محمد داؤد محی الدین مدنی قادری چشتی ہیں۔

حضرت علیمؔ مدنی بھی حضرت صفیؔ کے دورِ اول کے تلامذہ میں سے ہیں۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کا ذوق تھا جو عہدِ شباب میں رنگ پر آیا۔ شعر گوئی شباب پر تھی لیکن اپنے طور پر مطمئن نہیں تھے۔ چند مشاعروں میں شرکت کے بعد طے کیا کہ حضرت صفیؔ

سے اصلاح لیا کریں گے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وہ علی آباد کے مکان میں مقیم تھے۔ ایک روز اپنی اہلیہ سے کسی بات پہ ناراض ہو کر بغیر ناشتہ کئے گھر سے نکل پڑے اور چار مینار کی طرف جا رہے تھے کہ اتفاق سے اس وقت مغل پورہ کی کمان کے پاس حضرت صفیؔ کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان کو کتراتے ہوئے گزرتا دیکھ کر آواز دی اور اپنے ہمراہ مکان لے گئے۔ دیوان خانے میں بٹھا کر اندر گئے اور گوشت، روٹی اور خشکہ لا کر ناشتے کے لیے رکھ دیا۔ حضرت علیمؔ مدنی نے ازراہِ انکسار کہا کہ میں ناشتہ کر کے آرہا ہوں۔ اس پر حضرت صفیؔ نے کہا کہ کیوں جھوٹ بولتا ہے؟ گھر سے لڑ کر بھوکا نکل گیا ہے۔ چل ناشتہ کر لے۔ یہ سُن کر علیمؔ مدنی ہکا بکا رہ گئے کہ آخر یہ بات حضرت صفیؔ کو کیسے معلوم ہوئی؟! لیکن ان سے پوچھنے کی جرأت نہ کر سکے۔ دوسرے دن انھوں نے اس واقعہ کا ذکر حضرت غلام علی حادیؔ سے کیا تو انھوں نے کہا کہ تم نے حضرت صفیؔ کو صرف شاعر ہی سمجھا ہے وہ "صاحب دل" بھی ہیں لہٰذا تمہارا چہرہ دیکھ کر وہ سب حال جان گئے اس دن سے ان کے دل میں حضرت صفیؔ کا احترام اور بڑھ گیا۔ جب بھی حاضرِ خدمت ہوتے تو ان کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھا کرتے تھے۔ کچھ دن کے بعد جب وہ شاگرد ہونے کی درخواست لے کر حضرت صفیؔ کے پاس حاضر ہوئے تو اُنھوں نے پہلے تو نصیحت کی کہ کسی سے بیر رکھنا شانِ آدمیت نہیں۔ آئندہ سب سے دل صاف رکھا کرو۔ اس کے بعد کہا کہ میں کسی کو اس وقت تک شاگرد نہیں کرتا جب تک کہ وہ میرے سامنے شعر کہہ کر نہ سُنائے۔ چنانچہ حضرت علیمؔ مدنی نے اُسی وقت [۵] شعر کی غزل کہہ کر پیش کر دی۔ حضرت صفیؔ نے غزل دیکھی اور شیرینی لانے کے لیے کہا۔ شیرینی آئی اور شاگردوں میں تقسیم ہوئی۔ پھر باقاعدہ ان کی شاگردی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس وقت جو (۵) شعر کی غزل موزوں کر کے سنائی تھی اس کے دو شعر یہ ہیں ؎

اس کے وعدہ پہ ہے قرار مجھے — کس پہ آیا ہے اعتبار مجھے!!

بے نیازی کو اُس کی کیا کہیئے — کر دیا جس نے دل فگار مجھے!

حضرت علیم مدنی کی طبیعت میں بلا کا زور تھا۔ شعر بڑے چست کہتے تھے اور مشاعروں میں بڑی گھن گرج کے ساتھ کلام سناتے تھے۔ ذخیرہ کلام خاطر خواہ ہے لیکن افسوس کہ اپنی طبیعت کے لاابالی پن کے باعث کوئی مجموعہ طبع نہ کرواسکے نہ ان کے دونوں فرزندوں حافظ ابو محمد سید حسین محی الدین مدنی اور حافظ سید ابوالحسن محمد داؤد محی الدین مدنی نے اس طرف توجہ کی

۱۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو بمقام رن مست پورہ دلوڑھی حیدر علی خاں میں وفات پائی اور وہیں کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ میرے مطالبہ پر حالات نمونہ کلام اور فوٹو حوالہ کی جس کے لیے میں اُن کے بڑے فرزند کا مشکور ہوں۔

(نمونہ کلام)

غوث اعظمؓ کا نام لیوا ہوں
بخت پر اپنی ناز کرتا ہوں

ہوں ازل سے غلام غوث علیمؔ!
اپنی نسبت میں کتنا اونچا ہوں

ہے عبث اس میں سوچنا اپنا
دن نیا رزق بھی نیا اپنا

میرا سب حال اُن پہ روشن ہے
پھر کیوں اِن سے حال کیا اپنا

پھر گئی دوست کی نگاہ کرم!
کام بن کر بگڑ گیا اپنا

عزت کے ساتھ کھیل گئے اپنی جان پر
مرنے سے پہلے مرتے تھے جو آن بان پر

حضرت صفیؔ کی یاد سے معمور ہے دل
حضرت صفیؔ کا نام ہے سب کی زبان پر

اس کے جلوے سے جہاں معمور ہے
ذرے ذرے میں اسی کا نور ہے

تذکرہ فرہاد کا سن کر کہا!
کوہ کن عاشق نہیں مزدور ہے

جس بوجھ کے اُٹھانے سے تھرا گئے ملک
بار گراں وہ رکھ دیا مجھ ناتوان پہ!

روضہ جناب خواجۂ اعظم کا ہے یہاں
ہے فخر اس لیے ہمیں ہندوستان پر!

اُلفت میں غوث کی جو فنا ہو گئے علیمؔ
باقی ہیں نام ان کے زمین آسمان پر

عیشؔ ــــ حافظ ابونعیم غلام احمد

تاریخ پیدائش: ۲؍ اکتوبر ۱۹۱۳ء

جناب غلام احمد عیشؔ المعروف بہ حافظ ابونعیم عیشؔ ۲؍ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو حضرت حافظ شیخ احمد کے گھر پیدا ہوئے۔ ایک حافظ کے گھر پیدا ہونے کی بنا سے مدرسہ حفاظ شاہی میں داخل کردیئے گئے۔ اور دس سال کی عمر میں حفظ قرآن کی تکمیل کرلی۔ اس دور کی روایت کے مطابق اعلیٰحضرت نظام سابع نے خلعت سلطانی سے سرفراز کرکے جامعہ نظامیہ میں تکمیل علوم کے لیے ذریعہ فرمان حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ جامعہ نظامیہ میں مولوی کے نصاب تک تعلیم حاصل کی پھر دائرہ ملازمت سرکاری میں داخل ہوگئے اور ۱۹۶۸ء میں معتمدی مجلس مال سے اہلکار درجہ دوم کی خدمت سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

شاعری میں تین اساتذۂ سخن سے فیض حاصل کیا۔ ابتداً حضرت حافظ صولت سے کلام پر اصلاح لی۔ بعد میں حضرت داغ دہلوی کے تلمیذ رشید حضرت عبدالولی فروغ کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ حضرت فروغ نے ابتداء میں ان کا تخلص رعد رکھا پھر اس کو بدل کر عیشؔ کردیا۔ جس سے ان کی شاعری نے ایک نئی کروٹ لی اور ذہن میں زبان و بیان کے چٹخارے چٹکیاں لینے لگے۔ انزل یہ ظاہر ہے کہ وہ حضرت فروغ سے مطمئن نہیں ہوسکتے تھے لہٰذا حضرت صفی اورنگ آبادی کے دور اول کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوگئے اس طرح (۳) اساتذہ سخن کی تربیت شعری نے ان کے کلام میں ایک ایسا نکھار پیدا کردیا۔ جو حضرت داغ کے خوشہ چینوں کا خاصہ ہے: تاحال عمر کے سات دہے مکمل کرچکے ہیں۔ اور صرف (۳) سال بعد آٹھویں دہے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔ طبیعت کے

لا ابالی پن نے کلام کو طبع کروانے کی توفیق نہیں دی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اپنے سارے کلام کو مرتب کر رکھا ہے۔ اگر کوئی ایسا سبب بن جائے تو وہ طبع ہو کر منظرِ عام پر آسکتا ہے ورنہ ان کے دُرِ افکار صدف ہی صدف میں رہ جائیں گے۔

آپ کے داماد نے حالات، نمونۂ کلام اور تصویر مرحمت فرمائی جن کا میں مشکور ہوں۔

(نمونۂ کلام)

پھر آگ سی تپشِ تن شورِ بادہ سر میں ہے — پھر انقلابِ دہر کا نشتر جگر میں ہے
کیا کیا بدل گئے ہیں زمانے کے روز و شب — دل میں ہے روشنی نہ اُجالا سحر میں ہے
جس پر نظر پڑی اسے پامال کر دیا — کیا تیر پُرفسوں نگہِ فتنہ گر میں ہے
اوروں کے عیب پہ ہی نہیں ہے نگاہِ عیش — خود اپنی کج روی بھی ہماری نظر میں ہے

ہو یہ رسم و راہ یارب خوش اثر میرے لیے — پھر وہ آتے ہیں یہ اندازِ دگر میرے لیے
ختم کر دی لذتِ دنیا میں ساری زندگی — آج روتا ہوں نہیں راہ سفر میرے لیے
مشکل آساں کرنے والے اک نگاہِ التفات — زندگی کی مشکلیں آسان کر میرے لیے
شیخ کو کعبہ مبارک برہمن کو بت کدے — عیش سب کچھ ہے کسی کا سنگِ در میرے لیے

قافلے والو کسی کو ہے کچھ اس کا بھی خیال — ایک پامال مقدر بھی رہِ منزل میں ہے
دور سے اندازۂ امواج و طوفاں کیا کرے — وہ نظر مصروف جو نظارۂ ساحل میں ہے
دردِ مستقبل کی کاوش الفتِ ماضی کی یاد — عیش کیا کیا سوزِ پنہاں اپنے سازِ دل میں ہے

یاد آجاتی ہیں ماضی کی بہاریں کیا کیا! — جب بہاروں پہ گلستاں کے شجر آتے ہیں
چھپ کے سو پردوں میں بھی عام ہے جلوہ اُن کا — دیکھنے والوں کو ہر شے میں نظر آتے ہیں

حدِ زمان و مکاں نہیں ہے تصورِ دو جہاں نہیں ہے!
ہماری دنیائے بیخودی میں زمیں نہیں آسماں نہیں ہے!
نگاہِ مضطر سے تا بہ جلوہ تلاشِ منزل ہیں تا بہ منزل
وہ کون سا مرحلہ ہے جس میں کشاکشِ امتحاں نہیں ہے
ہر ایک پتے میں ہر شجر میں ہر ایک ذرے میں ہر بشر میں
تلاشِ منزل میں کھونے والو تمہاری منزل کہاں نہیں ہے

غنیؔ — خواجہ محمد احمد عبدالوہاب خالدی

تاریخ وفات ۲۸ ؍ فروری ۱۹۸۶ء

حضرت خواجہ محمد عبدالوہاب غنیؔ خالدی مرحوم نواب خواجہ محمد عبدالستار صاحب کے فرزند تھے۔ تاریخ پیدائش معلوم نہ ہوسکی۔ والدہ کی طرف سے ان کا سلسلہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اورنگ آبادی سے ملتا ہے۔ غنی خالدی کی تعلیم میٹرک تک رہی اس کے بعد منشی عالم کامیاب کیا۔ اردو، فارسی، عربی میں مہارت رکھتے تھے۔ دفتر صرفخاص مبارک میں بہ عہدہ نظارت کارگزار رہ کر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ طبیعت میں چونکہ تصوف و معرفت کا رجحان تھا۔ اس لیے حیدرآباد کے ایک بڑا بزرگ حضرت خالدین جان نثار یار جنگ المعروف خالد میاں صاحبؒ کے مرید و خلیفہ مقرر ہوئے۔ شاعری میں بھی میلانِ فکر تصوف ہی کی طرف زیادہ رہا۔ حضرت صفیؔ کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ طبیعت میں کم آمیزی تھی اس لیے مشاعروں میں بھی چند مخصوص مشاعروں ہی میں شرکت کرتے اور ترنم سے کلام سناتے تھے۔

جناب غنیؔ خالدی صاحبزادہ پیر سید احمد پاشاہ صاحب احمد خالدی وجودی شمسی سجادہ نشین کے حقیقی بڑے بہنوئی تھے۔ غنی خالدی کا انتقال ۲۸ ؍ فروری ۱۹۸۶ء م ۱۸ ؍ جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ روز جمعہ ہوا۔ اور درگاہ حضرت شجاع الدینؒ واقع عیدی بازار میں اپنے خسر صاحبزادہ حضرت غوث پاشاہ قادریؒ کے حظیرہ میں دفن ہیں۔

(نمونہ کلام)

نہیں معلوم یہ کیسا مقامِ بندگی آیا ۔۔۔ مری ہستی پہ طاری ہے سرا ندر تِ جبیں سائی

فرقِ جسم و جاں جبھی محسوس ہوتا ہے مجھے
جب حدودِ عالمِ امکاں سے ٹکراتا ہوں میں

ان کے جلوے گم کئے دیتے ہیں جب مجھکو غنی
کاش ایسے میں ہو میرا اختتامِ زندگی

دشوار ہے اس حال میں ملنا بھی کسی سے
بے ساختہ اک آہ نکل جاتی ہے جی سے

جو کچھ ہو سلیقہ سے ہو جینا ہو کے مرنا!
ہر بات بگڑ جاتی ہے بے حوصلگی سے

لیے جا رہا ہے ذوقِ طلب اب جدھر مجھے
ملتی ہے ہر قدم پہ نئی رہگذر مجھے

دیوانہ جان کر کوئی انجان ہو گیا
ملنا ہے مجھ سے کوئی تیرا جان کر مجھے

طے ہو رہی ہے زیست عجب پیچ و خم کیساتھ
کیا کیا لگا ہوا ہے میرے ایک دم کیساتھ

ہے عالمِ وجود بھی کیا چیز اے غنی
دونوں جہاں کا راز ہے دیر و حرم کیساتھ

آپ کا فدائی ہوں عالم آشکارا ہے
آپ ہی کا بندہ ہوں آپ کا سہارا ہے

ہر قدم پہ حیراں ہوں محوِ رازِ پنہاں ہوں
نت نئی تجلی ہے نت نیا نظارہ ہے

سوجھتی ہے وہی تدبیر جو تقدیر میں ہے
جو بھی ہے بندۂ خاکی تیری تعمیر میں ہے

چھوٹنا سہل نہیں قیدِ تعلق سے غنی
دل کا کیا ذکر یہاں روح بھی زنجیر میں ہے

۵۷

حضرت صفی کے بارے میں

صفی دکن کی اس روایتی خودداری کے فرزند تھے جس نے اس سرزمین کو ہمیشہ باقی رکھا۔ ادب کے اس جگر گوشہ کی ماں ہونے پر مجھے فخر ہے۔

والدہ حضرت صفی

(ماہنامہ سب رس صفی نمبر)

حضرت صفی کی غزل کا اسلوب نکھرا ہوا ہے کہ اردو ادب میں اس کا ایک نمایاں مقام رہے گا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

[ماہنامہ سب رس۔ صفی نمبر]

غوث قادری — صاحبزادہ خواجہ میر ذوالفقار علیخان

تاریخ پیدائش،
تاریخ وفات ۲۴ر جنوری ۱۹۷۴ء م ۲۹ر ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ

حضرت صاحبزادہ خواجہ میر ذوالفقار علیخان غوث قادری مرحوم حسینی الحسنی سادات اور حضرت خواجہ خواجگاں خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی بخاریؒ کی اولاد سے ہیں۔ آپ کا اسم طریقت حضرت خواجہ ابوالخیر سید شاہ خواجہ میر ذوالفقار علی قادری چشتی نقشبندی، سہروردی، رفاعی اور متوکل لاؤ بالی ہے۔ نواب آصف جاہ اول کے حقیقی پھوپا اور حقیقی خسر نواب خواجہ میر کمال الدین علی خان المعروف بہ نواب خواجہ میر عوض خان بہادر تسورہ جنگ عضد الدولہ، اعتضاد الملک آپ کے جدِ امجد تھے۔ دوسری طرف نواب آصف جاہ بہادر کے نبیرہ شہزادہ نواب مبارز الدولہ بہادر کے نبسہ تھے۔

حضرت غوث قادری آبائی پیر طریقت اور سجادہ نشین تھے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں ان کے سیکڑوں عقیدت مند و مرید پھیلے ہوئے ہیں شاعری کا ذوق بھی اوائل عمر کا ہے۔ حضرت صفیؔ اورنگ آبادی سے متاثر ہو کر ان کے دورِ وسطیٰ کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے اور حضرت صفیؔ کے انتقال تک ان سے وابستہ رہے ۲۴ر جنوری ۱۹۷۴ء مطابق ۲۹ر ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ بروز پنجشنبہ بمقام بیت الغوث انتقال کیا۔ تدفین احاطہ درگاہ حضرت سید شاہ شجاع الدین قبلہ رح میں عمل میں آئی۔ ہر سال ۲۷ر ذی الحجہ تا ۲۹ر ذی الحجہ نہایت اہتمام سے عرس ہوتا ہے۔ حضرت غوث قادری کے فرزندِ دوم صاحبزادہ پیر سید احمد پاشا قبلہ احمد قادری وجودی شمسی اس وقت ان کے خلیفہ و جانشین ہیں۔

میرے مطالبہ پہ تصویر حالات و نمونۂ کلام میرے حوالے کیے جس کا میں مشکور ہوں۔

(نمونۂ کلام)

کہدیا اس نے جاں نثار اپنا — اس سے بڑھ کر ہو گیا وقار اپنا
چشمِ ساقی سے کیا لڑیں آنکھیں — دائمی ہو گیا خمار اپنا
ان کے جلوے دکھائی دیتے ہیں — وقت شاید ہے سازگار اپنا
اقتضائے جنوں ہے پیارے غوث — کیوں نہ دامن ہو تار تار اپنا

کسی سے حالِ دل کیا خاک ہم اپنا بیاں کرتے — جب اپنی عمر ہی گزری یہاں ضبطِ فغاں کرتے
گدازِ عشق دے کر اس نے کتنی مہربانی کی — نہیں تو ہم کہاں تک امتیازِ جسم و جاں کرتے

رنگ تیرے دیکھ کر اے جلوۂ جانانہ ہم — بیخودی میں رکھ رہے ہیں ہر قدم مستانہ ہم
ان کے جلوؤں کا تصرف خود سراپا راز ہے — یعنی امید و تمنا کا ہیں اک افسانہ ہم

جو دل نیازِ عشق کے سانچے میں ڈھل گیا — دامن بچا کے دیر و حرم سے نکل گیا
کیا وقت کیا زمانہ کہاں کا نظامِ زیست — بدلی تری نگاہ تو سب کچھ بدل گیا
بگڑا ہوا اگرچہ نظامِ حیات تھا — ان سے نگاہ ملتے ہی نقشہ بدل گیا
لغزش ہزار بار ہوئی راہِ عشق میں — لیکن تمہارا نام لیا اور سنبھل گیا ! !

حضرت صفی کے بارے میں

صفی حقیقی معنوں میں عوام کے شاعر تھے ان کا کلام صاف ستھرا، سلیس اور روزمرہ کے مطابق ہے۔ استاد داغ کا رنگ تغزل اور طرزِ بیان کا کافی اثر ان کے کلام پر دکھائی دیتا ہے۔

آنریبل گوپال راؤ اکبوٹے
(سب رس۔ صفی نمبر)

غیاث صدیقی ـــــــ ڈاکٹر غیاث الدین علیخان

تاریخ پیدائش: ۷ر اکتوبر ۱۹۲۶ء

جناب صاحبزادہ میر غیاث الدین علیخان خلف نواب میر معین الدین علیخان معین (معین رقم) کے صاحبزادے اور نواب میر فاروق علیخان عادل کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان کے والد کی ڈائری کے بموجب ۶ر ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ م ۲۲ر جون ۱۹۲۵ء اپنی آبائی دیوڑھی واقع شاہ گنج میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم جاگیردار کالج (حالیہ پبلک اسکول) میں پائی۔ جہاں وسطانوی تعلیم مکمل کر کے مدرسہ رفاہِ عام، فوقانیہ دار العلوم اور سٹی کالج میں اعلیٰ ثانوی کی تعلیم مکمل کی۔ پھر جامعہ عثمانیہ سے سنہ عیسوی کے لحاظ سے (۶۰) سال کی عمر میں ایم فل کا امتحان دیا۔ اور ۱۹۸۵ء میں بدرجہ اعلیٰ کامیاب کیا۔ ریسرچ کے لیے ان کے مقالے کا عنوان "آزاد اردو نظم میں عروض و آہنگ کے تجربے" ہے جو جامعہ میں داخل شدنی ہے۔ شعر و سخن کا ذوق موروثی ہے جو بچپن ہی سے سینہ میں مچل رہا تھا۔ جوان العمری میں تو وہ ایک شعلہ جوالا بن گیا۔ اصنافِ سخن میں نظم، آزاد نظم، اور غزل کی طرف میلان طبع زیادہ ہے۔ فکر نہایت عصری ہے۔ لب و لہجہ بھی جدید ہے اور شعریت سے بھرپور ہے۔ ابتداً سرور عظامی تھا لیکن ۱۹۵۳ء سے انھوں نے اپنا ادبی نام غیاث صدیقی رکھ لیا اور اسی نام سے تادمِ تحریر ادبی حلقوں میں متعارف و مقبول ہیں۔

شاعری سے ہٹ کر ان کے کئی ادبی کارنامے ہیں۔ زمانہ طالب علمی کے دوران ہی ایک ماہنامہ "سیوا" نکالا جو بہت دنوں تک جاری رہا۔ اس ماہنامے میں کئی دیگر نامور شعراء کے علاوہ خود حضرت صفی اورنگ آبادی کا کلام بھی شائع ہوا ہے۔

۱۹۷۲ء میں تلگو کے مشہور شاعر شیشندر شرما کے (۳۰) تلگو نظموں پر مشتمل شعری مجموعہ "شیش جت سُنا" (باقی ماندن) کے انگریزی ترجمہ کا جو خود شیشندر شرما کی زوجہ راجکماری اندرا دھن راج گیرجی کا کیا ہوا ہے۔ اردو میں ترجمہ کیا اور "نیلم کے پنکھ" کے نام سے شائع کروایا۔ اس کے ساتھ ہی رسم الخط بدل کر اس کو ہندی میں بھی شائع کروایا۔ صدر جمہوریہ کے صاحبزادے شنکر گیری نے تلگو، انگریزی ہندی اور اردو کے چار مجموعوں کا ایک ساتھ رسمِ اجرا انجام دیتے ہوئے ڈاکٹر غیاث صدیقی کے اس کارنامہ کو بے حد سراہا اور کہا کہ دنیا کے لیے یہ ایک بے مثال اور رہنمایانہ کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ڈاکٹر مسعود حسن خان مولانا شمس الرحمن فاروقی اور پروفیسر ڈاکٹر وحید اختر نے بھی بڑے پُرزور الفاظ میں اس کو سراہا ہے۔ ان تراجم کے علاوہ ڈاکٹر غیاث صدیقی کی طبع زاد نظموں، غزلوں اور ترجموں پر مشتمل ایک شعری مجموعہ "آواز کا رنگ" کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے جس کو آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے انعام بھی دیا ہے۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی کا شعری مجموعہ "قفسِ رنگ" ہے جو طبع زاد غزلوں، نظموں کے علاوہ عربی، انگریزی، اور تلگو نظموں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کی پشت پر ڈاکٹر صدیقی کے ساتھ حضرت جگر مرادآبادی کی ایک تصویر بھی ہے جو ۱۹۵۳ء میں لی گئی تھی۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے اس مجموعہ کے تعلق سے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر غیاث صدیقی شعر و ادب کا بڑا رچا ہوا ذوق رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں استاد داغ کے سلسلہ کی جانشینی کے آخری تاجدار حضرت صفی اورنگ آبادی کا تلمذ حاصل ہوا۔ جس کے باعث اُن کو زبان و بیان پر کافی تبحر حاصل ہے۔"

نثری کتابوں میں جامِ حیات، طنز و مزاح، مکلب کے دوست، سوانح حیات اور آپ بیتی ڈاکٹر غیاث صدیقی کے مضامین پر مشتمل کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک شعری مجموعہ "سمندر کی تمنائیں" اور ایک مضامین پر مشتمل مجموعہ "اپنا اپنا دکھ" کے نام سے زیرِ طبع ہے۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی حضرت صفی اورنگ آبادی کے آخری دور کے

تلامذہ میں سے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے میرے مطالبہ پر حالات، نمونہ کلام۔ اور تصویر مرحمت فرمائی ہیں ان کی اس ہمدردی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

(نمونہ کلام)

خزانے غم کے سمندر ہیں ناؤ میں جیسے — دلوں نے جمع کیا ہے خراج آنکھوں میں
غیاث تم نے دکن کے صفی سے کیا سیکھا — کہ پھر رہے ہیں ولی و سراج آنکھوں میں
دل نے وردی پھینک دی اوڑھ لی اپنی مالی — مصلحت کہتی رہی ایسا نہ تھا ایسا نہ تھا
شعور غم کو بھی مہمیز مانتا ہوں مگر — بلا تو غم بھی اپاہج بلا تماشا ہے
ہو کے دنیا میں سبک اترے ہم اپنے جسم میں — اپنے گھر میں آئے ہیں لو دسے کے دستک آئے ہیں
وہ قتل ہو کے بھی فصلیں نئی اُگاتا ہے — لہو کی جھیل میں صدیوں کے بیج ڈال گیا!
ارادہ عمل کا نیا نام تھا — ازل کی جبیں پر ملے کاف نون
دکھا دوستی کے بھی جوہر دکھا — نکال آستیں سے تو خنجر نکال
پلکیں بھیگیں جو نثری میں بھی ندامت سے بچا — ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا نکلا!
یہی تہذیب و روایت ہے وطن میں اپنے — غیر کے ہاتھ کٹے خون ہمارا نکلا!
چلئے دریا کی دوسری جانب — اک کنارا اگر اُداس رہے

صنوبر کے سائے میں خوش ہیں غیاث
ترستے ہیں چھت کو ہوس کے ستون

جینے کا ارمان بہت ہے — یہ مشکل آسان بہت ہے
کل تک جو سایہ تھا مرا — آج وہی انجان بہت ہے
دانا دشمن کتنے ہوں گے — دوست تو اک نادان بہت ہے
علم، سمندر، شاعر، قطرہ — اس دعوے میں جان بہت ہے
خود کو بھی پہچان غیثوا — ہیروں کی پہچان بہت ہے
ہم بہاروں میں بھی زخمی نہ ہوئے حیف غیاث — شاخ گل کوئی تو ٹوٹے کوئی تلوار گرے

قدیر ـــــ محمود عبدالقدیر

جناب محمود عبدالقدیر جناب محمد عماد الدین تحصیلدار کے فرزند تھے یہ
یزدز یار جنگ کے حقیقی نواسہ ہوتے ہیں جن کی دیوڑھی سلیمان جاہ چادرگھاٹ
چیلہ پورہ میں واقع تھی جناب قدیر اسٹیٹ سالار جنگ مرحوم میں سشن جج
کے عہدہ پر فائز رہے اور اسی عہدہ سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے اور بعد وظیفہ
سالار جنگ میوزیم میں بہ حیثیت مشیر کار گزار تھے۔ دیوڑھی کی فروختگی کے بعد محلہ
حمایت نگر میں شہید یار جنگ کے مکان کے نواح میں سکونت پذیر ہو گئے
اور وہیں داعیٔ اجل کو لبیک کہا تدفین خطۂ صالحین میں عمل میں آئی ان کی کوئی
اولاد نہیں تھی اور نہ کسی رشتہ دار سے ربط قائم ہو سکا۔

قدیر مرحوم پہلے حضرت ضیاء گورگانی کے شاگرد تھے اس طرح حضرت
صفی کے استاد بھائی ہوتے تھے حضرت ضیاء گورگانی کے انتقال کے بعد حضرت
صفی کے دائرہ تلمذ میں داخل ہوئے۔ صرف دو شعر نمونے کے طور پر پیش ہیں جو
ماہنامہ سب رس کے صفی نمبر ۱۹۵۶ء میں طبع ہو چکے ہیں۔

طفیل نالہ و فریاد اک زمانے سے
زمانہ ہم سے ہے بیزار ہم زمانے سے

تلاش لی گئی جس دم چمن میں بجلی کی
تو دستیاب ہوئی میرے آشیانے سے

کلیمؔ ـــــ صاحبزادہ میر محمدؐ علیخان

تاریخ پیدائش : ۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۵ء

صاحبزادہ میر محمدؐ علیخان کلیم صدیقی صاحبزادہ میر حبیب علیخان مرحوم کے فرزند ہیں جو بانیٔ سلطنتِ آصفیہ کے راست ورثا اور اولادِ صلبی ہی سے تھے۔ حضور نظام آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علیخان مرحوم سے ان کا رشتہ نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث سے اس طرح ملتا ہے کہ نواب سکندر جاہ کے تین فرزند نواب آصف الدولہ آصف رابع، نواب صمصام الدولہ اور نواب مبارز الدولہ ایک ہی بطن سے تھے اور نواب ناصر الدولہ سے آصف جاہ سابع کا راست سلسلۂ نسب ہے اور ان کا سلسلۂ نسب نواب صمصام الدولہ سے ہے۔ نیز ان کی والدہ محترمہ بھی صاحبزادہ میر سرفراز علیخان نبیرۂ نواب مبارز الدولہ سے راست سلسلۂ نسب رکھتی تھیں اور اس طرح شہزادہ نواب مبارز الدولہ ان کے نانا کے جدِ امجد ہوتے ہیں۔

صاحبزادہ کلیم نے ۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۵ء کو دیوڑھی نواب معزز جنگ خلف نواب صمصام الملک واقع اعتبار چوک میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم مدرسۂ اعزہ میں ہوئی اس کے بعد مدرسہ عالیہ سے ۱۹۴۵ء میں بدرجہ دوم میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ پھر نظام کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب یہ آٹھویں جماعت میں تھے شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ ابتداء میں حضرت محمدؐ علی شیدا سے تلمذ اختیار کیا پھر ان کی اجازت سے حضرت صفیؔ کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں شامل ہوگئے جن کی اصلاحیں ان کی شاعری کی منزل کی طرف شاہراہ ثابت ہوئیں۔ حضرت صفیؔ کے انتقال کے بعد مولانا غلام علی ہادی کو کلام دکھایا

اور ان کے انتقال کے بعد سید شاہ محی الدین ردمیؔ قادری سے تلمذ اختیار کیا۔
شاعری میں غزل کی طرف میلان طبع زیادہ ہے۔ اور بسیار گوئی کے باعث کافی سرمایہ
کلام کے مالک ہیں۔ تینوں اساتذہ کی اصلاح شدہ غزلوں پر مشتمل غزلوں وغیرہ کا
مجموعہ " جلوہ طور " کے نام سے طبع ہو کر مارچ ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔
صاحبزادہ کلیم شاعری کے علاوہ صحافت سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ابتداء میں
روزنامہ " نظام " نکالا کرتے تھے جو دو سال تک نکلتا رہا۔ اس کے بعد ایک ہفتہ وار
" چراغِ دکن " کے نام سے نکالا جو بہت مقبول اور مشہور ہوا۔ اور ایک لمبے عرصے تک
نکلتا رہا۔ لیکن کچھ نا مساعد حالات اور ہفت روزہ جرائد کو سرکاری اشتہارات کی
مسدودی کے باعث مسدود ہو گیا۔
صاحبزادہ کلیم مقامی مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں۔ عثمانیہ
لٹریری سرکل کے نام سے ایک باقاعدہ ادارہ چلاتے ہیں۔ جس کے تحت ہر ماہ طرحی و
غیر طرحی کامیاب مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ A/R سے بھی کلام سناتے ہیں۔

(نمونہ کلام)

ہے وہ رحمٰن و رحیم اور کریم و مختار
اس کے اوصاف کئی ہیں تو کئی ہیں اس کے نام

جو ظلمت مٹ گئی سارے جہاں سے
یہ بیشک انکے قدموں کا اثر ہے

کبھی جو حوصلے اپنے دکھا دیئے ہم نے
غمِ حیات کے چھکے چھڑا دیئے ہم نے

اہلِ غمِ جاناں کی اللہ ری رسوائی
ہر گام پہ پتھر ہیں ہر شخص تماشائی

اندازہ کچھ تو کرلیں ہم اپنی تباہی کا
اتنی تو کبھی فرصت ہم کو غمِ دنیا دے

مقصدِ مشکل سمجھتا کون ہے
دیکھتے ہیں لوگ مشکل کی طرف

خیر خواہوں کی دیکھ کر تدبیر
مسکرانے لگی مری تقدیر

ہم نے مضبوط جہاں حوصلۂ دل دیکھا
موج کے ساتھ ہی لپٹا ہوا ساحل دیکھا

خون سے ہم نے کبھی سینچا تھا گلزار دل کو
آج کے پھولوں کے چہروں سے وہ لالی نہ گئی

ہم غریبوں کا یہ گھر ہے لوگو
اسکی دیوار شکستہ ہے لوگو!

آواز تک آتی نہیں سانسوں کی گلی سے
کیا جانیئے کیا شہر کی دانوں نے کہا ہے

کلیم دید کا ارماں ہے آپ کو لیکن
کبھی نگاہ کی ہمت بھی آزمائی ہے

کیسے کیسے یہاں اخلاص کے پیکر آئے
انبیاء آئے رسول آئے پیمبر آئے

اس سے پہلے تھیں مری بے تابیاں بے دلیل
مسکرا کر آپ نے دیکھا مدلل ہو گئیں

ہائے اس انقلاب کے صدقے
گھر سے باہر نکل گئے ہم لوگ

گھبرا کے کلیم آئے تھے ہم تشنہ لبی سے
میخانے میں ہر رند تہی جام ملا ہے

میرے استاد ہیں صفی مرحوم
سو رہے ہیں جو کنجِ راحت میں

محبت میں مری بربادیوں پر
وہ خوش ہیں تو مجھے بھی غم نہیں ہے

۵۷

حضرت صفی کے بارے میں

صفی کی زندگی شاعروں کے ضرب المثل اخلاص کا نمونہ تھی۔ اپنے خونِ دل سے سینچی ہوئی متاع کو وہ کبھی کبھی چند سکوں کے بدلے مشتاقوں کے حوالے کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے تھے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد کثیر تھی۔ لیکن چند کے سوا سب کے سب ان کے احتیاج کے ساتھی تھے۔ وہ اُستاد کے لیے آنکھیں بچھا سکتے تھے لیکن اس کے گھر میں فرش بچھوانے کی سکت کم ہی میں تھی۔ صفی مستغنی تھے انھیں نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلہ کی پرواہ وہ سچے قلندر تھے اور زندگی کے ۶۳ سال انھوں نے قلندرانہ شان سے کاٹ دیئے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری

(ماہنامہ سب رس)

(صفی نمبر)

لطیف ــــ محمد لطیف الدین خاں (آسماں جاہی)

نواب محمد لطیف الدین خاں لطیفؔ (عرف سنجھلے نواب) امیر پائیگاہ نواب معین الدولہ بہادر مرحوم کے فرزند ہیں۔ شعری ذوق خاندانی ہے۔ اپنے دیگر بھائیوں کی طرح یہ بھی حضرت صفیؔ کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو گئے اور ان کے انتقال تک استفادہ سخن کیا۔ سنہ پیدائش اور سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا نیز کلام بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ صرف ایک شعر جو مجھے یاد تھا نمونہ کلام کے طور پر پیش ہے۔

غزل سنیئے لطیف الدین خاں کی
لطافت دیکھئے اردو زباں کی!

صفیؔ کے منتخب اشعار

کوئی جھوٹ کی حد بھی ہے نامہ بر
ابھی کہہ کے ابھی میں گیا آ گیا

خدا کی قسم کھا کے وہ چپ ہوئے
خدا کی قسم ہے مزہ آ گیا

شاید الم بھی کوئی بڑی چیز ہے صفیؔ
قرآں کی ابتدا ہے الف لام میم سے

حضرتِ انساں فرشتہ ہوں تو کیا
آدمی میں آدمیت چاہیئے

محوِ دیدار ہوئے ہم تو کسی کی نہ سُنی
نور آنکھوں میں جو آیا تو گئے کانوں سے

خیال بھی دلِ بیمار کا ذرا نہ ہوا
خوش آمدید کہاں تھے بہت زمانہ ہوا

قدر کرتا ہوں آپ اپنی صفیؔ
ہائے مجھ کو بھی کیا زمانہ ملا

ماجد ـــــ حکیم غفار احمد

تاریخ پیدائش: ١٦ر شوال ١٣٣٤ھ

حکیم غفار احمد ماجد قادری القدیری ١٦ر شوال ١٣٣٤ھ حسینی علم حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم طبیب طبابت یونانی سرکارِ عالی حیدرآباد دکن تھے۔ جدِ اعلیٰ تقریباً تین سو سال قبل مکہ شریف سے دہلی آئے۔ اور حیدرآباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ اپنے والد کی طرف سے قادری اور والدہ کی طرف سے ہاشمی ہیں۔ جامعہ نظامیہ سے ملنشی فاضل کامیاب کیا حکمت وراثتاً ملی۔ اور والدِ محترم کی صحبت اور تعلیم نے اسے اور جلا دی حکیم محمد اسمٰعیل حکیم محمود صمدانی مرحوم کے شاگردِ خاص تھے۔

حکیم غفار احمد ماجد اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ قرأت اور خوش نویسی میں بھی خاص مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے قرأت مولوی اسد اللہ حسینی سے سیکھی اور خوش نویسی مولوی عنایت اللہ خاں مرحوم سے۔ اردو اور انگریزی ٹائپ کے علاوہ وہ اردو میں شارٹ ہینڈ سے بھی واقف ہیں۔ دین کی تعلیم پیر طریقت بحر العلوم عبدالقدیر صاحب حسرت جیسے جیّد عالم سے حاصل کی۔ چند سال محکمہ طبابت یونانی دواخانہ ہری باؤلی سرکار عالی میں خدمات انجام دیں مابعد محکمہ محلات صرفخاص مبارک دلیشی اعلیٰحضرت حضور نظام کنگ کوٹھی اور خزانہ پیشی شاخ تقسیمات میں صیغہ دار کی حیثیت سے ملازمت کی۔ زوالِ حکومت نظام کے بعد زمرۂ حفاظ امور مذہبی صرفخاص مبارک متعلقہ مکہ مسجد میں خدمات انجام دیں۔

حکیم غفار احمد ماجد کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق رہا ١٥ سال کی عمر سے شاعری کا آغاز کیا ١٠ سال تک خود لکھتے رہے۔ بعد میں مفتی میر اشرف علی صاحب

اشرف سے تلمذ حاصل کیا اور تقریباً دس سال بعد امام تغزل حضرت صفی اورنگ آبادی کے آگے زانوے ادب تہہ کئے جس کا سلسلہ ۱۸ سال رہا۔ حضرت مفتی اشرف علی کے دورِ شاگردی میں ان کا تخلص احمد تھا حضرت صفی نے انھیں ماجد کے تخلص سے نوازا۔ آپ کو حضرت صفی نے اپنی زندگی ہی میں بغیر اصلاح کے غزل پڑھنے کی اجازت دے دی تھی جس سے ان کی شاعرانہ استعداد کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جس شاعر کے اساتذہ میں حضرت عبدالقدیر حسرت مفتی اشرف علی اشرف اور حضرت صفی جیسے شاعر ہوں تو اس کے کلام میں کلام ہی کیا ہو سکتا ہے حیدرآباد دکن کے بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کی اور اپنی طرحی غزلوں سے کامیاب شاعر کی حیثیت سے اپنا سکہ جمایا۔ ابتداً ترنم سے کلام سناتے تھے مابعد بوجہ پیرانہ سالی تحت میں کلام سنانے لگے گلدستہ زعم، گلدستہ جہانگیریاں، اخبار رہبر دکن رہنما، اخبار انقلاب، مجلہ حسان اور اخبار ملاپ وغیرہ میں ان کا کلام چھپ چکا ہے۔

حضرت صفی کو اپنے اس شاگرد پر پورا اطمینان تھا۔ حضرت صفی اپنے شاگردوں کو اپنی غزلیات کی اصلاح کے مشاعرے سے آٹھ دن قبل غزلیں دکھانے کو کہتے تھے لیکن حضرت ماجد کی پرگوئی اور زودگوئی کے باعث انھیں اس شرط سے مستثنیٰ کر دیا تھا لیکن یہ ارشاد فرمایا تھا کہ کم از کم مشاعرہ سے پانچ منٹ قبل کھڑے کھڑے سنا لیا کرو۔ اکثر ماجد صاحب سے رسم الخط کی غلطی ہو جاتی تھی تو ایک مرتبہ حضرت صفی نے تنگ آکر کہا تو "یا تو رسم الخط بدل یا استاد کو بدل"

جناب غفار احمد ماجد کے کلام میں شاعری کے وہ تمام لوازمات ملتے ہیں جو مکتب صفی کا خاصہ ہیں۔ پرگوئی زودگوئی، سلاست اور فصاحت فیضِ صفی ہی تو ہیں۔ جناب ماجد حضرت صفی کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

میں جناب غفار احمد ماجد صاحب کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے اپنے حالات نمونہ کلام اور اصلاحات و تصویر مرحمت فرمائی۔

(نمونۂ کلام)

اس کے وجود سے تو ہمارا وجود ہے
اب عبادت میں بھی وہ ربطِ عبادت نہیں
کون اُلٹائے گا اوراقِ وجود اور عدم
باغباں میں بھی ہوں واقف ترے گل بوٹوں سے
کامیابی کے لیے جہدِ مسلسل لازم
شرابِ معرفت پی۔ دیکھ پھر تفسیرِ میخانہ
نظر بچا کے زمانے کی آنکھ سے ماجدؔ
خم ہو کر صراحی ہو کر پیمانہ، اُٹھا لے
مستی میں کبھی گر تو سہی ان کے قدم پر
ہستی سے گزر کر غمِ ہستی سے گزر جا

اس کا عدم نہیں تو ہمارا عدم نہیں
قلب ہے ایک جگہ اور ہے سر ایک جگہ
مبتدا ایک جگہ ہے تو خبر ایک جگہ
میں بھی آیا ہوں گلستاں بہ گلستاں ہو کر
خود سرکتا نہیں ہر راہ کا پتھر دیکھو
ہر اک تصویر میں ہے صاحبِ تصویرِ میخانہ
کسی سے خاص اشاروں میں بات کرنی ہے
اس سے ہے بڑا ظرف تو میخانہ اُٹھا لے
کچھ لطف تو لے لغزشِ مستانہ اُٹھا لے
جو کچھ بھی مصیبت ہو دلیرانہ اُٹھا لے

وہ دستِ حنائی سے عطا کرتے ہیں ماجدؔ
اُٹھ اور قدم چوم کے پیمانہ اُٹھا لے

حضرت صفیؔ کے بارے میں

صفیؔ قدیم طرز کا ایک کامیاب شاعر ہے۔ وہ ایک واقفِ فن اور پختہ مشق شاعر ہے۔ ادا کی ندرت، بندش کی خوبی، واقعیات دلکشی، تشبیہات، محاورات اور روزمرہ کا برمحل استعمال ان کی عشقیہ شاعری کی جان ہیں۔ صفیؔ میں داغؔ کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں لیکن ان کی شاعری حسن و عشق کی عامیانہ و سوقیانہ اندازِ بیان سے پاک ہے۔

محمد منظور احمد منظور

[ماہنامہ سب رس صفی نمبر]

محبّت ــــ ابوالشجاع سیّد معین الدین

تاریخ پیدائش ماہ رجب ۱۳۳۰ھ تاریخ وفات ۲۶ر رمضان ۱۳۹۰ھ

جناب ابوالشجاع محبّت کا نام سیّد معین الدین ہے حضرت سید شمس الدین عارف مرحوم کے فرزند ہیں۔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ مفید عام مغل پورہ میں تعلیم پائی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد محکمہ کوتوالی کے اسپیشل برانچ (خفیہ پولیس) میں ملازمت اختیار کی۔ جہاں مددگاری کے عہدہ پر پہنچ کر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ جناب محبّت کے جدِ اعلیٰ محمد بن حسن مدینہ منورہ سے ملتان تشریف لائے اور بہ عہد سلطان علاؤالدین شاہ ثانی بہمنی ۸۵۱ھ میں حیدرآباد آکر مستقل سکونت اختیار کی۔ سلسلۂ نسب ۱۹ ویں واسطے سے حضرت سیدنا امام زین العابدین علیہ السلام سے ملتا ہے۔ اس طرح نجیب الطرفین سادات حسینی تھے۔

(۱۷) سال کی عمر سے شعر کہنے لگے اور ابتدائی کلام پر سید شاہ امید میر محترم قادری سے اصلاح لی۔ ان کی تصنیفات "جذبات محبت" آپ بیتی، مسودات شعر اور شاعر، مکار سادھو، زن پرست، حسین مقتولہ، چینتیان موسیقی ہیں۔ بہت خلیق اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ مجذوبوں اور بزرگان دین سے طبعاً لگاؤ تھا۔

۲۶ر رمضان ۱۳۹۰ھ بمقام شیخ محلہ روبرو آباد کیفے انتقال ہوا اور درگاہ حضرت سردار بیگ رح بھوئی گوڑہ میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کے فرزند عارف صاحب نے فوٹو اور نمونہ کلام و حالات روانہ کیئے جن کا میں مشکور ہوں۔

(نمونہ کلام)

عاشقِ ناشاد ہے غمگین ہے دل گیر ہے　　　نام ہے جس کا محبت اس کی یہ تصویر ہے

دنیا ملی جہان ملا مدعا ملا — تم کیا ملے کہ مجھ سے مرا خدا ملا

دل سے تو ایک بار بھی ہم سے ملا نہیں — ملنے کو یوں تو راہ میں وہ بارہا ملا

چشم ساقی کا یہ اثر دیکھا — بے خبر کر دیا جدھر دیکھا

وہ محبت سے ہو گئے برہم — یہ اثر ہے سنی سنائی کا

جس قدر امکان میں تھا اے جنوں سب کیا — آنکھ کا ڈھیلا لگایا روزنِ دیوار میں

بوسہ دینا کیا برا ہے ابروئے خمدار کو — چوم کر لیتے ہیں اکثر ہاتھ میں تلوار کو ا

اب محبت بھی ہمیشہ کیلئے سوتا ہے — تو بھی اے طالع خفتہ کبھی بیدار نہ ہو

ہمارا یار تو اتنا متین ہے — کہ ہم سے بات بھی کرتا نہیں ہے

ادھر آ نیند کے ماتے ادھر آ — قدم رکھتا کہیں پڑتا کہیں ہے

دل چرایا کسی نے یوں میرا — کہ فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی

جنوں کی حد پہ نظر آ رہے تھے دیوانے — مگر وہاں سے کہاں کھو گئے خدا جانے

پڑے ہے پتھر مقدر پہ ہمارے — قفس ٹوٹا مگر عاجز ہیں پر سے

یہ آدھی رات کو آہیں ہیں کیسی

ذرا دیکھو محبت تو نہیں ہے

▽▽

حضرت صفی کے بارے میں

صفی کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کشش و اثر ہے صوفیانہ محفل ہو یا طرب و نشاط کی بزم صفی کے اشعار شوق و دلچسپی سے اب بھی سنے اور سنائے جاتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو بہت کم شاعروں کے نصیب میں آئی

نصیر الدین ہاشمی

[ماہنامہ سب رس۔ صفی نمبر]

محفوظ ـــــ سید عبدالحفیظ

تاریخ پیدائش : ۱۹۱۶ء

نام سید عبدالحفیظ اور محفوظ حضرت صفی اورنگ آبادی کا عطا کردہ تخلص سمجھئے کہ قلمی نام۔ حضرت سید امیر علی صاحب کے فرزند ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں نور خان بازار بالستی کھیت کے قریب پیدا ہوئے لاہور سے ۱۹۳۵ء میں منشی اور ۱۳۵۳ف میں جامعہ نظامیہ سے منشی فاضل کامیاب کیا۔ سررشتہ صیغہ حساب ضلع بیڑ سے اگست ۱۹۷۵ء میں وظیفہ حسنِ خدمت سے سبکدوش ہوئے۔

استاد اور شاگرد کا رشتہ نازک ہوتے ہوئے بھی مضبوط ہوتا ہے۔ حضرت صفی نے اپنے شاگردوں کی فہرست مرتب کی تو اس میں ایک نام سید عبدالحفیظ محفوظ کا بھی تھا۔ ایک شاعر استاد کا شاگرد نثر نگار ہو تعجب کی بات ہے ویسے تربیت یافتہ کو بھی شاگرد کہا جا سکتا ہے۔ حضرت سید عبدالحفیظ محفوظ نے حضرت صفی کے فیضِ صحبت سے اندازِ تحریر کے علاوہ اخلاق کی تعلیم بھی حاصل کی۔ حضرت صفی عظیم شاعر ہونے کے علاوہ اچھے نثر نگار اور وضع دار شخصیت کے مالک انسان تھے۔ بقول ابو نصر خالدی حضرت صفی اخلاقیات کی درسگاہ تھے۔ جناب سید عبدالحفیظ حضرت شمس الدین تاباں کے قریبی دوست تھے اور حضرت تاباں حضرت صفی کے شاگردِ رشید اس طرح دونوں حضرت صفی سے ملا کرتے تھے اور تعلیم و تربیت کے موتی رولتے تھے حضرت محفوظ شاعر نہیں ہیں اور ان کے نام کے ساتھ محفوظ تخلص حضرت صفی کا عطیہ اس طرح ہے کہ وہ خطوط میں نام کے ساتھ محفوظ لکھا کرتے تھے۔ حضرت محفوظ کی نثر نگاری کا انداز انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ جیسے الفاظ کی مالا بنا دی گئی ہو۔ انھوں نے حضرت تاباں کے مجموعہ کلام "زنجیرِ زنار" پر رائے لکھی ہے اس سے ان کی طرزِ نگارش

کا اندازہ ہوگا۔ لکھتے ہیں :

"شمس جو کبھی شمیم تھے پھر صمیم ہوئے اور اب تاباں ہیں یوں کہنے کو تو اک قرن بیت گیا پھر بھی جیسے سامنے کی بات ہو کہ بچپن کی سرحدوں کو توڑ کر نکلتا ہوا سنِ بے باک جوانی کی بہاروں کا آغاز، گاتا گنگناتا فضاؤں میں ترنم کی لہریں بکھیرتا حسینوں کی گلیوں میں گھومتا ہوا شمیم لاکھ بدلے مگر میری یادوں کی دُنیا میں تو سب کچھ محفوظ ہے۔

جوانوں میں کمسن شاعروں میں نووارد، خط و خال میں بلاوا، آواز فردوس گوش، شعر سہانے اپنی دُھن میں مگن معشوقوں کو چیلنج کرتا ہوا کہ

آپ طرزِ ستم بدل ڈالیں ان جفاؤں میں کچھ مزا نہ رہا

شمیم چمنستانِ غزل کو مہکاتے رواں دواں چلا جا رہا تھا کہ غزل کے ہم وطن حضرت صفی کی آنکھوں میں اٹک گیا۔ نگاہ پڑی، منتخب ہوئے، کمند ڈالی گئی اور کھینچ لیے گئے۔ پھر کیا ہوا۔ ایک طویل داستاں ہے۔

شعر و غزل کی دنیا میں گزرے ہوئے کم و بیش چالیس سال دور کا خلاصہ یہ ہے شمس نکلا اُبھرا، چمکا ہے"

حضرت محفوظ کا مطالعہ وسیع ہے وہ ہر موضوع پر معلومات کا ذخیرہ رکھتے ہیں دینیات ہو کہ ادب وہ ہر شعبہ ہائے حیات میں اپنے اکتسابِ علم سے اس قدر عبور حاصل کر چکے ہیں کہ ان کی تحریر پتھر کی لکیر محسوس ہوتی ہے۔ گھر کی لائبریری میں کئی نایاب کتابیں موجود ہیں پڑھنا اب اُن کے روزانہ کا معمول بن گیا ہے پڑھنے سے زیادہ اکتسابی صلاحیت کا ملنا خدائی عطیہ ہے۔

حضرت محفوظ، حضرت صفی اورنگ آبادی سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں اُن پر مضمون لکھا ہے جس کے پڑھنے سے حضرت صفی کی ادبی اور اخلاقی خدمات کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اُنھوں نے "بنک میں سود" کے عنوان پر بھی معلوماتی آمیز مضمون لکھا۔

اس دورِ تشہیر میں گوشۂ گمنامی میں رہنے والے کو متقی کہا جاسکتا ہے حضرت سید عبدالحفیظ محفوظ بحرالعلوم ہونے کے باوجود تشنگانِ علم کو پیاسا ہی رکھے ہوئے ہیں۔ ایک وضع دار شخصیت کے مالک ہیں۔ خُدا سے دعا ہے کہ انھیں صحت و عافیت کے ساتھ عمر دراز عطا کرے۔

مذاق ــــــ شیخ امام علی

تاریخ وفات ۱۹۵۴ء

جناب شیخ امام علی صاحب فرزند جناب شیخ علی صاحب حضرت صفی اورنگ آبادی کے خاص شاگردوں میں سے تھے ان کی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو سکی۔ البتہ ان کے انتقال کا سن ۱۹۵۴ء ہے موصوف مذاق کے علاوہ ریختی میں میاں اور دہقانی زبان میں بھایاں تخلص فرماتے تھے۔ آپ کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا اس کے ساتھ ساتھ آپ موسیقی کے بھی دلدادہ تھے انھیں خصوصاً ستار میں مہارت حاصل تھی۔ جناب مذاق کا بہت سارا کلام تلف ہو چکا ہے۔ شیخ عمر علی صاحب جو آپ کے فرزند ہیں انھوں نے بہت تلاش کے بعد ایک ہی مطلع بطور نمونہ پیش کیا۔

میں اور بہری یاد سمجھ میں نہیں آتا
پھر کیجئے ارشاد سمجھ میں نہیں آتا

افسوس کہ ایسے عمدہ عمدہ شعراء کا کلام ہمیں دستیاب نہ ہو سکا۔
جناب مذاق ۱۹۵۴ء میں جاں بحق ہوئے اور تکیہ الوشاہ چوراہا جھنی میں تدفین عمل میں آئی۔

حضرت صفی کے بارے میں:

حضرت صفی کی زندگی میں ان کی ہم نے قدر نہیں کی جیسی کہ کرنی چاہیے تھی۔
سچ تو یہ ہے کہ قدر نعمت بعد زوال۔ بیانات
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
(سب رس صفی نمبر)

مُسلمؔ ـــــ غلام محبوب خاں

ولادت ۲۲، رجب ۱۳۳۱ھ وفات ۱۰ / مئی ۱۹۹۱ء

نام غلام محبوب خاں، تخلص مُسلمؔ ۲۲ رجب المرجب ۱۳۳۱ھ بروز جمعہ حاجی لیسین خاں صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ اُونچا قد بھرپور جسامت، روشن آنکھیں رعب دار شخصیت۔ فنِ عروض شاعری کے لیے بے حد ضروری ہے لیکن اکثر شعراء فن کے شکنجے میں اتنے جکڑ گئے کہ ان کے پاس شعریت کم اور فن زیادہ نظر آنے لگا۔ فصاحت، بلاغت، سلاست شاعری کے لوازمات ہیں جن کے باعث شعر قارئین اور سامعین کے ذہنوں پر چھا جاتا ہے۔ مکتبِ صفیؔ کے شعراء نے فن عروض پر خاص توجہ دی جناب محبوب خاں مسلمؔ کے کلام کو پڑھنے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے کلام میں شعریت کے ساتھ شاعری کے تمام لوازمات موجود ہیں مسلمؔ تخلص اُن کی شخصیت کا آئینہ دار ہے وہ دینی تعلیمات سے بھی بے حد لگاؤ رکھتے ہیں۔ حالانکہ جناب مسلمؔ حضرت صفیؔ کے دائرہ تلمذی میں صرف تین سال رہے لیکن بقول ان کے روزانہ ۸ تا ۱۰ گھنٹے حضوری کا شرف حاصل رہا اگر ہم اس کا تجزیہ کریں تو یہ تین سال کی مُدت تیس سال سے کم نہیں۔ ویسے کسی فرزانے کے ساتھ گزارا ہوا ایک لمحہ بھی ایک صدی پر محیط ہوتا ہے۔ اگر کسی میں اکتسابی صلاحیتیں ہوں تو اتنی مُدت اُس کے لیے کافی ہوتی ہے۔ حضرت مسلمؔ نے اس عرصہ کو غنیمت جانا اور علم و فن کا سبق سیکھا۔ خود اعتمادی ان کی شاعری اور شخصیت میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ۱۲ بہمن ۱۳۴۹ ف سررشتہ ہربکش رسالہ خاص اصفجاہی [نظم جمعیت سرکاری] میں ملازم ہوئے۔ یکم فروری ۱۹۵۰ء سے تاحال وظیفہ حاصل کر رہے ہیں۔
جناب غلام محبوب خاں مسلمؔ اپنے استاد کی طرح غیور طبیعت کے مالک ہیں

کسی رسالے میں غزل اپنی جانب سے نہیں دیئے مشاعروں میں گاہے ماہے جایا کرتے تھے اب صحت نے اس قابل نہیں رکھا کہ جائیں بھی تو جا سکیں۔ پُرگو شاعر ہوتے ہوئے باوجود ان کا کلام شائع نہ ہو سکا۔ یہ ان کے لیے نہیں بلکہ ادبی دنیا کے لیے شرمندگی کی بات ہے۔ ادارہ ادبستانِ دکن بہ یادگار حضرت صفیؔ اورنگ آبادی جس کے بانی و معتمد حضرت تاباںؔ تھے آپ خازن رہے اور "گلزارِ صفیؔ" کی اشاعت کے سلسلے میں مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ خرابیٔ صحت کے باعث آج کل دیوڑھی خورشید جاہ کے قریب مکان اور قریب مکان جناب محمد منظور احمد کلیانوی کاتب کے کمرے میں اپنی گزری ہوئی زندگی کی یادوں کے ہمراہ اپنے دن گزار رہے ہیں خدا انھیں صحت و عافیت کے ساتھ عمرِ طویل عطا فرمائے۔ ان کے کلام سے چند اقتباسات قارئین کی نذر ہیں۔

غزل [۱] ۷، جولائی ۱۹۵۶ء

قرار بخشئے کچھ اب تو بے قراروں کو
ستائے جائیں گے کب تک نظر کے ماروں کو

کمالِ اوجِ تخیل سا ان کے کیا کہنا
جو گردِ راہ بنا لیتے ہیں ستاروں کو

بہ اقتضائے نوازش معاف کر دینا
اگر سمجھ نہ سکوں آپ کے اشاروں کو

شعور اُن کا نظر ان کی ہے، دماغ ان کا
خزاں کے پردے میں جو دیکھ لیں بہاروں کو

نہ طُور جلتا نہ غش ہوتے حضرتِ موسیٰؑ
سمجھتے پہلے اگر حسن کے شراروں کو

صدائیں آتی ہیں پھر کس کی بربطِ دل سے
ذرا تو چھیڑ کے دیکھو نفس کے تاروں کو

وہ خود نمائی تھی یا تھا عروجِ انسانی
مگر نہ پوچھیے کچھ عرش کے نظاروں کو

تلاشِ دیر و حرم جن کو ہے انھیں ہو گی
تمہارے نقشِ قدم بس ہیں خاکساروں کو

بڑائی اپنی جتائیں نہ حضرتِ مُسلم
سمجھتے خوب ہیں، ہم بھی فریب کاروں کو

غزل (۲) ۱۵ رجون ۱۹۵۷ء

کیا ہے جب سے تیرے درد و غم کو دلنشیں میں نے
متاعِ زندگی پائی ہے لذّت آفریں میں نے

تحمل حوصلہ قلب و جگر دیکھیں جگر والے
دمِ کشتن بھی قاتل کو کہا ہے آفریں میں نے

عجب ہے اضطراب انگیز دورِ زندگی اے دوست
نہ دیکھی خواب میں بھی چین کی صورت کہیں میں نے

مری پرواز ہے بالاترِ بالا وہم دنیا سے
تعرُج میں بنایا آسمانوں کو زمیں میں نے

یہ کیا پردے کی سوجھی کیوں ہے پردہ کس سے پردہ ہے
تم ایسے چھپ رہے ہو جیسے دیکھا ہی نہیں میں نے

مرے حق میں ہے جنت حیدرآبادِ دکن مسلم
یہی میرا وطن ہے عمر کاٹی ہے یہیں میں نے

غزل (۳)

حسن سے دل کی جو تزئین ہوئی جاتی ہے
عشق سے زندگی رنگین ہوئی جاتی ہے

وہ زمانہ گیا جب دردِ الم ہوتا تھا
اب ترے درد سے تسکین ہوئی جاتی ہے

پڑ گئی جس پہ اسے حال سے بے حال کیا
آنکھ تیری بڑی قیتین ہوئی جاتی ہے

تیری صورت کا اثر ہے کہ ہر اک آہِ جگر
لب تک آتے ہی جو تحسین ہوئی جاتی ہے

سنگدل سنگ جگر سنگ نظر سنگ دماغ
غم کی روداد بھی سنگین ہوئی جاتی ہے

مجھ کو نظروں سے گراتا ہے زمانہ یارب
تیری تخلیق کی توہین ہوئی جاتی ہے

جلوۂ حق نظر آتا ہے بتوں میں مسلم
ان کی چاہت بھی مرا دین ہوئی جاتی ہے

میں جناب مسلم صاحب کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے حالات نمونہ کلام و تصویر مرحمت فرمائی۔

مشتاق — شیخ حسین

تاریخ پیدائش: ۱۹۲۱ء تاریخ وفات مارچ ۱۹۷۶ء

حضرت شیخ حسین مشتاق مرحوم حضرت صفی اورنگ آبادی کے دورِ اول کے تلامذہ میں سے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں اپنے والد شیخ حیدر حسین مرحوم کے آبائی مکان موتوعہ مغل پورہ حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ بی یو سی کامیاب کرنے کے بعد محکمہ صدر محاسبی [اکاؤنٹنٹ جنرل] میں اڈیٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور اکونٹس آفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ قلب پر حملہ ہوا اور جاں بحق ہوگئے۔ پرانی عیدگاہ مادنا پیٹ میں تدفین عمل میں آئی۔

حضرت مشتاق نہ صرف کم گو شاعر تھے بلکہ کم آمیز بھی تھے۔ مشاعروں میں بھی بہت کم شریک ہوتے تھے کلام کے تعلق سے ان کے بڑے فرزند جناب مصطفےٰ حسین نے لاعلمی ظاہر کی جو قابل ماتم ہے، البتہ ان کی ایک پوری غزل راقم الحروف کے پاس محفوظ تھی جو نمونہ کلام کے طور پر پیش ہے۔

اور جناب عبدالحفیظ صاحب محفوظ کا ممنون ہوں جنھوں نے اپنی شادی کی گروپ فوٹو سے ان کی تصویر علحدہ کروا کر بلاک بنوانے کی اجازت دی۔

ہوتا جو رنجِ دوست گوارا کسی طرح	کر لیتے ہم اسی پہ گزارا کسی طرح
نزدیک سے نہیں تو نہیں اے جمالِ یار	ہو جائے دور ہی سے نظارا کسی طرح
غم کو سمجھ رہے تھے سہارا ہے زیست کا	یہ بھی تو بن سکا نہ سہارا کسی طرح
اب بھی ہم اپنی وضع کے پابند ہیں حضور	بدلا نہیں شعار ہمارا کسی طرح
سینے پہ دل کا داغ نمایاں نہ ہو سکا	چمکا نہ اوج پر یہ ستارا کسی طرح
ہم ایسے خفتہ بخت ہیں مشتاق دہر میں	جاگا نہیں نصیب ہمارا کسی طرح

مظہر ___ نواب محمد مظہر الدین خان (آسمان جاہی)

تاریخ پیدائش: ۱۹؍ رمضان ۱۳۳۶ھ م ۱۹؍ جون ۱۹۱۸ء

نواب محمد مظہر الدین خان مظہر امیر پائیگاہ نواب معین الدولہ بہادر کے فرزند دوم ہی نہیں بلکہ شکل و صورت جسد و جسامت اور قد و قامت میں اپنے والد کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ ۱۹؍ جون ۱۹۱۸ء کو رمضان المبارک ۱۳۳۶ھ کی ۱۹ تاریخ تھی۔ اس طرح اس دن جب ان کی ولادت باسعادت عمل میں آئی تو خانہ باغ شاہ گنج میں ۱۹؍ رمضان کو ہی عید ہو گئی۔ ابتداً مدرسہ عالیہ اور اس کے بعد علیگڈھ جاگیردار کالج سن جارج گرامر اسکول میں سینیر کیمبرج ابتداً کیمبرج گرامر اسکول میں تعلیم پائی۔ حیدرآباد میں حضور نظام آعلیحضرت کے صرفخاص کے بعد سب سے بڑی پائیگاہ آسمان جاہ بہادر کی جن کے چشم و چراغ نواب معین الدولہ بہادر تھے اس لیے وہ حضور نظام حیدرآباد کے بعد حیدرآباد کے سب سے بڑے امیر و رئیس تھے۔ اب ظاہر ہے کہ نواب مظہر الدین خاں کو فارغ التحصیل ہونے کے بعد دیوانی کے کسی سرکاری محکمہ میں ملازمت وغیرہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی لیکن آعلیحضرت نے اس خیال سے کہ پائیگاہی امراء کو دیوانی کا بھی تجربہ ہونا چاہیئے ان کے بڑے بھائی نواب ظہیر یار جنگ بہادر کو صدر المہام تعلیمات مقرر کیا تھا اور دیگر امراء کو محکمہ مال کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے فرمان جاری کیا تھا۔ چنانچہ نواب مظہر الدین خاں کو اسی فرمان کے بموجب مسٹر گرانٹ صدر المہام مال نے ریونیو کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے ضلع اورنگ آباد پر متعین کیا تھا۔ جہاں انہوں نے ٹریننگ کا کورس مکمل کیا۔ لیکن پولس ایکشن کے بعد آعلیحضرت کا پائیگاہی امراء کو ریونیو کی ٹریننگ دلانے کا مقصد پورا نہ ہوا۔ کیوں کہ حالات یکسر بدل گئے۔ جاگیرات کا انضمام عمل میں آیا اور امراء کو وظائف مقرر کر دیئے گئے۔ اس لپیٹ میں تینوں پائیگاہ

بھی آئی۔ لیکن جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے کے مصداق اس انقلاب کا نواب
مظہر الدین خان پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اسی روایتی شان و شوکت اور کروفر سے
نارائن پور ہاؤس میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ نارائن پور ہاؤس سمستان نارائن پور
کی جائیداد ہے جو ان کی اہلیہ محترمہ ظہور النساء بیگم رانی سمستان' کے جہیز میں دی گئی۔

اورنگ آباد میں جب نواب مظہر الدین خان مقیم تھے تو وہاں کے لوگوں کو حیدرآباد
کے ایک امیر کبیر کے فرزند کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور جب یہ معلوم ہوا کہ نواب زادہ
شاعر بھی ہیں تو ان کو جی بھر کر دیکھنے کے لیے لگاتار مشاعرے منعقد ہونے لگے جن کے
منجملہ نواب مظہر الدین خاں نے روضہ باغ اور رنگین محل میں اور عرس حضرت نظام الدین
اولیاؒ کے موقع پر منعقدہ طرحی مشاعروں میں شرکت و صدارت کی اور اپنے کلام سے
شائقین کو محظوظ و مسرور کیا۔ اورنگ آباد سے واپسی کے بعد حیدرآباد میں منعقدہ
طرحی مشاعرہ حبیب کنتوری، مشاعرہ غلام صدیق عابد (علی آباد) مشاعرہ نواب محمد
لطیف الدین خاں (جہاں نما) مشاعرہ عرس حضرت برہنہ شاہؒ، مشاعرہ بزم سخن شہر نگر
مشاعرہ تلامذہ صفی (شاہ علی بنڈہ) مشاعرہ عرس حضرت خواجہ میاںؒ (قاضی پورہ)
مشاعرہ بزم تلامذہ صفی (دیوڑھی جہاندار جاہ مغلپورہ) اور مشاعرہ یادگار صفی
(دیوڑھی نواب مظفر جنگ مغلپورہ) میں شرکت کی اور اپنا طرحی کلام سنا کر دادِ تحسین
حاصل کی۔ اس کے علاوہ خود اپنے دولت کدہ نارائن پور ہاؤس میں منعقدہ ماہانہ
طرحی مشاعروں میں کلام سناتے رہے ہیں۔ عام مشاعروں میں شرکت سے گریز کرتے ہیں۔
نمود و نام کے خواہش مند نہیں اس لیے اخبار و رسائل سے بے نیاز ہیں۔

ان کا مجموعہ کلام "مظہرِ خیال" (۸۱) طرحی غزلوں پر مشتمل ہے ترتیب پا چکا
ہے اور عنقریب بڑی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آنے والا ہے جس کے بعد
یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں ہلچل سی مچ جائے گی اور یہ مجموعہ کلام ان کے والد محترم
نواب معین الدولہ کے مجموعہ کلام "معین سخن" کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ صرف
اس لیے نہیں کہ کلام دل آویز لب و لہجہ میں ہے، ندرتِ خیال سے بھرپور ہے
اور مکتب داغ کا مکمل ترجمان ہے بلکہ اس لیے بھی کہ عوام سے دور رہنے والے

ایک امیر کبیر کے دل میں عوامی زندگی کے دکھ درد کی آہٹیں اس طرح پائی جاتی ہیں۔ جیسے وہ عوام ہی میں کا ایک فرد ہو۔

نواب مظہر الدین خاں نے زندگی میں جیسا اک الگ مزاج پایا ہے ویسا ہی شاعری میں بھی ان کا منفرد رنگ ہے۔ شعر بڑے دل آویز اسلوب میں کہتے ہیں۔ زبان کا رچاؤ اور مضمون آفرینی کا رکھ رکھاؤ ان کے مجموعہ کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ شاعری میں اپنے والد محترم کے رنگ کی بہت کم اتباع کی ہے اور اپنے شاعر بھائیوں سے ہٹ کر اپنے لیے ایک علحٰدہ راہ بنائی ہے۔

نواب مظہر الدین خان حضرت صفیؔ کے دورِ متوسط کے تلامذہ میں سے ہیں اور اپنے استاد کی زندگی تک ان کے ساتھ ہزاروں کا سلوک کرکے بھی اس فکر میں رہتے تھے کہ اور ان کے لیے کیا کیا جائے؟ نواب مظہر الدین خاں صاحب نے میرے مطالبہ پر تصویر، حالات اور نمونہ کلام کے لیے اپنا غیر مطبوعہ کلام میرے حوالہ فرمادیا۔ میں اس ہمدردی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

(نمونہ کلام)

چوم لیتا ہے مصور اپنا ہاتھ — کھینچ کر خاکہ تری تصویر کا

آتے آتے آئیں گے وہ راہ پر — ہوتے ہوتے دوستی ہو جائے گی

کیوں ہمارا ضمیر صاف نہ ہو — جب کوئی سادگی سے ملتا ہے

تو ہی نہیں اپنے میں اتنا تو سمجھ ناصح — کیا راہ پہ لائے گا دیوانے کو دیوانہ

ہے رنگ جدا سب سے ظالم ترے عاشق کا — دیوانوں میں دیوانہ فرزانوں میں فرزانہ

مجبوریاں نہ پوچھئے میرے حجاب کی — وہ سامنے ہیں آنکھ اٹھانا محال ہے

آئے نہ تھے تو جان کا بچنا محال تھا — آئے ہیں وہ تو دل کا سنبھلنا محال ہے

جب وہ نظروں سے کام لیتے ہیں — دل کو ہم تھام تھام لیتے ہیں

مجھ سے شوخی بھی ہے تغافل بھی — ہر ادا سے وہ کام لیتے ہیں

جیسے وہ جانتے نہیں ہم کو — اس ادا سے سلام لیتے ہیں

وقت کو ہاتھ سے نہ کھو مظہرؔ — وقت سے لوگ کام لیتے ہیں!

اضافہ کر رہے ہیں آنسوؤں میں — مجھے وہ اس طرح سمجھا رہے ہیں

کیسے بے بس ہیں گرفتارانِ زندانِ حیات — اُن میں کوئی ایک بھی واقف نہیں میعاد سے

بات بے پیر کی اے مظہرؔ کوئی سنتا نہیں — عیب بھی سیکھے اگر انسان تو استاد سے

جاں نثاروں کی ذرا فہرست میں بھی دیکھ لوں — مجھ کو خارج کر کے تم نے کس کو داخل کر دیا

جب تامل تھا انھیں اقرار میں — ہائے کیا لذت تھی ہر انکار میں

عمر بھر یادگار رہتے ہیں — دن گزرتے ہیں جو محبت میں

ہم رہیں گے ساتھ تیرے دیکھنا — حشر میں بھی تیرا دامن تھام کے

جو برستا ہے وہ پانی اور ہے — بہتے اشکوں کی روانی اور ہے

میری ان کی بحث تھی اک خاص بات — بیچ میں کیوں بیچ والے پڑ گئے

آپ نے پوچھی جو ان کی آرزو — عاشقوں کے منہ کو تالے پڑ گئے

یہ نہیں پہلو میں میرے دل نہیں — ہے مگر کچھ آپ کے قابل نہیں

شمع ہوتی جو قبر پر مظہرؔ — کم سے کم ہوتے چار پروانے

کھل گیا ہم پہ حالِ مجنوں سے — وہی اچھا ہے جو خراب ہوا

طالبِ دید ہو گئے اندھے — وہ اچانک جو بے نقاب ہوا

اس گماں پر کہ وہ یہاں ہوگا — سینکڑوں در کی جبہہ سائی ہے

برق کی سادگی پہ مرتا ہوں! — دوسرا آشیاں نہیں معلوم

دردِ دل کا کچھ تو وہ چکھیں مزہ — جو بیتی ہے مجھ پر وہ اِن پر بیتے

گھر کا مالک گھر کا دشمن بن گیا! — دِل میں جو رہتا ہے دل آرام سے

قدر کر اپنی نگاہِ ناز کی! — پھینک دے جو ہاتھ میں تلوار ہے

جان کی صورت تو جس کے دل میں ہے — عشق کی وہ آخری منزل میں ہے

ڈوبنے والے کے دل سے پوچھئے — ہے بھنور میں لطف یا ساحل میں ہے

ہو گیا احساسِ خونِ بے گناہ — اب تو بسمل کی تڑپ قاتل میں ہے

ہم نشیمن میں جب نہیں ہوتے برق — پھر نشیمن سے دشمنی کیا ہے

ملالؔ ــــــ عنایت علی قریشی

عنایت علی قریشی ملالؔ حیدرآباد کے متوطن تھے۔ شعر اچھے اور سلجھے ہوئے کہتے تھے۔ فلسفیانہ طبعیت پائی تھی۔ اولاً حضرت تراب علیخان بازؔ سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ بعد میں حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

افسوس کہ تاریخ پیدائش و وفات و تصویر نہ مل سکی۔

(نمونہ کلام)

نکتہ سنجی اسی کو کہتے ہیں!!
عشق پر دردِ گار ہے اپنا!

دو دن کی زندگی ہے کسی طرح کاٹ دے
تو اپنے منہ کو کھول نہ اپنی زباں اُٹھا

میرے نالوں کا اثر اتنا تو ظاہر ہو گیا
بے وفا سر پیٹتا پردے سے باہر ہو گیا

خود ہی رہ گیر ہوں میں آپ ہی رہبر اپنا
اس کا گھر ڈھونڈھتا ہوں بھول گیا گھر اپنا

ناداںؔ ـــــ محمد احمد الدین خاں (آسماں جاہی)

نواب محمد احمد الدین خاں ناداںؔ نواب معین الدولہ بہادر مرحوم امیر پائیگاہ کے فرزند ہیں۔ شعری ذوق خاندانی ہے۔ سرورنگر پیلیس میں حضرت صفیؔ کی آمد و رفت کے دوران ان سے تلمذ اختیار کیا۔ بزمِ سخن سرورنگر کی طرحی محفلوں میں پابندی سے شرکت کرکے کلام سُناتے تھے۔ سنہ پیدائش اور سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا۔ اور صرف ایک غزل دستیاب ہوسکی جو نمونۂ کلام کے طور پر پیش ہے:

(نمونۂ کلام)

جو طبیعت کو اُس کی پا نہ سکے ۔۔۔ رنگ اپنا کبھی جما نہ سکے

چشمِ ساقی قسم ہے مستی کی! ۔۔۔ بادہ خواروں کو ہوش آنہ سکے

رنگ وہ کیا بھرے محبت میں ۔۔۔ خاک غم بھی جو بنا نہ سکے

باغباں اس طرح سے ویراں کر ۔۔۔ پھر چمن میں بہار آ نہ سکے

دیدہ و دل میں آگیا کیسے ۔۔۔ دونوں عالم میں جو سما نہ سکے

بات کیا تھی کہ حضرتِ موسیٰ ۔۔۔ اُن کے جلوہ کی تاب نہ لا سکے

جی بھر آیا کچھ ایسا اے ناداںؔ
غمِ دل اُن کو ہم سُنا نہ سکے

خرامِ ناز پر آنکھیں لگی ہیں ایک عاشق کی
اگر وہ دیکھ لے تو اور ہی رفتار ہو جائے (صفیؔ)

ناوکؔ — میر سرفراز علی

تاریخ پیدائش ۱۲ر محرم ۱۳۳۶ھ تاریخ وفات ۱۶ر جنوری ۸۲ء

جناب میر سرفراز علی ناوکؔ حضرت میر لیاقت علی سیفؔ مرحوم مہتم خزانہ پائگاہ نواب معین الدولہ کے چوتھے فرزند ہیں۔ ان کے تینوں بڑے بھائی حضرت یاور علی خنجرؔ میر بہادر علی جوہرؔ اور میر احمد علی پیکاںؔ حضرت سیفؔ کی پہلی بیوی کے بطن سے ہیں اور آپس میں حقیقی بھائی ہیں۔ یہ دوسری بیوی کے بطن سے ہیں۔ ۱۶ر جولائی ۱۹۱۵ء م ۱۲ر محرم ۱۳۳۶ھ کو ڈیوڑھی منالال بہادر حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ ان کا سلسلہ حسب النسب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی میر بہادر علی جوہرؔ کی نگرانی میں ضلع ورنگل ہی پائی اور (۱۸) سال کی عمر میں فرسٹ لانسر حیدرآباد میں بہ حیثیت صوبہ دار میجر ملازم ہوئے۔ (۲۵) سال ملازمت کرنے کے بعد وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہوئے۔

جناب ناوکؔ کا گھرانا اس دور کا علمی گھرانا تھا اور شعروشاعری میں ممتاز مقام رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں پرورش پاکر شاعری سے کیسے دور رہ سکتے تھے؟ چنانچہ بچپن ہی سے جوانوں کی سی جولانی کے ساتھ شعر کہنے لگے۔ چونکہ یہ اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کو "ہمہ خاندان آفتاب است" کہا جاتا ہے، لہٰذا اپنے بھائیوں کی اتباع میں ان کی تان بھی وہیں ٹوٹتی تھی جہاں اس کو ٹوٹنا چاہیے تھا، یعنی حسب روایت حضرت صفیؔ سے تلمذ اختیار کرکے ان کے دورِ وسطیٰ کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ تلمذ اختیار کرنے کے بعد ایسا فیض صحبت پایا کہ حضرت صفیؔ کا ہی رنگ اختیار کرلیا اور تادم آخر انہی کے رنگ میں ایسی شاعری کی کہ کہیں کہیں اپنے بڑے بھائی میر بہادر علی جوہرؔ کو بھی جو اپنے استاد کے رنگ

میں شعر کہتے ہیں منفرد مقام رکھتے تھے، پیچھے چھوڑ دیا۔

وسط عمر ہی سے عرفانیات کی طرف مائل ہو گئے تھے، ریش و بُرودت کے ساتھ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو گئے اور جب رگِ جاں کی صدائیں زیادہ جھنجوڑ نے لگیں تو حضرت عبداللہ شاہ قادریؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے یک گونہ یکسوئی حاصل کی۔

جناب ناوک ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے اچھے انسان بھی تھے، طبیعت میں فقیری، دردمندی، انکساری اور ملنساری غضب کی تھی۔ یار باش تھے اور نہایت بذلہ سنج بھی۔ سیر و سیاحت کے بھی بڑے شائق تھے۔ یہی شوق ان کی جان پر بھی بن گیا۔ ہوا یہ کہ بعض احباب کے اصرار پر ۶؍ جنوری ۱۹۸۲ء کو حضرت بنے میاںؒ کے عرس کی ہماہمی میں شریک ہونے کے لیے اورنگ آباد گئے۔ مشکل سے (۳) دن عرس کی ہماہمی کے نظاروں میں محو رہے تھے کہ ۹؍ جنوری ۱۹۸۲ء کو دماغ پر فالج کا حملہ ہوا۔ حملہ بھی ایسا شدید ہوا کہ عالمِ بیہوشی ان کو اورنگ آباد سے حیدرآباد لاکر عثمانیہ جنرل ہاسپٹل میں شریک کرایا گیا، جہاں ایک ہفتے تک وہ آنکھ کھولے بغیر اور کسی محاذ پر پسپا ہوئے بغیر موت سے جنگ کرتے رہے لیکن ؎

"موت نے کب کسی کو چھوڑا ہے"

کے مصداق زندگی کی جنگ ہار گئے اور ۱۶؍ جنوری ۱۹۸۲ء کو ان آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بند کر لیا۔ ان کی موت نے مکتبِ صفی کی اس زبان کو جو جنوبی ہند میں بچے بچے کی زبان پر تھی بڑا شدید دھکا پہنچایا۔ بہ الفاظِ دیگر سر چڑھ کر جادو کی طرح بولتی ہوئی زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ یا یوں کہیے کہ دکن کی سرزمین سے برآمد ہونے والا دوسرا "کوہِ نور" نے جب دکن میں جوہر کی قدر کرنے والوں کو نہیں پایا تو وہ ہیروں کی اسی کان میں واپس چلا گیا جہاں سے برآمد ہوا تھا ؎

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

(نمونۂ کلام)

(فکر و خیال کے آئینے میں)

دل تو بس ایک بار ٹوٹ گیا — درد کیوں بار بار ہوتا ہے

اللہ اللہ ترے اشارے بھی — مر گئے کچھ خوشی کے مارے بھی

کتنے بھرپور وار ہیں ناوک — دمِ گفتار استعارے بھی

اوروں کی طرح خوگرِ فریاد نہیں ہوں — اس واسطے شاید میں انہیں یاد نہیں ہوں

دلوں کے حال ننگا ہوں میں پائے جاتے ہیں — کہاں کے زخم کہاں مسکرائے جاتے ہیں

(سلاست و لطافت زبان کے آئینے میں)

ہم سزاوارِ التفات نہیں — خیر جانے دو کوئی بات نہیں

لاکھ مجبوری سہی ناوک — دن کو دن ہی کہے گا رات نہیں

ان کو دل توڑنا تھا توڑ چکے ہیں ناوک — عمر بھر بیٹھئے اب سر بہ گریباں ہوکر

ساغر آتے ہیں اُسی کے سامنے — جس کو پانی کے برابر ہے شراب

لگا کر آگ دل میں جاتے جاتے بھی نہیں دیکھا — تعلق ہی نہ تھا جیسے انہیں جلتے ہوئے گھر سے

دشمنوں کی بساط ہی کیا ہے — میں تمہارا خیال کرتا ہوں!

جان لیوا وصل کا پیغام ہے — حسرتوں کی صبح دل کی شام ہے

ہر پریشانی سے اللہ بچائے اُن کو — جو مرے حال پریشاں سے گزر جاتے ہیں

اتنا بھی کبھی سوچ ستم توڑنے والے — انسان ہوں، پتھر نہیں، فولاد نہیں ہوں

کچھ یوں ہی ڈبڈبا گئیں آنکھیں — جائیے آپ کوئی بات نہیں!

آزادیٔ خیال پہ پابندیاں نہیں — لیکن زبان کھولو تو زنداں کی بات ہے

آتشیں رُخسار پیلے پڑ گئے — تم نے کیوں دیکھا غروبِ آفتاب

جناب ناوک کی لاابالی فطرت نے شعری سرمایہ کی حفاظت نہ کی۔ ان کے انتقال کے بعد بڑی تلاش پر صرف (۴۰) غزلیں دستیاب ہو سکیں جن کو "قرینۂ غزل" کے نام سے صاحبزادہ حکیم بدرالدین علیخاں ہلال آغائی نے مرتب و طبع کر کے حقِ شاگردی ادا کیا۔

ندیم (مغربی) ـــــ حسین بن محمد

تاریخ پیدائش: ۱۹۲۵ء ؛ تاریخ وفات ۲؍شوال ۱۳۹۵ھ
۳؍اکتوبر ۱۹۷۵ء

جناب ندیم مغربی مرحوم تالاپور میں پیدا ہوئے اور حیدرآباد میں سن بلوغ کو پہنچے۔ ان کی والدہ محترمہ ایس ایم برادرس کے پروپرائٹر سعید صاحب باوزیر کی پھوپی تھیں۔ ان کی ایک بہن مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور ایک بہن کا حضرموت میں ۱۹۸۶ء میں انتقال ہوگیا۔ مدرسہ نظامیہ سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد (۵) سال تک روشن مسجد کبوتر خانہ قدیم میں امامت کے فرائض انجام دیئے۔ بعد میں ضلع محبوب نگر میں بہ حیثیت گرداور ملازمت کی۔ پولیس ایکشن سے قبل چار مینار کے قریب دارالغربیہ ہوٹل میں قاضی تنویر کے حصہ دار رہے۔ ایک ہفتہ وار "اُردو" بھی نکالا جس کا دفتر مدینہ بلڈنگ میں تھا۔ اس کے ساتھ شاہ علی بنڈہ میں آشا ٹاکیز کے قریب ایک جنرل اسٹور بھی قائم کیا تھا۔

جناب ندیم مغربی فارسی اور عربی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر زہرہ بلگرامی کو ۲۷ سال تک ان کے گھر جاکر عربی کی تعلیم دی ہے۔ ڈاکٹر زہرہ بلگرامی سے جب میں نے تصدیق چاہی تو محترمہ نے فرمایا کہ "بے شک مولوی صاحب مجھے عربی سکھانے پابندی کے ساتھ میرے گھر آتے میں کبھی پڑھتی اور زیادہ تر مولوی صاحب تشریف لانے کے ساتھ ہی معافی چاہتے ہوئے اپنی ڈیوٹی پر دواخانہ چلی جاتی یہ سلسلہ ۲، ۳ سال تک چلتا رہا۔ میں نے دریافت کیا" کیا آپ نے ندیم صاحب سے قرآن پڑھا ہے" محترمہ نے کہا کہ نہیں میں اُن سے عربی زبان سیکھ رہی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ مولوی صاحب پابندی سے آنے کے باوجود میں عربی زبان سیکھ نہ سکی"۔ شاعری کا ذوق اوائل عمری کا ہے۔ شعر بہت اچھے اور سُلجھے ہوئے کہتے تھے۔

نظمی ـــــ صاحبزادہ میر نظام الدین علیخانؒ

تاریخ پیدائش ۱۹۱۲ء ✲ تاریخ وفات: ۲۵ مئی ۱۹۸۸ء

صاحبزادہ میر نظام الدین علی خان نظمی مرحوم ولد میر کرار علیخان مرحوم ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ نواب احتشام جنگ بہادر کے پوتے اور نواب نصرت جنگ ثانی کے نواسے ہوتے ہیں۔ اردو فارسی میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد کہیں کوئی ملازمت نہیں کی ذریعہ معاش صاحبزادگی کی تنخواہ تھی: پچیس چھبیس سال کی عمر سے شعر کہتے تھے۔ حضرت صفی کے دورِ وسطیٰ کے حلقہ تلامذہ میں سے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں "عہد عثمانی میں سخنورانِ دکن کے اردو شعراء کے تذکرہ مرتبہ تسکین عابدی میں آپ کا مختصر سا تذکرہ صفحہ ۳۵۹ پر ہے۔ ان کا انتقال محلہ جہاں نما میں ۲۵ مئی ۸۸ء میں ہوا۔ اور تکیہ روشن حجرہ میں دفن ہوئے۔ حالات، نمونہ کلام، اور تصویر آپ کے قریبی دوست جناب محمد صدیق صاحب نے مرحمت فرمائی۔ جس کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں۔

(نمونہ کلام)

افسوس دل لگا کے ہم اس سنگ دل کے ساتھ
بیٹھے بٹھائے ہو گئے بدنام پیار میں

آپ کے عشق نے پابند کیا ہے مجھکو
میں تو اب تک کسی آفت میں گرفتار نہ تھا

دوست دُنیا میں ہیں وہی نظمی
جو مصیبت میں کام آتے ہیں!

ذکر ہے میرے مسیحا کا مسیحاؤں میں
صرف ہے حضرت علیٰ کا کلیساؤں میں

نام احمد کا سہارا نہ لیا تھا جب تک
کشتی نوح بھٹکتی رہی دریاؤں میں!

مشاعروں میں بھی پابندی سے شرکت کرتے تھے لیکن جب مشاعروں میں کوئی خاص پذیرائی نہ ہونے لگی تو یہ اپنے احباب قاضی تنویر نظامیہ اور ابن احمد تاب کے ساتھ حضرت صفی اورنگ آبادی سے رجوع ہوئے اور ان کے دورِ آخر کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ حضرت صفی سے تلمذ اختیار کرنے کے بعد ان کے کلام میں کافی نکھار آگیا اور وہ مقامی اخبار و رسائل میں کلام چھپوانے لگے۔ حضرت صفی کی زندگی تک یہ اُن سے وابستہ رہے۔ ان دنوں حیدرآباد میں ان کو قاضی تنویر نظامیہ اور ابن احمد تاب کو اکثر ایک ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ اس طرح ان کا ایک مثلث بن گیا تھا۔ انتقال سے پہلے تک جناب ندیم مغربی شاہ علی بنڈہ پر واقع جنرل اسٹور چلاتے ہوئے شاعری کرتے رہے۔ مختصر علالت کے بعد ۲ر شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۳ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو انتقال کیا۔ اور بیرون فتح دروازہ مصری گنج کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کے برادرِ نسبتی رحیم صاحب نے تصویر مرحمت فرمائی جس کا مشکور ہوں حالات مختلف ذرائع سے معلوم کیئے گئے۔

(نمونہ کلام)

پوچھتے کیا ہو ہم سے کیا ہیں ہم — زندگانی کا ماجرا ہیں ہم
ہم حسینی ہیں ہم خلیلی ہیں! — وارثِ صبر و ابتلا ہیں ہم
کہیں گم کردہ راہِ منزل ہیں — کہیں منزل کے رہنما ہیں ہم
ہم سے عبرت لو دیکھنے والو — یادگارِ غمِ مضیٰ ہیں ہم
اپنی قسمت ندیم کیا کہیئے — بندۂ شیرِ کبریا ہیں ہم

شاید ملی ہے زندگیٔ مختصر مجھے — دیتی ہے شام روز نوید سحر مجھے
دل ہی ستا رہا تھا فقط پیشتر مجھے — لو زندگی بھی بن گئی اب دردِ سر مجھے
دل ہی میں وہ نہاں ہیں مگر دل بنے ہوئے — پھرنا پڑا ہے جن کے لیے دربدر مجھے
اہلِ جنوں کو عار کہ ناپختہ کار ہوں — اہلِ خرد سمجھتے نہیں شوریدہ سر مجھے
رہزن تو راہزن ہی تھے افسوس اے ندیم — لوٹا ہے رہبروں نے سر رہگذر مجھے

بن گیا ہوں میں نقشِ پا ان کا
رہ گزر سے ہٹا نہیں سکتے

ہے یہ ادائے دلبری ہے یہ نگاہِ بے رخی
پیدا کیا جو خاک سے خاک میں پھر ملا دیا

تلاشِ یار میں پھرتا رہا وہ سرگرداں
کسی کی قبر سے مٹی کا جو غبار اٹھا

زخمِ نشتر سے کہیں اور زیادہ نکلے!
فقرے چلتے ہوئے کچھ آپ جو چل جاتے ہیں

ان کی گلی میں رکھ کے جگہ دفن کے لیے
نظمی کا انتخاب کیا واہ کیا کیا!

بگڑے ہوئے قسمت کے ہیں روزِ ازلی سے
آدم گئے جنت سے تو ہم تیری گلی سے

آپ کو گورِ غریباں سے یہ وحشت کیسی
اک نہ اک روز یہ رستہ کبھی آنا ہوگا

کس کس کا قتل ان کو ہے منظور دیکھنا
دن رات اب کمر میں ہے خنجر لگا ہوا

کیا گفتگو کروں کہ میں بے بال و پر کا ہوں
سرخاب کا جناب کو ہے پر لگا ہوا

غیر کو حال پر مرے افسوس
دور بیٹھے وہ مسکراتے ہیں

تیرے دیوانے ہیں کمر بستہ
موت سے جی کہاں چراتے ہیں

سن کے نالوں کی صدا اس نے کہا یہ ہنس کر
ایسے نالے تو بہت آپ کیا کرتے ہیں

قبر پہ بیٹھا کرتے ہوئے ماتم تنہا
سنتے جائیں گے تری آہ و فغاں ہم تنہا

مرادیں نظمی کی منہ مانگے کیجیے پوری
لگا کے آس وہ بیٹھا ہے آستاں کے قریب

بندہ کو لاجواب کیا واہ کیا کیا
ذرہ کو آفتاب کیا واہ کیا کیا

نعیم ـــــ الحاج غلام عبدالقادر

تاریخ پیدائش: ۱۳/اپریل ۱۹۲۰ء

پورا نام غلام عبدالقادر ہے اور تخلص نعیم۔ دنیائے ادب اور احباب میں "قادر نعیم" قلمی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ۱۳/اپریل ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد جناب غلام جیلانی صاحب کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ان کے آبا و اجداد کی سکونت قدیم امام باڑہ عقب درگاہ حضرت زہرہ ماں صاحبہؒ ہے جو عیدی بازار کے قریب ہے ابھی تک یہیں مقیم ہیں۔ قادر نعیم صاحب کے ماموں جناب شیخ عبداللہ ترک تخلص فرماتے تھے جن کو حضرت توفیق حیدر آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

جناب قادر نعیم کی ابتدائی تعلیم دارالعلوم ہائی اسکول (کالی کمان) میں ہوئی۔ میٹرک کے بعد اجمیر سے انٹر کیا پھر جامعہ عثمانیہ کی تکمیل کی ناسازگار حالات کے باعث مزید سلسلہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ اور محکمہ معتمدی رسد میں ملازمت اختیار کرلی۔ بحیثیت سکشن آفیسر ۱۹۷۶ء میں سکریٹریٹ سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔
شاعری میں پہلے حضرت مفتی میر اشرف علی اشرف سے اور بعد حضرت صفی مرحوم سے تلمذ حاصل رہا۔ جناب نعیم حضرت صفی کے دورِ آخر کے حلقہ تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔
مجموعہ کلام "انجمن رنگ" کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔ جناب قادر نعیم کے کلام میں غم دوراں کے ساتھ ساتھ عصری کرب موجود ہے۔ موصوف کے کلام پر حضرت اشرف اور حضرت صفی کے کلام کا اثر نظر نہیں آتا بلکہ اُن سے جُدا ان کا اپنا ایک رنگ ہے۔ نمونہ کلام سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ میں نعیم صاحب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے پہلی ملاقات ہی میں اپنے حالات، نمونہ کلام و تصویر حسب وعدہ مرحمت فرمائی۔

(نمونہ کلام)

اپنی کشتی اگر بچانی ہے ✤ رُخ بدلنا پڑے گا طوفاں کا

حوادث دردمندانِ ازل کو کیا ڈرائیں گے — کہیں پروردۂ طوفاں بھی گھبراتے ہیں طوفاں سے

پست ہے رفعتِ افلاک بھی جن کے آگے — اب وہ کردار فقط ملتے ہیں انسانوں میں

بڑھ گئی ہے جہاں کی آبادی — آدمیت کی پھر بھی قلت ہے

قیدِ قفس نے طاقتِ پرواز چھین لی — ہونے کے واسطے تو رہا ہو گیا ہوں میں

بدلتے وقت کے انداز آگئے سب میں — دکھائی دیتا ہے ہر چہرہ صبح و شام نیا

کتنے پردوں میں ہے جلوہ ترا معلوم نہیں — ایک پردہ جو اٹھا دوسرا پردہ دیکھا

ہم کو ہر طرح احبابوں کا بھرم رکھنا ہے — دل جلائیں گے اگر روشنی کم دیکھیں گے

پھینکتا ہے وہی لوگوں کے گھروں پر پتھر — جس کا خود شہر میں شیشے کا مکاں ہوتا ہے

فریبِ زندگی کو زندگی کہنے کا وقت آیا — نہ وہ معیار باقی ہے نہ وہ کردار زندہ ہے

دل سے اک پل کے لیے ضبط کا رشتہ ٹوٹا — گل کھلا شاخ پہ یا زخم کا ٹانکا ٹوٹا

دم نہ لینے دیا حالات کے طوفانوں نے — بچ کے گرداب سے نکلے تو سفینہ ٹوٹا

زندگی میں نہ ملی کوئی خوشی تو نہ سہی — یہی کیا کم ہے تسلسل نہ غموں کا ٹوٹا

حضرت صفی کے بارے میں

صفی کے کردار کی ایک اور خصوصیت جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے وہ ان کی صاف گوئی تھی ان کی طبیعت میں بناوٹ اور منافقت مطلق نہ تھی۔ وہ اپنی جو رائے ہوتی بے لاگ طور پر مگر پسندیدہ انداز میں ظاہر کرتے جو بات انکے دل میں ہوتی وہ اس کو صاف ظاہر کر دیتے تھے۔ کبھی کسی کی طرف سے ان کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی تو دوسری ملاقات میں چھوٹتے ہی اس کا اظہار کر دیا مگر طرزِ بیان دل آزارانہ یا معاندانہ نہیں ہوتا تھا وہ بلاشبہ اپنے تمام ملنے والوں سے محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔ پروفیسر سید محمد (ماہنامہ سب رس صفی نمبر)

نورؔ ـــــ صاحبزادہ میر حسین علیخاں

پیدائش: ۱۹۲۳ء وفات ۱۸ اگسٹ ۱۹۸۸ء

صاحبزادہ میر حسین علیخاں نورؔ ۱۹۲۳ء کو صاحبزادہ میر حبیب علیخاں کے گھر پیدا ہوئے۔ آصف جاہی خاندان کے راست رکن شہزادہ نواب صمصام الملک کے نبیرہ تھے۔ مدرسۂ عالیہ میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی ۱۹۴۴ء میں علیگڈھ سے سند حاصل کی ۱۹۴۶ء میں کلکتہ سے ہومیوپیتھی اور طب یونانی کا ڈپلوما حاصل کیا۔

صاحبزادہ نورؔ کو اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علیخاں نظام سابع کی بارگاہ میں باریابی کا شرف حاصل تھا انھوں نے ۱۹۵۲ء محرم میں امام عالی مقام حضرت سیدنا امام حسین علیہ السلام کی شان میں چند قطعات منظوم کرکے اعلحضرت کی خدمت میں پیش کئے جس کو آصف سابع نے بے حد پسند فرمایا ایک قطعہ پیش ہے۔

عباسؑ سوئے نہر چلے تھے گھر سے ٭ ہر سمت سے کیوں تیر ستمگر برسے
یہ مصلحت حق تھی وگرنہ اے نورؔ ٭ پانی کے لیے آلِ محمدؐ ترسے

صاحبزادہ میر حسین علی خاں کا تخلص مصحفؔ تھا۔ اعلحضرت نے ۱۹۴۶ء میں سالگرہ کی تقریب کے موقع پر منظوم تہنیت کو ملاحظہ فرماکر نظام گزٹ میں ایک فرمان صادر فرمایا کہ مصحف صحیفہ آسمانی کو کہا جاتا ہے یہ تخلص رکھنا موزوں نہیں ہے لیکن تو مصحفی متقدمین میں ایک شاعر گزرا ہے جس کو میں نظر استحسان سے نہیں دیکھتا صاحبزادہ کے معروضہ پر اعلیٰ حضرت نے نورؔ تخلص تجویز فرمایا صاحبزادہ نورؔ کا کلام محفوظ نہیں ہے موصوف وضعدار شخصیت کے حامل تھے اور آخری دم تک نہایت پُر وقار زندگی گزاری۔

(نمونۂ کلام)

یہ دل نہیں ہے تمنائے دو جہاں کیلئے ٭ مکاں بنایا گیا ہے یہ لامکاں کے لیے

یہ خاکِ دل ہے مری تیرے آستاں کیلئے
زمیں کے واسطے ہے اور نہ آسماں کیلئے

کس جا نہیں حضورؐ کا جلوہ کہاں نہیں
دل کی نگاہ سے کوئی دیکھے تو یہ کہے

صاحبزادہ نوزؔ کا انتقال ۱۸ اگست ۱۹۸۸ء کو ہوا اور درگاہ برہنہ شاہؒ میں شاہی مقبرہ اکبر جاہ سے متصل قبرستان علاقہ معزز جنگ میں تدفین عمل میں آئی۔

میں صاحبزادہ نوزؔ کے برادر خرد صاحبزادہ سلیمؔ کا ممنون ہوں کہ موصوف نے حالات نمونہ کلام و تصویر مرحمت فرمائی۔

صفیؔ کے منتخب اشعار

جاڑوں کی چاندنی کی طرح ہیچ ہے صفیؔ
مفلس کا عشق اور جوانی غریب کی

نہ پوچھو حسن ہے یا حسن والا قابلِ سجدہ
ذرا لغزش ہوئی تو بات ہے ایمان جانے کی

اُسے کیا رات دن جو طالبِ دیدار پھرتے ہیں
غرض ہے تو غرض کے واسطے سو بار پھرتے ہیں

کہاں وہ درد جو ہوتا ہے اہل اللہ کے دل میں
کہاں وہ نالہ جس سے عرش کے پائے اُدھڑتے ہیں

کیسی کیسی خواہشیں جینے میں ہیں
سیکڑوں بچھو مرے سینے میں ہیں

جس سے نہ مل سکے اسے بدنام کر دیا
کیا کیا کمال کرتے ہیں دنیا میں یار لوگ

تجھے یہ صاف گوئی اے صفیؔ بدنام کر دے گی
لگائی جائیں گی رائیں ترے اشعار پر کیا کیا

نیرنگ ــــ سیّد دستگیر پاشاہ قادری

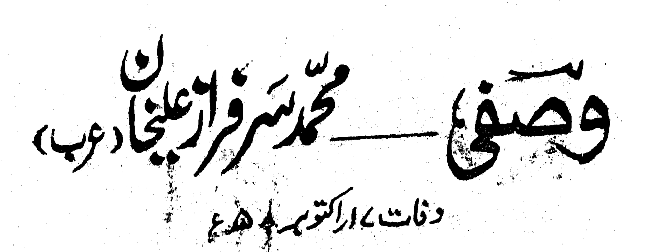
پیدائش مئی ۱۹۰۸ء ؛ وفات ۸ر جنوری ۱۹۳۲ء

سید دستگیر پاشاہ قادری کے جد اعلیٰ مولانا سید شاہ حبیب اللہ قادریؒ تھے جو عہدِ عادل شاہی میں بیجاپور کے جید عالم اور بزرگ گزرے تھے ۱۰۴۱ھ میں وصال کے بعد بیجاپور کی تاریخی "موتی گنبد" میں مدفون ہیں۔ ان کی اولاد بیجاپور سے حیدرآباد وارد ہوئی اور یہیں بس گئے۔ سید غوث قادری اولیٰ معتمد ملکی و مال پائیگاہ آسمان جاہی تھے۔ ان کے دو فرزندوں میں سید شاہ کلیم اللہ قادری اور سید شاہ خلیل اللہ قادری تھے جن کے مزار آستانہ قادریہ روبرو مسجد دھوبن قریب دارالسلام واقع ہیں۔ نیرنگ سید شاہ کلیم اللہ قادری کے فرزند تھے اور سید غوث یقینؔ، سید خلیل اللہ قادری کے۔ نیرنگ کے دادا سید غوث قادری اولیٰ نے اندرون کمان حسینی علم ایک مسجد تعمیر کروائی تھی جو ان کے آبائی مکان کے متصل ہے جو مسجد غوثیہ کے نام سے مشہور ہے۔ سید غوث یقینؔ پاکستان کو ہجرت سے قبل نیرنگ کے فرزند سید شاہ محمود صمدانی صابر قادری انجینیر محکمہ ریلوے کو آستانہ قادریہ کی مشترکہ تولیت تفویض کی۔

یقینؔ و نیرنگ مرحوم کا سلسلۂ نسب ۴۳ واسطوں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے۔ تعلقہ ظہیر آباد کے موضع قاسم پور کی جاگیر یقینؔ مرحوم کے حصہ میں تھی اور غوث آباد کی جاگیر سید دستگیر پاشاہ قادری نیرنگ کے حصہ میں اس کے علاوہ ان کے اجداد کی مساجد، درگاہیں اور خانقاہیں بیجاپور، گوا، کرنول، اور حیدرآباد میں یادگار ہیں۔ دو شعر پیش ہیں۔

پیکرِ وفا ہم ہیں خوگرِ رضا ہم ہیں ۔۔۔ دوست کی خوشی ہے بس منحصر خوشی اپنی

دوستی کے افسانے خواب بھی تو ہوتے ہیں ۔۔۔ اُس نے پھیر لیں نظریں آنکھ کھل گئی اپنی



وفات ۱۷ر اکتوبر ۵۸ء

محمد سرفراز علیخان (عرب) وصفی مرحوم ولد محمد امین خان مرحوم کروکلہ کونڈراؤپلی کلواکول کے جاگیردار تھے۔ تاریخ پیدائش دستیاب نہ ہوسکی، تاریخ وفات البتہ معلوم ہوسکی۔ جو ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء مطابق ۲۳ر ربیع الاول ۱۳۷۸ھ ہے۔ ان کی تعلیم، ذوقِ شعرگوئی، سلسلۂ تلمذ اور دیگر حالات پر پردۂ راز پڑا ہوا ہے۔ حضرت صفی نے اپنے قلم سے جو فہرست تلامذہ ترتیب دی ہے اس میں ان کا نام موجود ہے اور بہ مشکل تمام ایک قطعہ دستیاب ہوسکا ہے جو درجِ ذیل ہے۔

یہ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے وصفی
کسی کو خاص غلامی کی یوں سند نہ ملی
لکھا ہوا ہے جبیں پر مری بہ خطِ جلی
غلامِ فیضِ محمد ہے سرفراز علی

بعض قدیم تلامذہ کے مطابق یہ حضرت صفی کے دورِ اول کے تلامذہ میں سے ہیں ان کی تصویر و مختصر حالات اجمیری نواب نے عنایت فرمائے جس کے لیے میں موصوف کا شکرگزار ہوں۔

غلو ہے اے صفی میری غزل میں
مگر اتنا کہ آٹے میں نمک ہے
(وصفی)

وفاؔ ـــــ حاجی میر ولایت علی

تاریخ پیدائش ۷؍فروری ۱۸۹۹ء تاریخ وفات ۷؍اپریل ۱۹۶۸ء

جناب حاجی میر ولایت علی وفاؔ ولد میر یسین علی ۲۶؍رمضان المبارک ۱۳۱۶ھ مطابق ۷؍فروری ۱۸۹۹ء بروز چہارشنبہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ساتویں جماعت کے بعد جوڈیشل کامیاب کیا۔ ۱۶ سال تک پولیس سب انسپکٹر کے عہدہ پر خدمات انجام دینے کے بعد وظیفہ لے کر وکالت شروع کی اور کامیاب وکیل کی حیثیت سے انتقال سے ۸ ماہ قبل تک وکالت کرتے رہے۔ زیادہ تر فوجداری کے مقدمات میں وکالت کرتے تھے۔ اور اس تن دہی سے کرتے تھے کہ شاذ و نادر ہی کوئی مقدمہ ناکام ہوتا ورنہ ۹۹٪ مقدمات کامیاب ہوتے۔ جناب وفاؔ بڑے اقربا پرور اور ایک حساس دل کے مالک تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر ماہ لگ بھگ چھ ہزار روپے کی آمدنی کے باوجود انتقال کے وقت ان کے پاس صرف ۹۴ روپے تھے وہ اپنے عزیز و اقارب، دوستوں اور ضرورت مندوں میں بے دریغ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ جناب وفاؔ کو اصناف سخن میں نظموں سے خاص دلچسپی تھی۔ نواب بہادر یار جنگ کی صدارت میں کالی مسجد کے میدان میں منعقدہ جلسہ عام میں نواب صاحب کی تقریر سے پہلے "زمانہ کی تصویر" نظم سنانے کا موقع ملا۔ جس کو حاضرین نے بے حد پسند کیا اور خود نواب بہادر یار جنگ نے اسے پسند فرمایا۔ ان کی مشہور نظموں میں نبیؐ کی یاد (منظوم) رہنمائے اطفال، خزینۂ اخلاق، مشیر الحجاج اور "زمانہ کی تصویر" ہیں۔ حیدرآباد کے اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور خود گھر پر اکثر مشاعرہ منعقد کرواتے تھے۔ ان کے دو صاحبزادے جناب میر وزارت علی پاشاہ معتمد طور بیت المال اور میر نظامت علی صاحب مرحوم اپنے اپنے میدان کے

شہسوار ہیں۔ ان کا کلام رہبر دکن، مشیر دکن میں اکثر شائع ہوا کرتا تھا۔ ان کے کلام میں تغزل سے زیادہ عرفانی اشعار ملتے ہیں جو ان کے مافی الضمیر کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ جناب میر ولایت علی وفاؔ نے ۱۸ ؍صفر ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۷؍ مئی ۱۹۶۸ء بروز جمعہ بعد نماز فجر اس بے وفا زندگی کو خیرباد کہا اور احاطہ درگاہ حضرت سید شاہ راجوؒ واقع مصری گنج میں سپرد لحد کئے گئے جو اپنی زندگی میں ہی تیار کروا چکے تھے اور اپنی ہی زندگی میں یہ کتبہ لکھ کر وصیت کی تھی کہ وہ قبر پہ لگا دیا جائے۔

مری مزار پہ آؤ تو فاتحہ پڑھ لو
گناہ گار ہوں شاید اسی میں بخشش ہو
نہ زہد تھا نہ عبادت نہ کوئی نیک عمل
وفاؔ کو فکر یہی ہے کہ کیا نہ پرسش ہو

(نمونہ کلام)

جن و انسان ملائک و حیوان
ان سے پہلے ظہور کس کا تھا
کون بے ہوش تھا تجلی سے
طور کیا تھا وہ نور کس کا تھا
کوئی زنداں میں کوئی ماہی میں
یہ شکیب و صبور کس کا تھا
نفس نے جو کہا وفاؔ نے کیا
آپ کہیئے قصور کس کا تھا

رحمت حق کو ہی جوش آئے تو ہے بات جدا
میں وہ مجرم ہوں کہ بخشش کی بھی امید نہیں
گنہ نہیں تو ضرورت نہیں ہے توبہ کی
گناہ گاروں کو آتی ہے لذت توبہ
کروں نہ عیب تو کس کے چھپائے گا وہ عیب
مرے عیوب سے ہے اس کی شان ستاری
کروں گناہ تو رحمت کو جوش آتا ہے
مرے گناہ سے روشن ہے شمع غفاری

جناب ولایت علی وفاؔ حضرت صفیؔ کے دور اول کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے صاحبزادہ میر وزارت علی پاشاہ سعید طوبیت الملال نے تصویر، حالات و نمونۂ کلام مرحمت کیا۔ میں اس ہمدردی کا شکر گزار ہوں۔

وقار ـــــ الحاج محمد وقار الدین صدیقی

تاریخ پیدائش ۳ر جنوری ۱۹۲۵ء

نام محمد وقار الدین صدیقی تخلص وقار ۳ر جنوری ۱۹۲۵ء کو جناب محمد انور الدین صدیقی کے گھر محلہ جامباغ چادر گھاٹ حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ انھیں پیر طریقت مولانا عبدالقدیر صدیقی صاحب حسرت بحر العلوم کے حقیقی نواسے ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یم اے، ایل ایل بی اور بی ایڈ کی تعلیم حاصل کی اور گورنمنٹ سٹی کالج میں اپنے علم کے بحر بیکراں سے تشنگان علم وادب کی پیاس بجھاتے رہے اور بحیثیت لکچرر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

حضرت مولانا حسرت کے نواسے ہونیکے باعث شاعری کا ماحول بچپن ہی سے ملا علمی وادبی گھرانے سے تعلق ہونے کے باعث شعر فہمی اور شعر گوئی مسئلہ نہیں بنی۔ مولانا شیخن احمد شطاری صاحب کامل کے ماہانہ مشاعروں میں اپنے کلام بلاغت سے کو خوبصورت ترنم میں سناتے رہے۔ اور سامعین سے داد تحسین حاصل کرتے رہے حضرت صفی اورنگ آبادی کے مشورہ پر ان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

حضرت وقار الدین صدیقی وقار صاحب کے کلام میں فصاحت اور بلاغت بدرجہ اتم موجود ہے تصوف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے تغزل اور تصوف کو ایک ہی ہئیے سخن میں ملا کر پر کیف بنانا علامہ حسرت کے کلام کا خاصہ رہا ہے۔ جس کا نشہ دو آتشہ رہتا ہے حضرت وقار کے کلام میں یہی کیفیت ملتی ہے۔ آپ کا ترنم بے حد پسندیدہ رہا چونکہ ہتر نم شاعر ہیں کلام میں نغمگی فطری بات ہے آپ کے کلام کو غزل گو حضرات اور قوالوں نے ساز پر پیش کرتے ہوئے کلام کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو دوامی مقبولیت بخشی۔

حضرت صفیؔ نے آپ سے ایک بار فرمایا تھا کہ وہ مشاعروں میں نہ پڑھیں استفسار پر فرمایا کہ "تمہیں بہت جلد شہرت مل جائے گی اور جیسے ہی شہرت ملے گی تم شعر کہنا چھوڑ دوگے"۔ چنانچہ ویسا ہی ہوا۔ بقول ان کے "میرے نزدیک شعر گوئی ترک کرنے کی بڑی وجہ یہ کہ میں تدبر فی القرآن میں ہمہ تن مصروف ہوگیا"۔ تقریباً ۳۲ سال سے تفسیر کلام پاک سے دلوں کو منور فرما رہے ہیں اور ظلمت جہل کو مٹانے کی سعی پیہم میں مصروف ہیں۔ بحیثیتِ شاعر جتنی علم و ادب کی خدمت کی اس سے کہیں زیادہ مفسر قرآن کی حیثیت سے علم دین کی خدمت فرمائی جس سے دنیا اور عقبیٰ کو سنوارنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ایک عالم باعمل ایک متقی اور پرہیزگار مسلمان کی حیثیت سے آپ کو جو عزت اور شہرت ملی ہے اس کا اندازہ مشکل ہے۔ خدا نے انھیں ذی وقار رکھا ملت کا درد رکھنے والے مولانا وقار نے مسجد نانا باغ بشیر باغ میں بیس سال کے عرصہ میں ایک قرآن پاک کی تفسیر ختم کی۔ اور مسجد صلاح الدین مغلپورہ میں بھی ۲۰ سال میں ایک قرآن ختم کی مصلیوں کے اصرار پر دوسرا دور جاری ہے۔ ولی الدولہ مرحوم کے فرزند جناب منتظم جنگ بہادر کے گھر واقع مانصاحب ٹینک ایک سلسلہ تفسیر کلام پاک بہ اذن عام شروع ہوا اور ۲۲ واں پارہ زیر دوراں ہے۔ اور یہ تمام سلسلہ ہفتہ واری ہیں۔ جناب وقار الدین صدیقی وقار صاحب کا مجموعہ کلام "ادراک سے آگے" زیر ترتیب ہے۔ جس کی اشاعت علمی دنیا میں ایک اضافہ ہوگی۔ علم دین اور ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ حضرت وقار کا ترنم دل موہ لیتا ہے۔ جناب عزیز احمد خان وارثیؔ نے حضرت وقار کے عطا کردہ دھنوں پر ہی آپ کے دو گیتوں کو ریکارڈ کیا جو مقبول خاص و عام ہیں اور ٹی۔ وی اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ دو گیت یہ ہیں:

(۱) آیا بنا آیا ہریالا بنا آیا (۲) ہرے جھنڈے کے شہزادے۔

محترم المقام جناب وقار صدیقی صاحب نے میری گذارش پر حالات، نمونہ کلام اور تصویر مرحمت فرمائی۔ میں اس ہمدردی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

{نمونہ کلام}

تیرے ہی ہاتھ ہے اب دینِ محمدؐ کا وقار وقت مشکل ہے جو تو چاہے تو آساں ہو جائے

عرض ہے شاہِ عرب و عجم سے یاد کیا جب اپنے کرم سے
بھول نہ جائیں روزِ قیامت صلی اللہ علیہ وسلم

طے ہو گئی جب شاہد و مشہود کی منزل
اک جلوۂ بے سمت تھا شایانِ محمدؐ

ہے نفس کے عرفاں سے تو یا رب ترا عرفاں
تدبیر بتا دے مجھے عرفانِ محمدؐ

ایں جا مولائے کائناتی
آں جا محبوبِ کبریائی

احسان کردی زِ عشق وادی
دردے کہ دواست لادوائی

یہ ایک شکل ہے محشر میں منہ دکھانے کی
جبیں یہ خاک ہے حیدرؓ کے آستانے کی

وہ یقیناً یہیں کہیں ہوں گے
بدلی بدلی سی دل کی حالت ہے

اِدھر محوِ نظارہ میں اُدھر محوِ تماشہ وہ
وقار ایسا تماشہ دیدنی ہوگا، اگر ہوگا

وقار اپنے اپنے ارادے سے ہرگز
نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں

بڑے ہی شوق سے آتے ہیں سب بازارِ اُلفت میں
مگر تیار کم ہوتے ہیں سرمایہ لگانے کو

گریزاں گریزاں بظاہر جو تھے
خبر کیا تھی دل میں اُتر جائیں گے

کس جا کہ نہیں جلوہ تیرا، آفاق میں ہے کہ انفس میں ہے
دیتا ہو تو چشمِ بصیرت دے جلوے کا تقاضہ کون کرے

مازاغ کسی کی چشم نہیں اَو اَدنیٰ کسی کا بخت نہیں
اے نورِ نگاہِ دیدہ وراں بے تیرے نظارہ کون کرے

میں دیکھنے کو تو سن رہا تھا، ہر اک ادا میں الجھ گیا تھا
نہ جانے کیا کہہ رہے تھے مجھ سے وہ زلف رخ سے ہٹا ہٹا کر

مری چپ کی ملے گی داد اک دن دیکھ لینا تم
تمہارے منہ سے بولیں گی یہی خاموشیاں میری

معذرت سے جفا ہی اچھی تھی
کر دیا ہائے شرمسار مجھے

نگاہیں دو کی جس دم بے ارادہ چار ہوتی ہیں
وہ عالم آپ جانیں یا وقارِ مبتلا جانے

وہ عشق کی شوریدہ سری دیکھ رہا ہے
اپنا ہنر فتنۂ وحشی دیکھ رہا ہے

اک وجودِ محض ہی ہر شے سے ہے صورت نما
اور عدم کیا ہے ہمارے ذہن کی ایجاد ہے

دیوانہ بنا کر لے آئے تم اتنی دور مجھے ورنہ
میں ہوش میں اتنا کیا چلتا، اک گام نہیں دو گام نہیں

کچھ کر لے وقار وقت کم ہے
اب تک تو نہیں ہے کچھ کمائی

وقارِ با خدا ہوں بے خودی غفلت نہیں میری
میری گم گشتگی اِدراک سے آگے کی منزل ہے

ہُرمُز — شیخ محمد باہُرمز شمس الضحائی

شیخ محمد باہرمز نسلاً عرب حیدرآباد کے متوطن تھے۔ محلہ بارکس میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی اور جمعیت نظام محبوب میں صوبیداری کے عہدہ پر مامور تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بارکس میں موجود اپنے آبائی مکان کو فروخت کرکے کوٹلہ عالی جاہ میں صرف خاص کی ملگیات میں سے ایک ملگی میں فروکش ہوگئے۔ جناب ہرمز پہلے حضرت وجیہہ الدین شمس مرحوم کے شاگرد تھے۔ حضرت شمس کے انتقال کے بعد حضرت صفیؔ کے شاگرد ہوگئے۔ ہرمز صاحب کی اہلیہ کا انتقال ان کی زندگی میں ہوا۔ ان کا ایک لڑکا جن کا نام عبداللہ بن باھرمز تھا جن کے دو لڑکے شیخ عبدالقادر بن عبداللہ باھرمز اور شیخ علی بن عبداللہ باھرمز بارکس میں ہیں۔ ان کے ایک شاگرد نے تقریباً کلام چھپوانے کے بہانے حاصل کرلیا جو تا حال نہیں چھپ سکا۔

حضرت ہرمز، حیدرآباد کے مشہور و معروف خوشنویس جناب سلام صاحب کے والد محمد عبدالغفار رفیق کو اپنی زندگی میں اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات معلوم نہیں ہوسکی۔ حضرت ھرمز حیدرآباد کے مقبول شاعر تھے ان کا کلام محفلوں میں، گلی کوچوں میں بھی گایا جاتا تھا وہ بہت نادر الکلام تھے مادہ تاریخ نکالنے میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کے کلام کی فراہمی کے لیے میں جناب مبارک سالمین بن ربیعہ جابری، عبدالرحمٰن بن سعید لہرادی، جناب نورالدین خان صاحب اور جناب عبدالحفیظ صاحب کا ممنون ہوں۔ افسوس کہ تصویر دستیاب نہ ہوسکی

[نمونۂ کلام]

میں اگر پی کر زمیں پر پھینک دوں تھوڑی شراب
آسماں بھی غُل کرے یالیتنی کُنت تُراب

سرِ بام آ کر خلقت کا تماشہ ہوئی جاتا ہے
برآمدہ جہاں ہوتے ہیں میلہ ہوئی جاتا ہے

جاگنے سے ہوئے بیزار محلے والے
نالہ ہائے دلِ بیمار نے سونے نہ دیا

قید خانے میں ہوئی نیند اسیروں کی اُچاٹ
میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

اے قیس نہ سُن میری وحشت کا تو افسانہ
ہو جائے گا دیوانے تُو اور بھی دیوانہ

یہ خانۂ دلِ میرا مُدت سے تھا ویرانہ
آمادہ کیا تو نے اے الفتِ جانانہ

دِل دے کے حسینوں کو ناداں بنا آخر
ہرمز کو سمجھتے تھے ہم عاقل و فرزانہ

آسماں کے نیچے اے ہرمز نہ رہنا چاہیئے
دیکھئے گر جائے گا گنبد پُرانا ہو گیا

محبت حسینوں کی ہے یا بلا ہے
جسے دیکھئے رنج میں مبتلا ہے

مُجرم زلف کو ملتی ہے سزا شام کے بعد
اک نہ اک سر پہ اترتی ہے بلا شام کے بعد

آپ کے ہجر میں ہرمز کا بہت دِل ہے اداس
بھولے بھٹکے کبھی آ جاؤ ذرا شام کے بعد

محبت نے مجنوں بنایا رے لوگو
بیاباں بیاباں پھرایا رے لوگو

نہیں روئے یعقوب آدم بھی اِتنا
مقدر نے جتنا رُلایا رے لوگو

لپٹا ہے عشق جن کو ان کو مٹا کے چھوڑا
تھے سربلند جتنے ان کو جھکا کے چھوڑا

خود آسماں بھی رویا حالت یہ مری ہرمز
اولاد سے وطن سے آخر چھڑا کے چھوڑا

صنم کے کوچے میں جس دن مقام کر لیں گے
خُدا کے گھر کو وہیں سے سلام کر لیں گے

جو میکدے میں سناؤں نمازِ عشق کا راز
تو رند سب مجھے اپنا امام کر لیں گے

کسی صنم کی محبت میں مر کے اے ہرمز
قسم خُدا کی خدائی میں نام کر لیں گے

نہاں ہو کر بھی چلمن سے عیاں ہے
ابھی ہلکا سا پردہ درمیاں ہے

نظر آتی نہیں ہے گرد اس کی
رواں یوں زندگی کا کارواں ہے

جوانی اس نے کی لاکھوں کی غارت
مگر پیرِ فلک اب تک جواں ہے

کرو عشقِ بتاں اب ترک ہرمز
کہ اس میں جان و ایماں کا زیاں ہے

انا للہ حبیب لیٰسین نے
قید ہستی سے پائی آزادی

دیدۂ پرنم اور دل بے تاب
سب ہیں اہل و عیال فریادی

چھوڑ کر ہم کو چل بسے ہادی
حیف صد حیف یاسؔ بغدادی

۱۳۸۲ھ

(نمونہ کلام)

یہ حسن کم سنی میں کسی گلعذار کا
اعلان ہے بہار سے پہلے بہار کا

نوجوانی تری خدا کی پناہ
مار ڈالے گی یہ بہار مجھے

کہاں ہم اور کہاں محفل کسی کی اے دل وحشی
ہم اتنا پاؤں پھیلاتے ہیں جتنی اپنی چادر ہے

رحم کریں تری بھرپور جوانی کے نثار
کچھ اگر اور کہوں بے ادبی ہوتی ہے

یہ بیچ والے ابھی جل کے خاک ہو جائیں
لگے جو عشق کی دونوں طرف برابر آگ

ان کو اپنے دست نازک رنگنے سے کام ہے
رنگ ہو مہندی کا یا میرا لہو ہو کچھ بھی ہو

اتنی پی بھی تو غم غلط نہ ہوا
وہ بھی ایسی جو پی نہیں جاتی

ہے بہت ممکن ہتھیلی میں تمہیں جنت دکھائے
تم ہو بھولے دشمن اپنے وقت کا شداد ہے

اب گل رخوں سے ملنے کے ارماں نہیں رہے
جو دل میں چبھ رہے تھے وہ کانٹے نکل گئے

وہاں نامہ بر ان کے لیے بھی تیر ہو یارب
جہاں ان کی نظر میرے لیے تلوار ہو جائے

کیا چاہتا ہوں کیا ہے مرے دل میں کچھ نہ پوچھ
اک بار مجھ کو دے کے ذرا اختیار دیکھ

خدائی کیوں نہ کرتے کر و فر سے
یہ بت نکلے ہیں یارب تیرے گھر سے

یقیں کیسا نہ تھا مجھ کو گماں تک
کہ آپ اس طرح آئیں گے یہاں تک

ایک ایسی بھی تمنا ہے کسی دن یارب
ہاتھ ہو اس بت مغرور کا دامن میرا

جو تھک گیا ہوں تو جھنجھلا نہ اے دل وحشی
ترے سوا مرا ساتھی کوئی سفر میں نہیں

قاصد کو شاد دیکھ کے دل باغ باغ ہے
آئی ہے ان کے آنے سے پہلے بہار آج

حشر کے دن حشر جن کا ہونے والا ہے برا
یا الٰہی ایسے لوگوں میں نہ کر شامل مجھے

ہم نشیں ہنس کر ہنسانے کی مجھے کوشش نہ کر
سیکڑوں غم دل میں رکھ کر مسکراؤں کس طرح

نام روشن ہوا سچائی کا
کس قدر اہمیت ہے باطل کی

یاسؔ ——— سیّد حبیب لیٰسین بغدادی

تاریخ پیدائش: ۱۹۰۸ء تاریخ وفات ۱۳۸۲ھ

حضرت سیّد حبیب لیٰسین یاسؔ ولد حضرت سید طٰہٰ مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ حضور غوث اعظمؒ کے خانوادے سے ہیں۔ بغداد شریف میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں اپنے والد کے ہمراہ حیدرآباد منتقل ہوئے اور یہیں آباد ہوگئے۔ ضروری درسی تعلیم کے بعد موٹر میکانک کا پیشہ اختیار کیا۔ سکونت معظم جاہی مارکٹ کے پاس اختیار کی اور وہیں بغدادی بلڈنگ کے نام سے مکان تعمیر کرکے رہنے لگے۔ اسی کے احاطے میں ان کا موٹر میکانک کا کارخانہ تھا۔ ان کے کارخانہ ہی کے احاطہ میں پہلے پہل روزنامہ سیاست کا دفتر قائم تھا۔ عابد علیخاں صاحب ایڈیٹر روزنامہ سیاست نے ان کی جائیداد [بغدادی بلڈنگ] خرید لی اور اس میں دفاتر سیاست اور انتخاب پریس قائم کیا۔ ان کے ایک فرزند جن کا نام حبیب سید صادق مشہور حمیدی کنفکشنرز کے مالک جناب محمد حسین کے داماد تھے جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ دو پوترے ہیں۔ بڑے پوترے حبیب سید احمد عرف زاہد میاں پارٹنر کنگ آٹو موبائیل کنگ کوٹھی ہیں۔ دوسرے حبیب سید عبدالوہاب مقیم ریاض ہیں۔ حضرت یاسؔ بڑے دوست نواز اور منکسر آدمی تھے ان کا کارخانہ ان کی زندگی میں ارکان بزم تلامذہ کی بیٹھک کا مرکز تھا۔

ذوقِ شاعری بچپن سے تھا۔ مشاعروں میں حضرت صفیؔ کو سننے کے بعد ان کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ ان کا شمار حضرت صفیؔ کے دورِ وسطی کے تلامذہ میں ہوتا ہے۔ ۱۳۸۲ھ میں انتقال ہوا۔ حضرت غلام علی ہادی جانشین حضرت صفیؔ نے ان کی وفات پر قطعہ تاریخ رحلت کہا ہے۔

یقینؔ ـــــ ابو الخلیل سید غوث

تاریخ وفات ۱۹۷۲ء

حضرت سید غوث یقینؔ مرحوم حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے دورِ اول کے تلامذہ میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ حضرت صفیؔ کے استاد بھائی بھی ہیں اور تلمیذ بھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت صفیؔ جب حضرت عبد الولی فروغؔ کے شاگرد تھے تو یہ بھی ان کے شاگرد تھے۔ حضرت فروغؔ کے انتقال کے بعد جب حضرت صفیؔ، حضرت کیفیؔ کے شاگرد ہوئے تو حضرت یقینؔ نے بھی خود کو شاگردی میں قبول کرنے کی درخواست کی لیکن حضرت کیفیؔ نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ حضرت صفیؔ سے مشورۂ سخن کیا کریں۔ چنانچہ وہ ان سے رجوع ہو گئے اور حضرت صفیؔ کے انتقال تک ان سے وابستہ رہے۔

حضرت یقینؔ کا تعلق ایک جاگیر دار گھرانے سے تھا۔ اس دور کی روایات کے مطابق باقاعدہ کوئی نصابی تعلیم نہیں پائی۔ صرف السنہ شرقیہ کی حد تک فارغ التحصیل تھے۔ چونکہ جاگیر دار اور خوشحال تھے اس لیے کہیں ملازمت نہیں کی۔ ان کے اجداد کا وطن بیجا پور تھا اور یہ بھی وہیں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں ؎

ہوتی گنبد کلاں کا خادم ہوں یقینؔ ؎ دیس میرا خاص بیجاپور ہے

جوان العمری میں اپنے والد سید خلیل اللہ مرحوم کے ساتھ حیدرآباد منتقل ہوئے بعد اندرون کمان حسینی علم حیدرآباد ایک مسجد سے متصل عالیشان مکان میں بود و باش اختیار کی۔ جہاں ان کے پاکستان منتقل ہونے تک ہر ماہ باقاعدہ طرحی مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ اکثر مشاعروں میں حضرت صفیؔ نے بھی بہ نفسِ نفیس شرکت کی ہے۔ چونکہ ان کے صاحبزادے پاکستان منتقل ہو چکے تھے اس لیے یہ بھی وہیں منتقل

یاسؔ کے حق میں بُرا کہہ نہ کبھی اے کافر
جو ترے منہ سے نکلتی ہے وہی ہوتی ہے

جب کسی کو دیکھ لیتا ہوں کہیں مصروفِ عیش
نام لے لے کر ترا بے ساختہ روتا ہوں میں

ہر آئے دن جہان میں جو انقلاب ہے
یہ قہر ہے غضب ہے خُدا کا عتاب ہے

غیروں پہ مہر و لطف تو مجھ پر عتاب ہے
شکوہ کسی سے کیا مری قسمت خراب ہے

یہ شئے اگر بُری ہے تو کہیئے جنابِ شیخ
پھر کیوں کلام پاک میں ذکرِ شراب ہے

واعظ یہ کیا حلال وہاں ہے یہاں حرام
ہر رنگ میں شراب تو آخر شراب ہے

اے یاسؔ جو بدل نہ سکے ان کی زندگی
ایسا بھی انقلاب کوئی انقلاب ہے

میں جناب حبیب سید احمد عرف زاہد میاں نبیرہ یاسؔ صاحب کا مشکور ہوں جنھوں نے تصویر مرحمت فرمائی۔

△▽

حضرت صفیؔ کے بارے میں

وہ غزل کے نہ صرف بلند مرتبہ خوش گو شاعر تھے بلکہ فن شاعری میں امام الفن بھی تھے وہ شمالی ہند میں پیدا نہیں ہوئے تھے اس لیے زبان دان نہ تھے جیسا کہ قاعدہ کلیہ بنا دیا گیا ہے لیکن دکن میں ایسے باکمال تنقید نگار پیدا ہوئے جنھوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ زبان دانی کسی طبقہ یا مقام تک محدود نہیں ہے۔ صفیؔ کو اپنی زبان دانی پر بھروسہ تھا:

اہلِ زبان نہیں ہوں زبان دان ہوں اے صفیؔ
رُتبہ مرا زیادہ ہے اور اعتبار کم

جناب محمد عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے شادؔ عظیم آبادی کے بیسوں شعروں پر اعتراض کیئے ہیں اس کے علاوہ کئی متفرق کا غذات ایسے بھی ملتے ہیں جن میں صفیؔ صاحب نے فانیؔ بدایونی، حفیظؔ جالندھری اور جلیلؔ مانک پوری کے اشعار پر اعتراض کیئے ہیں۔

محمد نورالدین خاں

"تنقیدیں"۔ [سوانح عمری، صفیؔ اورنگ آبادی]

△▽

میں ہوں خراب؟ میری نظر بھی خراب ہے
حاذبِ نگاہ حلقۂ چشمِ پُر آب ہے
اُدھر آہٹ ہوئی دھڑکا اِدھر دل
وہ یوں بھی میرے ساتھ رہا ہے کبھی کبھی
پھر آج تاک میں ہے کسی کی نگاہِ ناز
وہ کیسے یاد رہا ہیں یہ بھول بیٹھا ہوں
مری آنکھیں بھر آ کھولیں نہ میرے دردِ پنہاں کا
کہیں فریاد میں بھی شائبہ ہوتا ہے ارماں کا
سنبھل اے شدتِ غم آنکھ میں آنسو اُمڈ آئے
کہاں جاتے ہیں آخر دفن ہو کر خاک کے پُتلے

اچھے میں آپ دیکھئے اچھی نگاہ سے
یا نور پاش اب تہہ آب آفتاب ہے
نہ جانے کون آیا ہے کہاں سے
سایہ جو تھا قریب رہا دُور ہو گیا
پھر آج تازہ زخم کا انگور ہو گیا
یہ بھولنا مجھے یاد آ گیا تو کیا ہوگا
ہواؤں سے بھی اندازہ لگا لیتے ہیں طوفاں کا
کہاں کا حاشیہ تھا یار لوگوں نے کہاں ٹانکا
کہیں طوفان ٹکرا کر نکل جائے نہ ساحل سے
مثل مشہور ہے مٹی کو مٹی کھا نہیں سکتی

ملتے ہی آپ نام مرا پوچھنے لگے
آؤ نئے طریق سے جانچیں رقیب کو

دُنیا کی رسم بات کے پہلے سلام ہے
میری نگاہ سے نہ تمہاری نگاہ سے

منتخب اشعارِ صفی

رنگ و بو کے ہی ہوتے ہیں نیرنگ
ورنہ کیا زعفران گھاس ہیں

غنیمت جان لو دردِ جگر کو
یہ تھوڑا بھی بہت ہے عمر بھر کو

خیال بھی دلِ بیمار کا ذرا نہ ہوا!
خوش آمدید کہاں تھے بہت زمانہ ہوا!

آنکھیں نکال ڈالیئے مشتاقِ دید کی!
لیکن نہ دیکھئے اُسے آنکھیں نکال کے

ہو گئے اور وہیں ۱۹۷۲ء میں انتقال ہوا۔ زندگی میں بڑے زندہ دل اور یار باش واقع ہوئے تھے۔ پاکستان منتقل ہونے تک برسوں مسجد چوک یا گھڑیال چوک کے چمن میں بیشتر تلامذۂ صفیؔ علیم، ہمسرؔ، ناوکؔ، تبسمؔ، راقم الحروف بہادر علی جوہرؔ اور حضرت غلام علی حاذقؔ کے ساتھ بیٹھک رہا کرتی تھی۔

حضرت یقینؔ بڑے زود گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ حضرت صفیؔ کی طرح ایک ہی نشست میں بیسیوں شعر کہہ ڈالتے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام یہاں حیدرآباد میں تو شائع نہیں ہوا۔ معلوم نہیں پاکستان میں ان کے صاحبزادوں نے شائع کرایا یا نہیں؟ البتہ انھوں نے ایک قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے وہ یہ کہ استاد حضرت صفیؔ کا ایک ضخیم دیوان "فردوسِ صفیؔ" کے نام سے پاکستان میں طبع کروایا۔ اور اپنے استاد کا نام پاکستان میں بھی روشن کیا۔ فردوسِ صفیؔ کا سالِ اشاعت ۱۹۶۸ء ہے۔

فردوس صفیؔ کی کچھ جلدیں انھوں نے یہاں حیدرآباد میں بھی مختلف لوگوں کو بھیجی ہیں۔ جو غالباً ان کے پاس محفوظ ہوں گی۔

(نمونہ کلام)

کسی کا روئے روشن زلف مشکیں میں نمایاں تھا
ہمارا حسنِ ظن تھا یا چراغِ زیرِ داماں تھا

شوخی پر شرارت ہے تبسم ہے حیا پر
ایک ایک ادا لوٹ ہے ایک ایک ادا پر

دم آخر ترے دیدار کو آنکھیں ترستی ہیں
ذرا سی ٹمٹماتی روشنی باقی ہے تاروں میں

ہے دُور بھی تو اس کو ستانے سے کام ہے
یعنی ہمارے خط میں عدو کو سلام ہے

بجور خاک یاد رکھے دن وصال کا
ہوتا ہے جس کے ہجر سے آغاز سال کا

آوارگانِ شوق کا عالم نہ پوچھیے!!
منزل جنوب میں ہے ارادہ شمال کا

حسن ادب سے تناسب اعضا کچھ اور ہے
پڑتا نہیں زمین پہ سایہ جمال کا

محبت ہے مگر اک دوسرے سے بدگماں ہم ہیں
جہاں ہم ہیں وہاں وہ ہیں جہاں وہ ہیں وہاں ہم ہیں

نہ کچھ سننا گوارا ہے نہ کچھ کہنے کا یارا ہے
فقط ان کی بھری محفل میں گویا بے زباں ہم ہیں

وہ آج بزم تخیل میں مجھ سے ملتے ہیں
اُٹھا بھی ہے تو کہاں پردۂ حجاب اُٹھا

کلام سے اس بات کا اندازہ مشکل نہیں۔

حکایت بھی شکایت ہے جنون نقشہ ساماں کی
کہوں کیا فصلِ گل اک عید ہے دستِ گریباں کی
تواضع تو نہیں بد نظر خار بیاباں کی
گریباں چاک ہو کر کیوں جگہ لیتا ہے داماں کی

تری زلفِ پریشاں دیکھ کر دل کیوں پریشاں ہے
مدد کوئی پریشاں کر نہیں سکتا پریشاں کی!
میں انکے پاس ہوتا ہوں تو ایسا وقت آتا ہے
جسے معراج کہتے ہیں شکایت ہائے پنہاں کی
جو بھی یکتا کی حالت اس کی میں تصویر کیا کھینچوں
تری آمد نے صورت ہی بدل دی پاس و حرماں کی

جو خودی کو مٹا نہیں سکتے
وہ خدا کو بھی پا نہیں سکتے
کہہ تو سکتے ہیں عشق کی روداد
چوٹ دل کی بتا نہیں سکتے
غم کدہ ہو گیا ہے دل یکتا
اس میں شادی رچا نہیں سکتے

مجھ سے خالق ہے جدا اور نہ محبوب جدا
ایک شہ رگ سے قریب ایک مرے دل کے قریب
ہم جہاں بھی ہوں لگا ہوں میں ہے نقشہ اسکا
دور محفل سے تری پھر تری محفل کے قریب

اجل نے کیا مجھ کو سب سے جدا
وہ آئیں تو کیا میں تو جاتا رہا
تماشا ہے سوزِ غمِ عشق بھی
بڑھی آگ جتنا بجھاتا رہا
قفس میں بسر اتنی مدت ہوئی
خیالِ نشیمن بھی جاتا رہا
حوادث بھی قائم نہیں رہ سکے
زمانہ بھی پہلو بچاتا رہا

یکتاؔ ـــــ محمّد عبدالوحید مجاہد

ولادت: سنہ ۱۳۱۰ ف

جناب محمّد عبدالوحید مجاہد یکتاؔ ولد غلام محمّد صاحب مجاہدؔ ۲۹ آبان ۱۳۱۰ ف کو محلہ محبوب شاہی نزد مسجد برق للدولہ حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے مولوی و منشی فاضل تک تعلیم حاصل کی۔ محکمہ اکاونٹنٹ جنرل حکومت آندھرا پردیش میں ملازمت کی۔

آج شاعری کے معیار کو پاکستان کو ہندوستان پر سبقت دی جارہی ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں پاکستان کا وجود ہی نہیں تھا اسی لیے یہ کہنا واجبی نہیں کہ شعروادب میں ہندوستان پیچھے ہے تخیل کی حد پرواز نہیں اور وہ حدود میں مقید بھی نہیں۔ جناب یکتاؔ اگر پاکستان میں مشہور شاعر ہیں تو ان کا تخیل شاعری سرزمین ہند میں بویا گیا۔ اور یہیں وہ پودا تناور درخت بنا۔ حضرت صفیؔ نے اس کی آبیاری کی آج وہ ثمر آور درخت اپنے پڑوسی ملک کو مستفید کررہا ہے۔ ہندستان میں انھوں نے کئی مشاعروں میں شرکت کی غزل کے علاوہ نظم بھی لکھتے ہیں اردو کی طرح فارسی زبان پر بھی دست رس حاصل ہے۔ پہلے ضیاؔ تخلص کرتے تھے لیکن حضرت صفیؔ کی ایماء پر یکتاؔ ہوئے اور یکتا ہیں۔ حضرت صفیؔ کے کہنہ مشق تلامذہ میں ہیں طبیعت بھی استاد کی ہی پائی ہے کلام کی حفاظت نہیں کرسکے جس کے باعث بہت کچھ تلف ہوچکا ہے رسالہ "نگار" "مدینہ"، "ساقی" وغیرہ میں ان کا کلام شائع ہوچکا ہے۔ اب پاکستان میں مقیم ہیں۔ تصویر نہ ملنے کا افسوس ہے۔ ان کے کلام کو پڑھنے سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں وہ تمام لوازمات موجود ہیں جو ایک سامع اور قاری کو اپنی جانب متوجہ کرسکتے ہیں اقتباسات

غرقابی کے وقت اندازاً ان کی عمر (۵۰) سال کے لگ بھگ تھی حیدرآباد کے ایک بزرگ حضرت آغا داؤدؒ کے سلسلے کے عقیدت مندوں میں تھے۔ طبیعت میں بے حد ملنساری تھی اور جذبۂ ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ میٹرک کامیاب تھے۔ لیکن طبیعت کے لاابالی پن کے باعث کہیں باقاعدہ ملازمت نہیں کر سکے۔ البتہ صحافت سے کافی لگاؤ تھا اس لیے غرقابی سے چند سال پہلے روزنامہ رہنمائے دکن سے وابستہ ہو گئے تھے اور سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کارگزار رہے۔ اُس زمانے میں رہنمائے دکن میں معمول اور عنوانات پر پسندیدہ اشعار چھاپنے کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اور یہ اس کے بھی نگران تھے۔

غضب کے سخن فہم تھے اور اس سخن فہمی نے انھیں شعر کہنے پر بھی اکسایا چنانچہ کبھی کبھی چیدہ چیدہ شعر موزوں کر لیتے تھے۔ حضرت صفی کے دورِ وسطیٰ کے تلامذہ میں سے اکثر سے یہ بہت قریب تھے اور انہی کے ساتھ اکثر حضرت صفی کے پاس حاضری دیا کرتے تھے۔ حضرت صفی ان سے بہت بے تکلف تھے۔ اور ایک خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ دو چار دن غیر حاضر رہتے تو دیگر تلامذہ کے ذریعہ بلا بھیجتے۔ ان کی اسی شفقت نے ان کے غیر مرتب جذبۂ شعر گوئی کو اُبھارا اور وہ باقاعدہ شعر کہنے لگے، اور مشاعروں میں بھی کلام سُنانے لگے۔

(نمونہ کلام)

نہ جانے کس گھڑی ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں
بہت زوروں پر اب عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

دیکھا ہے کہیں پہلے بھی یہ یاد ہے لیکن
دیکھا ہے کہاں آپ کو یہ یاد نہیں ہے

تخلیقِ کائنات سے پہلے ظہور تھا
جب کچھ نہ تھا جہاں میں حضرتؐ کا نور تھا

پہاڑ اے کوہ کن تو نے اگر کاٹا تو کیا کاٹا
ہمیں تو دیکھ ہم نے عمر کاٹی ہے جُدائی میں

حشر تک بھی جو نکل جائے غنیمت سمجھوں
یہ ترے وصل کا ارمان ہے مری جاں تو نہیں

بس یہ پانچ شعر میرے حافظے میں محفوظ تھے جو سپردِ تحریر کر دیے گئے ما بقی کلام کا خود ان کے متعلقین کو علم نہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ وہ پانی میں بہہ گئے اور ان کا کلام خشکی پر بہہ گیا۔ واضح ہو کہ پہلا شعر مرحوم نے اپنے انتقال سے چند دن قبل کہا اور جناب شبلی یزدانی فاتحِ ایڈیٹر کو سنایا تھا۔

یوسفؔ ــــــ سیّد یوسف الدین

تاریخ وفات: ۱۹۷؟ء

حضرت غالبؔ دہلوی نے تو شاعری کی تھی کہ ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

لیکن جناب یوسفؔ مرحوم نے تو اس پر عمل کر دکھایا۔ ہوا یہ کہ ۱۹۷؟ء میں ایک دن جگر مراد آبادی کا دیوان "شعلۂ طور" لیے ہوئے چادر گھاٹ کے قریب موسیٰ ندی میں مچھلی کے شکار کے لیے اترے اور پانی میں ڈور ڈال کر ایک درخت کے نیچے شعلۂ طور کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔ یہ دن بارش کے تھے اور خاصی بارش ہونے کے باعث عثمان ساگر میں پانی سطحِ آب سے اونچا ہو گیا تھا لہٰذا بند کے چند دروازے کھول کر پانی موسیٰ ندی میں چھوڑا گیا۔ دو گھنٹے کے اندر اندر ندی میں اتنا پانی بھر گیا کہ جہاں یوسف مرحوم بیٹھے ہوئے تھے ان کے سر سے اونچا ہو گیا اور وہ صورتِ حال کو سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ انھیں اپنے تیز ریلے میں بہا لے گیا۔ بہتے وقت یوسف مرحوم کے لبوں پر کیا تھا وہ تو اللہ کو معلوم البتہ ایک ہاتھ اٹھا ہوا تھا اور اس میں شعلۂ طور دبا ہوا تھا۔ خدا کی شان کہ شعلہ کہاں اٹھا اور کہاں آکر بجھا۔ ؟! معلوم نہیں پانی انھیں بہا کر کہاں لے گیا اور کس جگہ انھیں آبی ابدی خواب گاہ نصیب ہوئی؟ جس طرح اس واقعے کی تاریخ ان کے متعلقین کو یاد نہیں اسی طرح ان کی تاریخِ پیدائش بھی کسی کو نہیں معلوم۔ بہ الفاظ دیگر آنکھ کھلنے سے آنکھ بند ہونے تک بے نشانی ان کا مقدر ہو کر رہ گئی۔

طباعت کے کاموں میں تجربہ تھا۔ اپنی صلاحیتوں کی بدولت مطبع مظفری اور اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد میں ذمہ دارانہ خدمات پر فائز رہے۔ جناب قاضی عبدالغفار کی ادارت میں شائع ہونے والے روزنامہ "پیام" سے بھی وابستہ رہے بقبولیت نے محکمہ سیاسیات میں پہنچا دیا جہاں سے ان کی زندگی کا دورِ عروج شروع ہوا جو دس سال پر محیط ہے۔

جناب یوسفی متوسط قامت، سیاہ فام، تندرست جسم رکھتے تھے۔ ان کی ذہانت، ذکاوت اور زیرکی کے سب معترف تھے۔ نفاست پسند تھے۔ وہ دیگر سربرآوردہ شخصیتوں کے علاوہ نواب علی یاور جنگ بہادر کے چہیتے اور بااعتماد کارگزاروں میں سے تھے۔ ۱۷ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو سقوط حیدرآباد کے بعد مملکت آصفیہ کی بساط اُلٹ گئی حسب الحکم مرحوم یوسفی نے اسی کے ساتھ اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ اپنی خدمات سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے ہومیوپیتھک طریقۂ علاج کا مطالعہ کیا اور امتحان دے کر ڈاکٹر بن گئے "جرمنی دواخانہ" کے نام سے مطب کھول کر مریضوں کو مفت دوائیں تقسیم کرتے رہے۔

ڈاکٹر غلام معین الدین یوسفی نے ۱۳۷۱ھ میں "دیوان وطن" مرتب کر کے دادِ تحسین حاصل کی جس پر بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے بھی تبصرہ فرمایا تھا۔ آخری برسوں میں صعوبتیں جھیلنی پڑیں اور وہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔ ؎

دیا ہے عیش جسے پھر اُسے ملال نہ دے
عروج دے کے کسی کو خدا زوال نہ دے

اس دورِ ابتلا میں ولی داد خاں کی دیوڑھی کے جنوبی حصہ میں کرایہ سے مقیم رہے۔ اپنے زائچہ کے مطالعہ سے مرنے کے وقت کی پیش گوئی کر چکے تھے چنانچہ اسی مدت میں بروز جمعہ یکم مئی ۱۹۵۹ء آدھی رات کو قلب پر حملہ ہوا اور وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ درگاہ حضرت وطن چشتی چمن (راز دار خاں پیٹ) کے چبوترے پر جانب جنوب اپنی ماں کے پہلو میں ابدی نیند سو گئے۔ مرحوم کی اہلیہ بقیدِ حیات ہیں اور عزمی صاحب کے ساتھ مہدی پٹنم میں رہتی ہیں۔

یوسفی ـــــ ڈاکٹر غلام معین الدین

تاریخ پیدائش ۲۵ر مارچ ۱۹۰۲ء وفات: یکم مئی ۱۹۵۹ء

ڈاکٹر غلام معین الدین یوسفی نے ۲۵ر مارچ ۱۹۰۲ء کو حیدر آباد دکن کے متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی ان کے والد حاجی چشتی حسین تجارت پیشہ صوفی منش تھے جو گدوال سے دکن تشریف لائے۔ جناب یوسفی کی عمر جب نو سال تھی تو والد کا انتقال ہوگیا۔ تعلیم و تربیت کا بوجھ بیوہ ماں کے کاندھوں پر آپڑا۔ ابتدائی تعلیم مقامی مدرسہ میں ہوئی پھر دارالعلوم میں زیرِ تعلیم رہے۔ کشاکشِ روزگار کے باعث سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے سے قاصر رہے۔ کچھ عرصہ بعد منشی فاضل کے لیے علامہ سید عبدالباقی شطاری ؒ کے شرفِ تلمذ سے فیض یاب ہوئے۔ پتہ نہیں کب سے شعر گوئی کی ابتداء ہوئی طبیعت موزوں پائی تھی اور خوش آواز بھی تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ ممکن ہے مولانا عبدالباقی ؒ حضرت صفی مرحوم سے دوستی کی بناء پر یوسفی مرحوم کو اصلاح کلام کے لیے اِن سے رجوع کیا ہو۔

جناب یوسفی نے ۱۹۲۷ء میں شادی کی دوسرے سال اللہ نے اولاد نرینہ سے نوازا جس کا نام یوسف الدین رکھا لیکن والدین اور دادی ماں کی یہ خوشی چند مہینے بعد ان سے چھین لی گئی اور بھی اولادیں ہوئیں لیکن مشیت الٰہی نے انھیں زندہ نہ رکھا اور پھر ان کا چراغِ آرزو روشن نہ ہوسکا اور بہت برسوں بعد مجاہدِ آزادی سید مصطفےٰ قادری خطیب ایڈیٹر روزنامہ "رہنمائے دکن" اخبار "ہمدم" "وطن نیوز ایجنسی" کی صاحبزادی کی پرورش اپنے ذمہ لی اور آخر تک نبھاتے رہے۔ اپنا وقت اورادو وظائف، چلہ کشی، علم نجوم اور کتب بینی میں گزارتے رہے۔ بحیثیت استاد مدرسہ منصبداراں سے وابستہ رہے پھر عثمانیہ ٹریننگ کالج بلدہ میں تختۂ نویس تھے

پاسِ انفاس کا کرنا ہے اگر شغل تجھے
جن ہستیوں سے تھا ہیں اصلاح کا خیال
کس کو سنائیں قوم کی بربادیوں کا حال

تو جس نظر سے چاہے ہیں آزما کے دیکھ
گر دیکھنا ہے حالِ دلِ بے قرار کا

یوسفی ہِل کسی پاکیزہ نفس سے جا کر
خود ان کو اپنے حال کی کوئی خبر نہیں
افسوس ہے کہ آج جناب عمر نہیں

لیکن یہ آرزو ہے کہ اپنا بنا کے دیکھ
تو بھی کسی سے مری طرح دل لگا کے دیکھ

حضرت صفی کے بارے میں :-

صفی کے جاننے والے اب تو انگلیوں پر گنے جاتے ہیں لیکن وہ دن دور نہیں کہ ہر اردو بولنے والے کو جاننا ہی پڑے گا کہ صفی کون تھا۔ جاننا ہی پڑے گا کہ بھوک، افلاس و گمنامی کے طوفانوں سے ٹکراتا ہوا نام و شہرت کے رفعتوں کو روندتے ہوئے خدمت و ایثار کی دھن میں مگن وہ کون متوالا تھا جس نے سرزمین دکن کو رشک شیراز بنا دیا۔ زمانہ دیکھے گا کہ جتنے جی جسے پوچھا نہ گیا وہ پوجا جائے گا۔

ماہنامہ سب رس صفی نمبر ۱۹۵۶ء "آبِ حیات کا آخری شاعر"
سید عبد الحفیظ

جناب صفی اورنگ آبادی میرے قدیم دوست اور عنایت فرما تھے ان کا کلام مقبول عام ہوا ہندوستان میں ایسی صاف ستھری زبان لکھنے والوں میں یہ ایک ہی شاعر تھے۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ سید احمد حسین امجد (سب رس صفی نمبر)

نمونہ کلام

اسی کے عشق میں برباد کرتا ہوں دل و جاں کو
کبھی پوچھا نہیں جس نے مرے حال پریشاں کو

جواب آخر فرشتوں کو وہاں دینا ضروری ہے
ہمارے ساتھ رکھنا قبر میں تصویر جاناں کو

مصیبت جس نے دی ہے پھر وہی آرام بھی دے گا
خدا دے استقامت یوسفی کے دین و ایماں کو

تری مخمور آنکھوں نے کیا ہو جس کو مستانہ
نہ ساغر کی اسے پروا نہ اس کو شوق میخانہ

طلب اعمال نامے جس گھڑی عشاق کے ہونگے
پہنچ جائیں گے لے کر ہاتھ میں تصویر جانانہ

بلائیں ساقی کوثر تو میں اس شان سے پہنچوں
صراحی در بغل ساغر بکف در دست پیمانہ

گنہ کرتا ہوں اتنا جان کر اے داور محشر
نہ بھولے گی مجھے اس دن تری شان کریمانہ

سُنا ہے اگلے زمانہ میں باوفا تھے حسین
مگر گیا وہ زمانہ جسے زمانہ ہوا

شفیع روز جزا، حامی گنہ گاراں
سوا حضور کے کوئی، نہ ہے نہ تھا نہ ہوا

ہر ایک دوست عدو بن گیا محبت میں
تمہارے عشق میں اس یوسفی پہ کیا نہ ہوا

یوں تو ہوئے ہیں لاکھوں ہی مبعوث انبیا
تجھ سا کوئی جہان میں خیر البشر نہیں

کم نصیبوں کے مقدر میں کہاں وصل حبیب
لکھ چکا روز ازل کاتب تقدیر نہیں"

نزع کے وقت یار ہونا تھا
اس خزاں میں بہار ہونا تھا

شرع والے نہ کرتے حد جاری
بے پئے مئے خمار ہونا تھا

روز کی نوکری سے تنگ ہے دل
ہفتہ میں چار بار ہونا تھا

زندگی چین سے بسر کرنے
یافت کو اک ہزار ہونا تھا

اس زمانے میں یوسفی کے لیے
حضرت افتخار ہونا تھا

ایک مدت سے تو لذت کش تنہائی ہوں
چین ہو باغ میں کہا مجھ کو قفس سے جا کر

ایک سے راز محبت کو ذرا کہہ دیجیے
یوسفی آپ کو سُنا ہے جو دس سے جا کر

چھوٹ جائیں تو بنائیں دل صیاد کو گھر
ورنہ گھبرائیں گے ہم قید قفس سے جا کر

چشم صیاد سے نکلیں تو رہائی سمجھیں
ورنہ رہنا ہے قفس ہی میں قفس سے جا کر

میں اگر مل نہ سکا قافلہ والوں سے تو کیا
میری آواز ملی بانگ جرس سے جا کر

صحت نامہ

صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح	صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح
۱	۱۱	ایضائے	ایضاح	۹۷	۱۲	جوزیرترتیب ہے	×
۳	۲	دیولڈھی	دیوگڈھی	۱۱۹	۱۴	قرآن	قرآن کا
۶	۳	خواص	غواص	۱۲۱	۲	مہجر	ہجر
۱۰	۱۵	رشتہ	رُتبہ	〃	۴	ہیرا	ہیرا
۱۰	〃	تو	کہ	۱۳۲	۵	۱۹ سنہ	۱۹۲۰ سنہ
۱۸	۲۰	سا	سے	〃	۷	۱۹۶۰ء	۱۹۸۰ء
۲۰	۵	آنا محل	آتا ہے محل	۱۳۳	۱۸	طوفان	طوفان
۲۲	۱۸	ہے	مجھے	۱۳۶	۱۲	گناہ گاروں	گنہگاروں
۲۴	۳	۸	۸۶	۱۴۲	۱۹	لحاضی	لحاظی
۴۲	۲۱	۸	۸۶	۱۴۴	۱۰	فرمانے	ـــ ×
۵۱	۱۴	ہے	ہیں	۱۵۱	۵	میں	×
۵۲	۶	سانیٹ	سانیٹ	〃	۲۲	کیسے	کسے
۵۴	۷	چُرا	چُراتا	۱۵۲	۴	ـــ	دنیا کی
۵۵	۴	جاگیر	جاگیردار	۱۶۴	۵	مقرر	
۵۶	۵	تیرھویں	ساتویں	۱۸۰	۸	اور تدفین	×
۶۰	۸	نادان	نادان	۱۸۰	۹-۱۰	کمک فنون غیاث	غیاث
۶۱	۱۰	آتا رہے	رہا ہے	۱۸۶	۱۷	مستفی	مستغنی
۷۶	۱۸	کوتچہ	کوچہ	۱۹۶	۲	ـــ	وفات ۱۰ مئی ۱۹۹۱ء
۷۸	۱۴	سے	سارا	۲۰۳	۲۴	ہوتے	ہوئے
۸۱	۱۷	سلامتی	سلامتی کا	۲۰۵	۱۰	خاکر	خاکہ
۸۵	۱۲	کیجئے	کیجیے	۲۱۰	۱	نظمی	ندیم
۸۷	۱۳	ـــ	تعلی	۲۱۰	۱	۲۱۰	۲۱۱
۸۸	۵	صفی	صفی کی	۲۱۱	۱	۲۱۱	۲۱۰
۹۰	۱۴	گویا ہیرا	گویا ہیرا				
۹۰	۲۳	کر	کے				

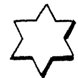
تلامذۂ حضرت صفیؔ ــــ جو بقیدِ حیات ہیں اور اِس تذکرے میں شامل ہیں

صاحبزادہ ارادت علی خاں ارادتؔ
محمد عبدالرحیم فاروقی راغبؔ
میر غیاث الدین علی خاں غیاثؔ
خواجہ امان اللہ ارشدؔ
پیرزادہ سید محی الدین قادری رُوحیؔ
میر محمد علی خاں کلیمؔ
اشرف الدین علی خاں اشرفؔ
رئیس جہاں آرا بیگم شادانؔ
غفار احمد ماجدؔ
نواب افسر الدین خاں افسرؔ
خواجہ حسین شریف شوقؔ
سید عبدالحفیظ محفوظؔ
صاحبزادہ جہاندار علی خاں افسرؔ
سید شاہ شجاع الدین علی صوفیؔ
غلام محبوب خاں مسلمؔ
نواب اقبال الدین خاں اقبالؔ
محمد عبدالقادر ظریفؔ
نواب محمد مظہر الدین خاں مظہرؔ
قاضی سید حامد علی تنویرؔ
میر احمد علی خاں عاقلؔ
غلام قادر نعیمؔ
میر محمد علی خاں تہورؔ
سید نظیر علی عدیلؔ
محمد وقار الدین صدیقی وقارؔ
سید غوث محی الدین قادری جاویدؔ
حافظ غلام احمد ابو نعیم عیشؔ

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

تلامذۂ صفیؔ ــــ جن کے حالات، و نمونۂ کلام باوجود کوشش کے دستیاب نہ ہوسکے

ذوالفقار علی خاں آثمؔ
آصف الدین توصیفؔ
غلام محمد شارقؔ
ذوالفقار علی (کالے حکیم) آثرؔ
اختر حسین ثابتؔ
رحیم الدین شاطرؔ
میر احمد علی اخلاصؔ
شیخ محمد چشتیؔ
شیخ احمد شاغلؔ
نظام الدین ادیبؔ
فخر الدین خیرؔ
وزیر بیگ شاہؔ
جمیل الدین اعظمیؔ
عبدالرزاق خیالیؔ مرحوم
حکیم عبدالقادر شفاؔ
محمد افسرؔ مرحوم
بشیر جنگ دلؔ
غلام محمد شعورؔ
عبدالقدوس اقدسؔ
عبدالسلام ذکیؔ
عبدالباسط شہیرؔ مرحوم
حکیم حافظ محمد اکرم مرحوم
لیسین علی ذوقیؔ
صابر الدین صابرؔ
سید ابوالحسن انحصارؔ
رحمت علی رحمتؔ مرحوم
ہاشم علی ضوؔ
سید امین الدین امینؔ
رضا علی خاں رسوخؔ
ضیاء الدین ضیاؔ
نور الدین ایمانؔ
حسن الدین رعناؔ
غلام علی طالبؔ
ذوالفقار علی اصغرؔ
محمد داؤد رمزؔ
مظفر الدین مظفرؔ
معین الدین بانیؔ
سید شریف الحسن رنگینؔ
عبدالکریم عاجزؔ
قائد علی خاں بزمیؔ
غلام رسول زاہدؔ
نظام الدین عارفؔ
بدیع الدین بیانؔ
عنایت علی زورؔ
عتیقؔ
محمد علی تمناؔ
احمد حسین سریرؔ



جناب محبوب علی خان صاحب اخگر کو حضرت صفی اورنگ آبادی کی ہم نشینی کا شرف تو نہیں ملا، لیکن جانشینِ صفی جناب غلام علی صاحب حاوی کے وہ فیض یافتہ خوش فکر شاگرد ہیں، جنھیں حضرت صفی کی قائم کردہ بزمِ تلامذۂ صفی کی معتمدی کا برسوں اعزاز ملا۔ شاگردانِ صفی سے واقفیت اور ان سے شخصی ربط اور راہ و رسم کی استواری اسی معتمدی کی بدولت ہوی۔ شاگردانِ صفی کے حالات اور ان کا کلام جمع کرنے کا خیال شروع سے تھا، لیکن ملازمت کی غیر شاعرانہ مصروفیتوں نے اس خواہش کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا کر رکھ دیا تھا۔ جب ملازمت کی بندھنوں سے آزاد ہوے تو برسوں کی بجھی چنگاری سلگ اٹھی۔ اسی آتشِ شوق کا کرشمہ ان کی تالیف "تلامذۂ صفی اورنگ آبادی" آج شمعِ فروزاں بن کر محفلِ ادب میں جلوہ گر ہے۔ کتاب خانوں میں گھوم پھر کر مواد اکھٹّا کرنا دشوار گر نہیں ہے تو آسان بھی نہیں، لیکن بکھرے شہر میں سچّی لگن اور تگ و دو سے خانہ نشین اور فراموش روزگار شاعروں کو ڈھونڈ نکالنا، ان کے حالات اور نمونۂ کلام کی خاطر صبح و شام گردشِ مدام میں رہ کر تحقیقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا بڑا کٹھن اور صبر آزما کام ہے۔ واقعی جناب اخگر کا یہ عظیم ادبی کارنامہ ہے۔ اردو میں کسی استادِ سخن کے شاگردوں کے تذکرے بہت کم ملتے ہیں اور ملتے بھی ہیں تو تفصیل اور جامعیت سے خالی ہیں۔ ان کا یہ تذکرہ باضابطہ ایک جامع تذکرہ ہے جو یقیناً ادب میں ایک منفرد مقام کا حق دار ہوگا۔ یہ بہت خاص اور قابلِ تعریف بات ہے کہ کتابت اور طباعت کا بارِ گراں تنہا اٹھا کر صفی اور شاگردانِ صفی کی خود دارانہ آن کی آبرو بڑھا دی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں مرتب کا جذبۂ خلوص سر تا سر کارفرما ہے، تب ہی تو حسنِ معنوی کے ساتھ حسنِ ظاہری کی سج دھج سے یہ تذکرہ آراستہ و پیراستہ ہے۔ تمام تر خوبیوں سے بھرپور اہلِ ذوق کے لیے یہ ایک قابلِ قدر تحفہ ہے۔

محمد نور الدین خان

صدر ادبستانِ دکن

ڈیوڑھی نواب مشرف جنگ فیاض، چبوترہ سید علی

مصنف "سوانح عمری حضرت صفی اورنگ آبادی"